60
62-B

اسلام اور رواداری

مولانا رئیس احمد جعفری ندوی

☆

یکے از مطبوعات

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور

(انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر)

HUSAIN & SONS, BOOKSELLERS

طبع اوّل سنہ ۱۹۵۵ء

تعداد ۱۰۰۰

مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور

ناشران ادارہ ثقافت اسلامیہ

قیمت

سات روپے چار آنے

فہرست مضامین "اسلام اور رواداری"

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
تقدیم	۱۷	۶۔ اپنا اور دوسروں کا تحفظ	۳۳
		۷۔ غالب اور مغلوب	۳۴
مقدمہ		۸۔ تاوانِ جنگ	۳۵
نشانِ راہ	۲۱	۹۔ انسانیت کا احترام	״
		۱۰۔ دورانِ جنگ کے وعدے	۳۶
۱۔ جنگ اور جہاد	۲۲	۱۱۔ اعلانِ جنگ کی بنیاد	۳۷
دونوں کا اصولی اور بنیادی فرق	۲۳	۱۲۔ دشمن کا حق	۳۸
حلیف اور حریف	۲۴	۱۳۔ ظالم یا مظلوم	״
دلچسپ موازنہ	۲۶	۱۴۔ مفاد کا مسئلہ	۳۹
		اور اسلام ---؟	۴۰
غور طلب سوالات	۲۸	اسلام کا نظام	۴۱
۱۔ جنگی قیدی	۲۹	مقاصد کی تعیین	״
۲۔ غیر جانبداری	۳۰	جہاد	۴۲
۳۔ شہری آبادی	۳۱	جہاد اور جنگ	۴۳
۴۔ اعلانِ جنگ	۳۲	اسلام پر الزام	۴۴
۵۔ معاہدہ دوستی	۳۲	تاریخ کی گواہی	״

مضمون	نمبر صفحہ
مباحث کی نوعیت	۴۵
خلاصۂ کلام	۴۶
قرآن کی روادارانہ تعلیم	۴۹
کتاب اللہ کی تصریحات	۵۰
قرآن کا روادارانہ مسلک	〃
رواداری کا میثاق	۵۱
رواداری کی اساس	۵۳
ابہام و تفہیم	۵۵
حکمت اور موعظت	۵۶
صرف تبلیغ نہ کہ جبر و جور	۵۸
اعمال میں ان کا کیا رنگ تھا	۵۹
دعوتِ اسلام کے جواب میں کفار و مشرکین کا اعراض و انکار	۶۳
دعوتِ اسلام کا جواب	۶۴
عتاب و حساب	۶۵
اطاعت و بلاغ	۶۶

مضمون	نمبر صفحہ
اہلِ کتاب سے خطاب	۶۷
مزید وضاحت	〃
تذکیر اور عذابِ اکبر	۶۸
یاوہ گوئی اور درشت کلامی	۷۰
بد کلامی کا جواب	۷۱
مشرکین کے ایرادات	۷۲
مشرک امن کی جگہ پہنچا دیا جائے	۷۴
اظہار و اخفاء	۷۸
نہ ماننے کی اجازت	۷۸
بصائر و نظائر	۷۹
ایک سوال اور اس کا جواب	۸۰
اسلام کے ممیزات اور خصوصیات	۸۳
غیر مسلموں کو اعتقاد اور عمل کی آزادی	〃
جو اپنے لئے وہی دوسروں کے لئے	۸۴

مضمون	نمبر صفحہ
اسلام کی خصوصیات	۸۵
دوستی کا گُر	۸۶
خدا تعالے کی ذمہ داری	۸۷
گمراہوں کا حشر	ـ
مسلمانوں کا طغرائے امتیاز	۸۹
بنیادی چیز حریت اعتقاد	۹۱
ایک آیت کی شانِ نزول اور تفسیر	۹۴
دشمن کی گواہی	۹۷
مشرکوں اور ذمیوں کا احترام حقوق اور مراعات	۹۹
آیات قرآنی اور وحی الٰہی کے مطابق	۹۹
ذمی کے بدلے میں مسلمان کا قتل	۱۰۰
مسجد میں مشرک کا داخلہ جائز ہے	۱۰۲

مضمون	نمبر شمار
صدقات میں مشرک کا حصہ	۱۰۴
کافر کا خون بہا	۱۰۷
ایک یہودی کے باعث آنحضرت کو استغفار کا حکم	۱۱۰
فیصلہ ظاہر پر ہوگا نہ کہ باطن پر	۱۱۴
ذبیحہ کا مسئلہ	۱۱۶
رسولؐ کی مثال	۱۱۷
اہلِ کتاب اور مشرک	۱۱۸
مشرک اور اہلِ کتاب میں امتیاز	۱۲۱
مسئلۂ ارتداد	۱۲۳
تشریع اسلامی کا ایک مہتم بالشان مسئلہ	۱۲۳
سچا ارتداد	۱۲۴

مضمون	نمبر صفحہ
ایک دوسری آیت	۱۲۵
ہدایت سے انکار	۱۲۶
معافی کی صورت	۱۲۸
ایک اور آیت	۱۲۹
مسلمانوں کی دل دہی	۱۲۹
مرتد یا مفسد	۱۳۰
واقعۂ ردّہ	"
اصل بات	۱۳۱
مرتد کی توبہ	۱۳۲
بنیادی بات	۱۳۳
غیر مذہب کی عورتیں	۱۳۵
کیا اسلام اُن سے نکاح کی اجازت دیتا ہے؟	۱۳۵
کتابیات سے نکاح	۱۳۶
کتابیہ لونڈی سے نکاح	۱۳۸
مسلمان عورت غیر مسلم مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔	۱۴۱

مضمون	نمبر صفحہ
قابل غور بات	۱۴۳
آیات قرآنی کی روشنی میں۔	
کفار و مشرکین سے جہاد و قتال	۱۴۵
بدھ اور جین مت	۱۴۶
عبرت انگیز	۱۴۷
صرف آثارِ قدیمہ	"
اسلام کی تعلیم	۱۴۸
مسلمانوں کا آغاز اور انجام	"
اور مظلومی و مجبوری	۱۴۹
قرآن اور جہاد	۱۵۰
چند قابلِ غور امور	۱۵۱
مفسرین کا نقطۂ نظر	۱۵۲
چند اور آیات	۱۵۳
سورۂ بقرہ کی چند آیتیں	۱۵۵
ترغیب جہاد	۱۵۷
صلح کی تاکید	۱۵۸
چند اہم نکتے	۱۶۰
نکث عہد	۱۶۲

مضمون	نمبر صفحہ
ایک اہم نکتہ	۱۶۳
ایک اور حکم	۱۶۴
جزیہ کے بعد	۱۶۶
مشرکین سے حکم جہاد	″
قرآن کی صلح پسندی	۱۶۸
استدراک :-	
دشمنوں سے لڑنے کا حکم	۱۷۱
معاہدات کا احترام	۱۷۹
احکام و تعلیمات قرآنی کی روشنی میں	″
مشرکوں کا ذکر	۱۸۰
مومن اور کافر کی دیت	۱۸۳
اسیران جنگ	۱۸۶
غلام کا مقام	۱۸۷
غلامان اسلام	۱۸۸
قصاص	″
جہاد اور قتل	۱۸۹
بہت بڑی رعایت	۱۹۰

مضمون	نمبر صفحہ
نقض عہد کا شاخسانہ	۱۹۱
سورہ بقر کی ایک آیت	۱۹۲
ظلم کا انسداد	″
دشمن کا اقرار	۱۹۳
خلاصۂ کلام	″
حدیث رسول	۱۹۵
غیر مسلموں سے برتاؤ کے بارے میں ارشادات نبوی	″
کچھ حدیث کے بارے میں	۱۹۷
حدیث کی اصطلاح	۱۹۹
حدیث تاریخ ہے یا خبر	۲۰۰
جانچ پڑتال	″
حدیث کی پرکھ	۲۰۱
روایت اور درایت	۲۰۲
اسماء الرجال	۲۰۳
کتاب و سنت	″
جہاد کی حیثیت	۲۰۵
ارشادات نبوی کی روشنی میں	″

مضمون	نمبر صفحہ
جہاد کی فضیلت	۲۰۶
نفاق کی موت	۲۰۷
تطہیر نیت	۲۰۸
مجاہد پر پابندی	۲۱۱
امان شکنی	۲۱۴
ایک اور حدیث	۲۱۵
خون کی قیمت	"
عملی مثال	۲۱۷
رسول کی فریاد	"
اقلیت کے تحفظات	۲۱۸
مجوسی عورت سے نکاح جائز ہے	۲۱۹
عہد نبوی کے چند واقعات	۲۲۱
غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک، رعایت اور مروت کا برتاؤ	
خالد بن ولید کا "جرم"	۲۲۲
گناہ اور کفارہ گناہ	۲۲۴
اسلام کیسے پھیلا	۲۲۵
عجیب اسلام	۲۲۸

مضمون	نمبر صفحہ
وہ عہد کیا تھا؟	۲۲۹
ابوجندل کا واقعہ	۲۳۰
چند اور مثالیں	۲۳۱
رسول اکرم صلعم کی یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ رواداری	"
بنو قریظہ	۲۳۲
عہد نامہ نجران	۲۳۳
سنہ ۵۴ کا ایک معاہدہ	"
دشمن کی گواہی	۲۳۵
فقہ اسلامی	۲۴۱
معروضات	۲۴۵
جہاد کی شرط اباحت	۲۴۶
غیر مسلم والدین کی مسلمان اولاد	۲۴۷
بلا اجازت	۲۵۱
صلح کیسے ٹوٹتی ہے؟	۲۵۲
عارضی صلح	۲۵۳
پاس عہد کی انتہا	۲۵۴
انتہائی اعتماد	۲۵۵

مضمون	نمبر صفحہ
غلام کا مقام	۲۵۶
غیر مسلم اور غلام	〃
باندی اور طفلِ صغیر	۲۵۷
بے نظیر اور بے مثال	۲۵۸
مقبوضہ عورتیں	۲۶۰
بات سے بات	〃
امان کی صورتیں	〃
الفاظ اور اشارے	۲۶۱
لفظ اور اشارہ	۲۶۲
جھوٹے مسلمان کی امان	۲۶۳
سپہ سالارِ اسلام	〃
امام محمد کا فتویٰ	۲۶۴
ایک اور امکانی صورت	۲۶۴
فریب کار کافروں سے حسنِ سلوک	۲۶۵
اشتعال انگیز فریب کاری مگر حسنِ سلوک	〃
چند اصطلاحات	۲۶۶
امام محمد کا ایک اور فتویٰ	۲۶۷

مضمون	نمبر صفحہ
جنگی ضرورت اور غیر مسلم	۲۶۷
دار الاسلام اور حربی	۲۶۸
شراب کا تاوان	۲۶۸
ذمی کی غیبت نہیں کی جا سکتی	۲۶۹
حربی کا مال اور ودیعت	۲۶۹
ذمی کے وارث اور وراثت	۲۷۰
ابن تیمیہ اور کافر حربی	۲۷۱
کمزور کی بات مانی جائے گی یا شہ زور کی۔	۲۷۲
گرجا میں نماز پڑھی جا سکتی ہے	۲۷۴
اہلِ کتاب کو جھٹلانے کی ممانعت	۲۷۵
کسی کافر پر لعنت نہ بھیجو	۲۷۶
جزیہ	۲۷۷
تعریف، مقدار، نوعیت، کیفیت	〃

مضمون	نمبر صفحہ
جزیہ کی تعریف	۲۷۸
جزیہ کس سے لیا جاتا ہے؟	"
جزیہ کی مقدار	"
قدر معلوم	۲۷۹
شناخت کیوں کر ہو؟	"
بھیک اور بیمار	۲۸۰
بیماری کی معافی	"
جزیہ سے استثناء	۲۸۱
چند اور مستثنیات	"
غلبہ کے بعد جزیہ	"
جزیہ کی تاریخ	۲۸۲
چند اور مسائل	۲۸۵
جہاد۔ جزیہ۔ مستامن، حربی، ذمی۔	"
دعوت اور جہاد	۲۸۶
پاسِ عہد	"
مقتول دشمن سے اچھا سلوک	۲۸۶

مضمون	نمبر صفحہ
فاسق اور اندھے مسلمان کی امان	۲۸۶
آنے والی نسلوں پر ذمہ داری	۲۸۷
مسلمان اور دار الحرب	"
قاضی کی بے بسی	"
ذمی عورت اور حربی مرد	۲۸۸
مالدار اپاہج	"
ایک اور رعایت	"
ذمی اگر مر جائے	۲۸۹
جزیہ کا اصل اصول	"
ذمی اگر رسول ﷺ کو گالی دے	"
ذمی کا فدیہ بیت المال سے	۲۹۰
اعتراض اور جواب	۲۹۱
افسانہ اور حقیقت کا تصادم	۲۹۱
مسئلہ ارتداد	۲۹۲
ناقابل تردید دلیل	۲۹۳

مضمون	نمبر صفحہ
قرآنی آیت اور اس کا مطلب	۲۹۳
دوسرے آئمہ کی رائے	۲۹۴
ذمی کی توکیل	۲۹۶
ذمی کی دل شکنی	۲۹۷
اعترافات	۲۹۹
مسلمانوں کے حسن سلوک کا اعتراف غیر مسلموں کی زبان سے	۲۹۹
مؤرخ کا اعتراف	۳۰۰
ایک اور اعتراف	۳۰۱
ایک اعتراض کا جواب	۳۰۲
قیاس اور عمل	۳۰۲
عیسائی اور مسلمان	۳۰۴
ایک اور شہادت	〃
رواداری کے باعث	
خلفائے بنو فاطمہ پر کفر کا فتوے	۳۰۷

مضمون	نمبر صفحہ
سرورِ کائنات کی رواداری	۳۱۱
غیر مسلموں سے۔ دشمنوں اور پیمان شکنوں سے۔ منافقوں سے۔	۳۱۱
شکست خوردہ حریفوں اور جنگی قیدیوں سے	۳۱۱
تقدیم	۳۱۳
دشمنوں کا اعتراف	۳۱۵
رسالت مآب کا برتاؤ غیر مسلموں سے	۳۱۷
صبر خاموش	۳۱۸
جبر و رضا	۳۲۰
نہ برہمی نہ نفرت	۳۲۱
خاموشی کے ساتھ	۳۲۲
صاف بیانی کی قدر	۳۲۳
خدا پر بھروسہ	۳۲۴
ایک دوسری روایت	〃
خدا تعالےٰ کے لئے	۳۲۵
اللہ تعالےٰ!	۳۲۶

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
کل کی اُمید	۳۲۷	مرتدین سے رواداری	۳۳۹
بددُعا سے انکار	"	وقتِ آخر غلاموں کا خیال	۳۴۰
یہود کو سلامتی کا تحفہ	۳۲۸	حضرت علی کو ہدایت	۳۴۱
یہود مدینہ سے معاہدہ	۳۲۹	غلاموں کے لئے وصیت	"
پروانۂ اُمت	۳۳۰	عبدالرحمان بن عوف کو ہدایت	"
اسلام کی تلوار	"		
زہر دینے والی عورت کی جان بخشی	۳۳۱	کافر کی دہمکی	۳۴۲
		مشرک کی جرأت	"
امن نامہ	۳۳۲	حلف الفضول	"
ابوسفیان سے حسن سلوک	۳۳۳	ابوطالب کے لئے دعائے مغفرت	۳۴۳
اسلام کیوں کر پھیلا	۳۳۵		
ثقیف کے لئے دعا	۳۳۶	ابوطالب کے لئے مغفرت کی اُمید	۳۴۴
یہودی کی شہادت	"		
یہودیوں سے لین دین	۳۳۸	پیاسے دشمن کے ساتھ رعایت	"
اسلام قبول کرنے کی کہانی	"		

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
آنحضرت کا سلوک دشمنوں اور پیمان شکنوں سے	۳۴۵	مجھے فضیلت نہ دو	۳۵۲
		مسلمان باپ کی کافر اولاد	〃
دشمن کے لئے اناج کا تحفہ	۳۴۶	رسول کے لفظ پر نزاع	۳۵۴
		لرزہ خیز منظر	۳۵۶
نہ جبر نہ جَور	۳۴۷	بے مثال	۳۵۸
مالِ غنیمت قبول کرنے سے انکار	۳۴۸	درگذر سے کام لو	۳۵۹
		عین جنگ کے وقت	۳۶۰
اسی سلسلہ کی ایک توضیحی روایت	۳۴۹	سزا یا انعام	〃
		زہر دینے والی عورت	۳۶۱
دشمن سے رعایت	۳۵۰	جب تک ثبوت نہ مل جائے ....!	۳۶۲
کافر باپ کا لحاظ	〃	کافر کا مال	〃
زندگی کی نعمت	۳۵۱	پروانۂ امن	۳۶۳
میری قوم —!	〃	پاسِ عہد	〃
کافر کا خون بہا	۳۵۲	خالدؓ سے بازپرس	۳۶۴

مضمون	نمبر صفحہ
خطاکاروں سے درگذر	۳۶۴
صلح حدیبیہ	۳۶۵
مزید جہالت	۳۶۷
صرف خداؐ کے لئے	″
کفّار کا سفیر	۳۶۸
ایفاء عہد	″
مؤثر تہدید	۳۶۹
دشمن مسجد نبوی میں	″
عیسائیوں کی نماز مسجد نبوی میں	۳۷۰
نجران کے عیسائیوں سے دائمی معاہدہ	۳۷۱
جان بخشی	۳۷۲
یہودی قرض خواہ	۳۷۳
کافر مہمان	″

مضمون	نمبر صفحہ
یہودی کی آنحضرتؐ سے بدتمیزی	۳۷۳
خبردار——!	۳۷۴
حلیف مشرکوں کے لئے	″
دانت توڑنے کی ممانعت	۳۷۵
بدر کے جنگی قیدی	۳۷۶
کافر کی رعایت	۳۷۷
بنو نضیر کس طرح جلاوطن ہوئے	۳۷۷
یہودی کی عورت	۳۷۸
شرارت کا جواب	″
تفرقہ انداز کو معافی	۳۷۹
سرور کائنات کا رویّہ منافقوں سے	۳۸۱
منافق کا وار	۳۸۳
قضیہ زمین برسر زمین	۳۸۴

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
منافق کی سازش	۳۸۴	جنگی قیدیوں، محکوموں اور شکست خوردہ حریفوں پر	۳۹۹
منافق ساتھی	۳۸۵		
منافق باپ کا مومن بیٹا	۳۸۶	یہودیوں سے حسنِ سلوک	۴۰۱
منافقوں کا عذرِ لنگ	۳۸۷	بنو قینقاع کے یہودی	۴۰۲
منافق کو شبہ کا فائدہ	۳۸۹	مجبور دشمن	״
مسجد ضرار	۳۹۰	نوفل کی لاش	۴۰۳
منافقوں کی فتنہ انگیزی	۳۹۱	جنگی قیدیوں سے حسنِ سلوک	״
منافق کی سپر	۳۹۱	دشمن خطیب قبضہ میں	۴۰۴
منافق کا اقرار سے انکار	۳۹۲	برتاؤ میں مساوات	۴۰۵
رحمتِ تمام	۳۹۳	فدیہ کی شرح	״
منافق کی جاں بخشی	۳۹۵	رسول کی بددعا	۴۰۶
ایک منافق کی کہانی	۳۹۶	بغیر فدیہ کے رہائی	۴۰۷
منافق کی سفارش پر بدعہد یہودیوں کی رہائی	״	حملہ آوروں کی رہائی	۴۰۷
		ابوسفیان کی چشمِ ندامت	״
رحمۃ للعالمین کا عفو و احسان	۳۹۹	فاتح فوج کو ہدایت	۴۰۹

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
سلوک اور سلوک کا دان	۴۱۰	حاتم طائی کا بیٹا اور بیٹی	۴۲۳
"تم آزاد ہو!"	۴۱۱		
ہندہ کی جان بخشی	۴۱۲	بابرکت جویریہ	〃
روٹھا ہوا دشمن	۴۱۳	ابوسفیان کی عزت افزائی	۴۲۴
دشمن کا جان نثار بیٹا	〃	مشرک کا خون بہا	۴۲۴
بہت بڑا مجرم	۴۱۴	مفرور مجرم کی جان بخشی	۴۲۵
امن بغیر کسی شرط کے	۴۱۵	مزید تصریح	۴۲۶
متنبّی نبی کے دربار میں	〃	فتح مکہ کا اصل محرک مشرک حلیف کی مدد۔	۴۲۶
حمزہ کا قاتل	〃		
متروکہ جائداد	۴۱۸	داستان کا خاتمہ	۴۳۱
چھ ہزار جنگی قیدی	۴۲۰		
کتنوں کا خون بہا	۴۲۱		

تقدیم؟

بہت دنوں کی بات ہے۔ میں بمبئی سے لکھنؤ جا رہا تھا۔ ایک پارٹمنٹ میں کئی ہم سفر تھے۔ سب کے سب غیر مسلم، میں طبعاً ذرا الگ تھلگ قسم کا آدمی ہوں، یہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ اور میں خاموشی کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ پہلے تو گفتگو سیاسیات پر ہوتی رہی۔ پھر مذہب پر شروع ہوئی، کیونکر ممکن تھا کہ اسلام کا ذکر نہ چھڑتا؟ چھڑا اور بڑی ناگواری کے ساتھ، یہ حضرات اس پر متفق ہو گئے کہ اسلام سے بڑھ کر ناروادار مذہب کوئی نہیں ہے۔ کچھ طنز، کچھ تعریض، کچھ قہقہے۔ یہ سب لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ دوران گفتگو میں پتہ چلتا رہا، کوئی وکیل ہے کوئی بیرسٹر، کوئی بہاں گشت قسم کا تاجر، جہاں تک یاد پڑتا ہے ایک صاحب آئی سی ایس کے امیدوار تھے، ہندوستان میں امتحان دے کر کامیاب ہو چکے تھے۔ اب عنقریب تکمیل مزید کے لئے لندن جانے والے تھے۔ انہیں اگر یہ معلوم ہوتا کہ ان کا ایک ساتھی مسلمان ہے تو شاید اسلام اور اس کے مسلک کے بارے میں محتاط الفاظ استعمال کرتے آخر تہذیب اور شائستگی بھی تو کوئی چیز ہے۔ لیکن میں نے اس لئے انہیں سفر، قرار دیا کہ ناواقف تھے؟ کچھ یہ مقصد بھی تھا کہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

سفر تو دیر میں ختم ہوا لیکن گفتگو کا موضوع جلد ختم ہو گیا۔ میری خاموشی بدستور قائم تھی، فرق یہ تھا کہ اب تک میں مناظرے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اب حقائق پر غور کرنے لگا۔ میں نے اپنے دل سے سوال کیا، کیا واقعی اسلام ناروادار ہے؟ کیا حقیقتہً مسلمان تنگدل ہیں؟ کیا ایک مذہب جو تنگ دل اور ناروادار ہو زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے؟ کیا ایک قوم جو تنگدل ہو زندہ رہ سکتی ہے؟ مجھے اپنے اسلام پر فخر تھا۔ اپنے مسلمان ہونے پر ناز تھا۔ میں نے ایک مذہبی درسگاہ ——— ندوۃ العلماء ——— میں تعلیم کی تکمیل کی تھی۔ میں ایک قومی دانش گاہ ——— نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ)

میں اپنی زندگی کے کئی سال بسر کر چکا تھا۔ میں نے ندوہ میں کسی استاد سے یہ نہیں سنا کہ غیر مسلموں سے نفرت کرنی چاہیئے۔ میں نے جامعہ ملیہ میں کسی استاد کو غیر مسلموں کے بارے میں متعصب، ناروادار اور تنگدل نہیں پایا۔ اب کچھ عرصے سے میں سیاسیات کی دنیا میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ہندوستان کے بطل جلیل اور مسلمانوں کے زعیم کبیر مولانا شوکت علی کے زیر سایہ دینیات اور سیاسیات کی زندگی سے آشنا ہو رہا تھا۔ روزنامہ خلافت کی ادارت میرے ہی سپرد تھی۔ اور یہ وہ دور تھا کہ ہندو مسلم اختلافات نقطۂ عروج پر پہنچ چکے تھے۔ کانگرس اور خلافت کی آویزش حد سے کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی۔ گاندھی اور شوکت کے درمیان پبلک پلیٹ فارم پر اختلافات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ سیاست کی دنیا میں رہ کر میں نے بہت سے مسلمان لیڈروں کو دیکھا تھا دور سے بھی اور نزدیک سے بھی۔ لیکن معاملات میں، کاروبار میں، ملنے جلنے، رہنے سہنے اور اٹھنے بیٹھنے میں، نجی اور ذاتی زندگی میں کسی کو بھی میں نے متعصب اور ناروادار نہیں پایا تھا۔ سیاسی اختلافات، اپنی جگہ تھے اور ذاتی تعلقات اپنی جگہ! ——— پھر آخر مسلمانوں کو اور مسلمانوں سے زیادہ اسلام کو، یہ غیر مسلم حضرات متعصب اور ناروادار کیوں سمجھتے ہیں؟

اب تک مجھے تاریخ سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے تاریخ پر توجہ کی اور اس موضوع کا خاص طور پر مطالعہ شروع کیا۔ ذہن میں اور کاغذ پر کافی مواد جمع ہو گیا۔ جی چاہتا تھا۔ اس موضوع پر شرح و بسط سے لکھوں۔ جو نہیں سمجھنا چاہتے، ان سے بحث نہیں لیکن جو ناواقف ہیں انہیں بتادوں کہ اسلام سے بڑھ کر فراخ حوصلہ، کشادہ دل اور روادار کوئی مذہب اس نیلگوں آسمان کے نیچے موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں سے بڑھ کر دنیا کی کسی قوم نے اپنی ماتحت اور محکوم اقوام سے روادارانہ برتاؤ نہیں کیا۔ لیکن ادبی اور صحافتی مصروفیتیں عناں گیر ہوتی رہیں اور ارادہ کے باوجود اس محبوب موضوع پر کچھ نہ لکھ سکا۔ بچ

ہندوستان تقسیم ہوا پاکستان وجود میں آیا۔ مجھے بمبئی سے ترکِ اقامت کر کے کراچی آنا پڑا۔ اتفاق کی بات ایک مرتبہ کراچی میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے فاضل ڈائرکٹر جناب خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ ان سے اس موضوع کا ذکر چھڑا۔ تو انہوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور میں نے کام شروع کر دیا اور الحمدللہ! کہ آج اس کا ایک حصہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں!

رئیس احمد جعفری

کراچی

۲۹؍ اگست سنہ ۱۹۵۲ء

مقدمہ!

نشانِ راہ

۱۔ جنگ اور جہاد

حلیف اور حریف

دلچسپ موازنہ

غور طلب سوالات

جنگی قیدی

غیر جانبداری

اعلانِ جنگ

معاہدۂ دوستی

اپنا اور دوسروں کا تحفظ

غالب اور مغلوب

تاوانِ جنگ

انسانیت کا احترام

دورانِ جنگ کے وعدے

اعلانِ جنگ کی بنیاد

دشمن کا حق

ظالم یا مظلوم؟

تضاد کا مسئلہ

اور اسلام ــــــ؟

اسلام کا نظام

مقاصد کی تعیین

جہاد

جہاد اور جنگ

اسلام پر الزام

تاریخ کی گواہی

مباحث کی نوعیت

خلاصۂ کلام

جنگ اور جہاد

دونوں کا اصولی اور بنیادی فرق

قبل اس کے کہ ہم اپنے اصل موضوع پر گفتگو شروع کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلے جنگ اور جہاد کے فرق کو معلوم کرلیں کیونکہ بغیر اس کے ہم کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک یہ فرق واضح نہ ہو جائے، ہم جنگ اور جہاد دو مترادف الفاظ سمجھتے رہیں گے۔ اور اس بنیادی فرق تک ہماری نظر نہیں پہنچے گی جو دوسروں کی جنگ اور ہمارے جہاد میں ہے۔

جنگ ہر وقت شروع ہو سکتی ہے۔ ہر بات پر شروع ہو سکتی ہے۔ جنگ کے دوران میں ہر جائز ناجائز کام کو جواز کا پروانہ مل جاتا ہے۔ جنگ کے بعد فاتح قوم مفتوح قوم کے ساتھ جو سلوک چاہے روا رکھ سکتی ہے۔ اس نے صرف ایک پیمانہ بنا لیا ہے "حالات" کا۔ حالات کا جو تقاضا ہو وہ کر گزرے گی۔ اور یہ حالات تمام تر اسی کے پیدا کئے ہوتے ہیں۔ گویا اس کے ہر فیصلہ میں ذاتی رجحان اور میلان ہی کار فرما ہوتا ہے۔ آخری اور فیصلہ کن حیثیت صرف اسی ایک چیز کو حاصل ہوتی ہے۔ اصلی چیز طاقت ہے۔ اگر تم طاقتور ہو تو سب کچھ کر سکتے ہو ——————

اس کے برعکس، اسلام کا جہاد "حالات" یعنی ذاتی رجحان کا تابع نہیں ہوتا۔ وہ کبھی اور کسی

حالت میں جارحانہ حملہ کا رنگ نہیں اختیار کر سکتا۔ اسلام نے کبھی کسی قوم پر جارحانہ حملہ نہیں کیا اسلام نے کبھی کسی قوم پر جارحانہ حملہ کی مسلمان کو اجازت نہیں دی۔ اسلام نے عدل، قسط، احسان اور رواداری کے جو احکام جنگ کے سلسلے میں دیئے ہیں۔ اور ان احکام پر صدرِ اوّل میں اور اس کے بعد بھی مسلمانوں نے جس طرح عمل کیا ہے۔ اس کی نظیر تو دنیا کے کسی میثاق امن میں مل سکتی ہے نہ کسی قوم کے کردار اور سیرت میں اس کے نمونے نظر آ سکتے ہیں۔ اسلام کا جہاد صرف دفاع ہے۔ اور صرف ظلم و عدوان کے خلاف پیکار ہے۔ جنگ کے دوران میں بھی اسلام کسی قسم کی ننگِ انسانیت حرکت کی اجازت نہیں دیتا۔ جنگ کے بعد بھی وہ "احسان" کو سب چیزوں پر اوّلیت اور ترجیح دیتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر اعتدال، انصاف اور رواداری کا ایک ضابطہ دیتا ہے جس سے انحراف کی جرأت کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ اور اگر کرے تو وہ مسلمان نہیں رہتا۔

جو مذہب اقدام و ہجوم کی بجائے صرف دفاع اور دکھی انسانیت کی تائید و حمایت میں جنگ کا قائل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ رواداری صرف اسی کا حق ہے۔ چنانچہ اسلام بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہی ایک مذہب ہے جس نے رواداری کی تعلیم دی۔ وہی ایک مذہب ہے جس کے پیروؤں اور ماننے والوں نے اس تعلیم پر عمل کر کے دکھایا۔ اور وہی ایک ایسا نظام اور ضابطہ ہے جس کا اگر دوسرے مذاہب کے قول و عمل سے موازنہ کیا جائے۔ تو تفوق اور برتری اسی کو حاصل ہوگی۔ لیکن یہ موازنہ آسان کام نہیں۔ در حقیقت "اسلام اور رواداری" ایک بڑا اہم اور تحقیق طلب موضوع ہے۔ یہ خود اپنی تفسیر ہے خود اپنا بیان، خود اپنا عنوان ——————

اس موضوع کا مطالعہ سرسری طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی اہمیت متقاضی ہے۔ کہ تمام پہلوؤں پر ایک تحقیقی نظر ڈالی جائے تاکہ بدگمانی کے پردے چاک ہو جائیں۔ غلط فہمیاں دور ہو جائیں:۔

حلیف اور حریف

فاتح اور مفتوح، حاکم اور محکوم، آقا اور غلام، طاقتور اور کمزور، گلفام اور سیاہ رو قوموں اور

ملتوں کے باہمی تعلقات تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں فاتح اور کشورکشا کی حیثیت سے مغلوب اور محکوم قوموں کے ساتھ رواداری، وسعت قلب اور مساوات کا جو برتاؤ کیا اسے تاریخ کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ اس کی بڑی قیمتی اور محبوب پونجی ہے۔

اسلام سے قبل جنگ اور صلح کی حالت میں ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ جو سلوک کرتی تھی، تاریخ نے اسے محفوظ رکھا ہے۔ جنگ کے قیدی آگ کے الاؤ میں جلا دیئے جاتے تھے۔ ان کی عورتیں لونڈیاں بنالی جاتی تھیں۔ ان کی جائداد و املاک پر قبضہ کرلیا جاتا تھا۔ ان کے بوڑھے اور ازکار رفتہ لوگوں کو اس لئے زندہ چھوڑ دیا جاتا تھا کہ وہ سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کے دن بسر کریں۔ ان غلاموں کو شیروں کے کٹہرے میں چھوڑ دیا جاتا تھا کہ وہ بغیر کوئی ہتھیار استعمال کئے یا شیر کو ختم کردیں یا اس کے دندانِ آز کے شکار بن جائیں۔ روم الکبریٰ کے دورِ عظمت کا شاہکار ایمفیتھیٹر AMPHITHEATRE تاریخ میں غیرفانی مقام حاصل کرچکا ہے۔ آج بھی اس کا تصور رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی ہے۔

ماضی اور حال میں ہمیشہ چشمک رہی ہے۔ ماضی کے معنی ہیں رجعت، فرسودگی، قدامت۔ اور حال کا مفہوم ہے ارتقار۔ عروج، اقدام۔ ماضی کا جب حال سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ تو ماضی اپنی بے مائیگی کے باعث احساس کمتری میں مبتلا ہوکر شرم سے گردن جھکا لیتا ہے۔ اور حال احساس برتری کے نشے سے مخمور ایک حقارت کی نظر ڈالتا آگے بڑھ جاتا ہے۔ ماضی کے پاؤں میں بیڑیاں پڑ چکیں وہ اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرسکتا۔ اور حال صرف حرکت ہے۔ وہ آگے بڑھتا ہے اور بڑھتا چلا جاتا ہے —————— حدِ نگاہ تک —————— وہاں تک جہاں نگاہ کی قوت ختم ہوجاتی ہے۔ اور پھر کچھ نظر نہیں آتا۔

لیکن میرے پیشِ نظر ایک دلچسپ تجربہ ہے میں ماضی کا مقابلہ حال سے نہیں

کرنا چاہتا۔ حال کا موازنہ ماضی سے کرنا چاہتا ہوں ہیں جس ماضی کو حال کے مقابلے میں پیش کرنا چاہتا ہوں اس پر چودہ صدیاں گذر چکی ہیں لیکن میرا ماضی چودہ سو برس گذر جانے کے باوجود آج بھی اتنا روشن اور تابناک ہے کہ یہ ہوشربا اور خرد شکار حال اس کے سامنے آتے ہوئے شرماتا ہے۔ چودہ سو برس پہلے کا ماضی عبارت تھا وحشت، بربریت، بہیمیت، جہالت اور ناعقلی سے اور آج کا حال اپنی تہذیب و تمدن پر، اخلاق و کردار پر، صورت و سیرت پر، وسعت قلب اور علوئے ظرف پر نازاں ہے۔ پھر بھی یہ نازو افتخار صرف اُس وقت تک قائم رہ سکتا ہے۔ جب تک مسلمانوں کا ماضی مقابلے میں نہیں آتا۔ اس کے سامنے آتے ہی حال کا فخر و ناز عرق ندامت میں تحلیل ہو جاتا ہے کہتے ہیں کہ ماضی تاریک ہے اور حال روشن ——— ہوگا لیکن میں جس حال کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ یکسر تاریکی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور جو ماضی میرے پیش نظر ہے۔ وہ اب تک مطلع انوار بنا ہوا ہے۔ اور شاید قیامت تک اس کی تابانی اور درخشانی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

دلچسپ موازنہ

پچھلی عالمگیر جنگ چوتھائی صدی پہلے کی بات ہے۔ دوسری عالم آشوب جنگ کو ختم ہوئے ابھی دس سال بھی نہیں گذرے۔

اس جنگ کا ہر فریق بزعم خود اپنے مقام پر تہذیب و تمدن کا داعی، اخلاق و کردار کا معمار، انسانیت و شرافت کا معلم، عدل و رواداری کا علمبردار اور اخوت و مساوات کا پیکر تھا لیکن ہم نے تہذیب انسانی کے ان استادوں کو کس رنگ میں دیکھا؟ کس حال میں پایا؟

ہٹلر کی نازیت، روس کی اشتراکیت، برطانیہ اور امریکہ کی انسانیت یہ تمام جلوے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان کے زمانے میں انسانیت کے بلند ترین "مینارۂ بابل" پر نمودار ہو کر انہوں نے وعظ کہا اور جنگ کے زمانے میں ان کے پند و تلقین کی آوازیں آتش فشاں بموں، اژدر دم توپوں اور ہلاکت آفریں ہتھیاروں کے شور میں دب گئیں۔ انہوں نے خود اصول بنائے

اور اسے توڑ دیا۔ انہوں نے خود ضابطے تیار کئے اور انہیں کچل دیا۔ انہوں نے خود میثاق اور محضر لکھے۔ پھر بے تکلفی اور بے پروائی کے ساتھ انہیں پاؤں تلے روندڈالا سے

اللہ رے فریب کردل پہ یہ اختیار
شب موم کرلیا سحر آہن بنالیا

انہوں نے امن کی تلقین کی اور جنگ کا صور پھونکا۔ انہوں نے غیر جانبداری کے اصول کی تعریف کی اور غیر جانبداری کو پامال کردیا۔ انہوں نے جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک، حسن اخلاق کی تائید کی لیکن جب کنسنٹریشن کیمپ بنانے کا وقت آیا۔ تو چنگیز اور ہلاکو کی روحیں عالم بالا سے بے ساختہ پکار اٹھیں

ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے

انہوں نے قیدیوں پر وہ ظلم توڑے اور محکوموں کو قہر واستبداد کا ایسی سفاکی اور شقاوت سے ہدف ستم بنایا کہ بربریت کانپ اٹھی اور درندگی نے شرم سے گردن جھکالی۔ "رواداری" ان کے لغت میں ایک مقدس لفظ ہے لیکن صرف ایک لفظ

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

ان کی رواداری صرف ہم خیالوں تک محدود ہے۔ مخالفوں اور دشمنوں کو ان کی رواداری سے متمتع اور مستفیض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بڑے پیار بھرے لہجہ میں ان سے کہا تھا۔

"اگر تم اپنے پیار کرنے والوں سے پیار کرتے رہو تو تمہارے لئے کیا اجر؟"

مطلب یہ کہ اگر انہیں پیار کرو جو تمہیں پیار نہیں کرتے تو ایک بات بھی ہے لیکن مسیح کی قوم نے صرف انہیں لوگوں پر التفات کیا جو اسے چاہتے تھے۔ انہیں وہ نفرت، حقارت، ذلت اور سفاکی و شقاوت کے سوا کچھ نہیں دے سکی جنہوں نے اسے دشمن سمجھا، دشمن کی نظر سے دیکھا اور دوستی کے قابل نہ تصور کیا

فرانس کے مشہور داعیٔ انقلاب اہلِ قلم اور فلسفی روسو کا قول ہے:

"انسانی اخلاق کی پیمائش کا اصلی پیمانہ جنگ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اسی کی پیمائش ٹھیک بھی ہوتی ہے۔"

روما کے مقنن اعظم سولن نے کہا تھا

"معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو تو الجھا لیتا ہے، لیکن اپنے سے قوی کے مقابلے میں ٹوٹ جاتا ہے۔"

اور کون کہہ سکتا ہے کہ روسو اور سولن نے غلط کہا تھا؟ محاربات صلیبی اور حروب عالم کی تاریخ پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اسی بیسویں صدی عیسوی کے اندر جو دو ہولناک اور عالمگیر جنگیں برپا ہوئیں۔ انہوں نے پورے طور پر روسو اور سولن کے قول کو صحیح نہیں کر دکھایا؟ کیا یہ نہیں معلوم ہو گیا کہ اس روشن خیالی اور حریت عام کے زمانہ میں بھی جنگ جب کبھی برپا ہوئی اس نے انسانی اور اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا۔

غور طلب سوالات

جنگ میں از آدم تا ایں دم لڑنے والے فریقین کو جن حالات و حوادث سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان کی اگر تحلیل و تجدید کی جائے تو وہ یہ ہیں:-

۱۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟

۲۔ غیر جانبدار قوموں کی غیر جانبداری کہاں تک تسلیم کی جائے؟

۳۔ شہری آبادی کو کس حد تک مامون و محفوظ رکھا جائے؟

۴۔ اعلان جنگ کو کیا اہمیت دی جائے؟

۵۔ معاہدۂ دوستی کا کس حد تک احترام کیا جائے؟

۶۔ اپنے تحفظ کے لئے دوسروں کے امن و عافیت میں کہاں تک خلل ڈالا جائے؟

۷۔ غلبہ حاصل کر لینے کے بعد مغلوب قوم سے کیا برتاؤ کیا جائے؟

۸۔ تاوانِ جنگ کی کمیت، کیفیت اور نوعیت کیا ہو؟

۹۔ دورانِ جنگ میں انسانیت کا ادب و احترام کیونکر ملحوظ رکھا جائے؟

۱۰۔ جنگ کے دوران میں شرکائے جنگ سے جو وعدے کئے جائیں۔ ان میں کتنا جھوٹ ہو اور کتنا سچ ------؟

۱۱۔ اعلانِ جنگ کی بنیاد و اساس کیا ہو؟

۱۲۔ جنگ کے دوران میں دشمن کو زندہ رہنے کا حق کہاں تک دیا جائے؟

۱۳۔ جنگ کے دوران میں مدد مظلوم کی کی جائے یا ظالم کی؟

۱۴۔ مفادات کا تعلق کچھ بھی حق و باطل سے ہے یا نہیں؟

اب میں ان میں سے ہر ایک پر مختصر سی گفتگو کروں گا۔

۱۔ جنگی قیدی

دوسری عالم آشوب جنگ میں دنیا نے دیکھا ہٹلر کے کنسنٹریشن کیمپ میں قیدیوں پر جو لرزہ خیز مظالم روا رکھے جاتے تھے وہ اپنی نوعیت میں کسی طرح بھی ان مظالم سے کم نہیں تھے۔ جو روس نے اپنے قیدیوں کے ساتھ، جاپان نے اپنے قیدیوں کے ساتھ اور دوسری شریک جنگ قوموں نے اپنے اپنے اسیرانِ جنگ کے ساتھ روا رکھے تھے۔ جاپان آج لڑائی ختم ہونے کے بعد بھی شکوہ سنج ہے کہ اس کے ان لاکھوں باشندوں کا پتہ نہیں چلتا۔ جنہیں روس کے سپاہیوں نے گرفتار کیا تھا۔ اطالیہ کے جو قیدی برطانیہ کے ہاتھوں اسیر ہوئے اور جاپان کے جو سپاہی امریکہ کے آگے سپر انداز ہوئے۔ ان کی زبان سے اگر ان کی روداد سنئے تو معلوم ہو گا تہذیب و تمدن کے اس دور میں بھی گرفتارشدگان جنگ ان ہی ستم آرائیوں کے مستحق سمجھے جاتے ہیں جن کا مظاہرہ تاریخ کے ابتدائی دور میں ہوا کرتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کو بھی چھوڑیئے۔ کوریا میں جو کچھ ہوا۔ کوریا کے قیدیوں پر جو ظلم توڑے

گئے۔ان کی آواز بازگشت کو چہ کی فضاؤں میں اب بھی گونج رہی ہے۔ اور یہ قیدی جاپان کے ہوں یا کوریا کے چین کے ہوں یا روس کے۔امریکہ کے ہوں یا برطانیہ کے۔سب ہم آواز ہو کر ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں ؎

نگہ ہو یا مژہ ہو تم تو دونوں کو بلا سمجھے
اسے تیرِ قضا اس کو پرِ تیرِ قضا سمجھے

۲۔ غیر جانبداری

گذشتہ جنگ عظیم میں انقرہ، قاہرہ، کابل اور طہران کو اپنی غیر جانبداری پر شدید اصرار تھا۔ ترکیہ کا محل وقوع ایسا تھا کہ وہ کافی مدت تک اپنی غیر جانبداری نباہ سکا۔ وہ روس جرمنی اور برطانیہ تینوں کا نہایت آسانی سے ہدف بن سکتا تھا۔ برطانیہ روس کے اندیشے سے۔ روس، جرمنی کے خوف سے۔ جرمنی، برطانیہ اور روس کے ڈر سے ترکی پر حملہ کرتے ہچکچاتا تھا۔ لیکن جب جرمنی شکست کے قریب پہنچ گیا۔ روس اتحادیوں کا حلیف بن گیا۔ تو برطانیہ نے چند لمحوں کے اندر ترکی کو شریک جنگ ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایران کے رضا شاہ کو یقین تھا کہ ان کی غیر جانبداری پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ لیکن برطانوی اور روسی افواج نے بیک وقت طہران کی طرف کوچ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کو اتحادیوں کا اتحادی بن جانا پڑا اور تاخیر تعمیل کی سزا یہ ملی کہ رضا شاہ کو جن پر ان کی قوم کو فوج کو پارلیمنٹ کو اور مجلس وزرا کو مکمل اعتماد تھا۔ تختِ حکومت سے جبراً دستبردار ہو کر جلا وطن ہو جانا پڑا۔ کابل میدان جنگ سے بہت دور تھا۔ وہ کسی طرح بھی کسی راستہ سے محوری (Axis) حکومتوں کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ عرصہ تک اس کی غیر جانبداری برداشت کی گئی۔ جب ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا تو حکم دیا گیا کہ دشمن قومیت کے جتنے افراد افغانستان میں موجود ہیں۔ انہیں خارج البلد کر دیا جائے افغانستان اس مطالبہ کی مزاحمت نہ کر سکا۔ تعمیل ارشاد کرنی پڑی۔ قاہرہ غیر جانبدار تھا لیکن نہر سویز اتحادیوں کے تصرف میں تھی۔ قاہرہ کا ہوائی اڈہ (AIR PORT) اتحادیوں کے فوجی طیاروں

کی جولانگاہ تھا۔ قاہرہ کی گلیاں یونان کے پناہ گزینوں اور ہٹلر کے ستم دیدوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مصر کی ہر وہ وزارت مستعفی یا برطرف ہونے پر مجبور ہو جاتی تھی جس کے بارے میں گمان ہوتا تھا کہ یہ واقعی غیر جانبدار ہے۔ ایک دفعہ تو خود شاہ فاروق کو تخت و تاج کے لالے پڑ گئے جس کا انکشاف جلاوطنی کے بعد انہوں نے اپنی داستانِ حیات میں کیا ہے۔

دنیا کی ہر قوم کو جس طرح لڑنے کا حق ہے اسی طرح نہ لڑنے کا حق بھی ہے جس طرح کسی حلیف ۔۔۔۔ رہنے کا حق ہے بالکل اسی طرح غیر جانبدار رہنے کا بھی حق ہے۔ لیکن ترقی یافتہ اور مہذب دنیا اس اصول کو تسلیم نہیں کرتی وہ کہتی ہے جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے ـــــ دنیا کی سب سے بڑی جمہوری حکومت کے نمائندے سر ہارن ہیلٹ یو پی کے گورنر نے سنہ ۱۹۴۲ء میں یہی تو کہا تھا۔

۳۔ شہری آبادی

تہذیبِ انسانی کا یہ دورِ عروج جنگجو اور غیر جنگجو آبادی میں فرق نہیں کرتا۔ جس طرح مسلح فوجوں سے جنگ کی جاتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خونریز، دہشت انگیز اور ہوشربا جنگ نہتی اور غیر مصافی آبادی سے کی جاتی ہے۔ جس طرح مقاماتِ جنگ یعنی چھاؤنی، پل، اسٹیشن، بندرگاہ، ہوائی اڈے، ذخائر، کارخانے اور سیکرٹریٹ پر اندھا دھند بمباری کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس دوسری جنگِ عظیم میں نہتے شہریوں پر بھی آتش افروز بم اور مرگ آفریں راکٹ برسائے گئے۔

بڑی بیدردی سے رنگون، سنگاپور، لندن، برلن اور لینن گراڈ وغیرہ کے نہتے شہریوں پر آگ اور موت کی بارش کی گئی۔ ہسپتالوں اور عبادتگاہوں کو بھی نہ چھوڑا گیا۔ اور اس سلسلہ کا آخری شاہکار وہ ایٹم بم ہے جو ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرا۔ اور جس نے آن کی آن میں کئی لاکھ شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جہاں سے روئیدگی ختم ہو گئی۔ جہاں کی آب و ہوا تک مسموم ہو گئی۔ جہاں کی فضا پر اب بھی موت کا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ جہاں ماہرینِ سائنس جا جا کر اب بھی تجربہ کرتے ہیں کہ یہ شہر سابقہ حالت پر کب عود کر سکیں گے؟

۴۔ اعلانِ جنگ

یہ بات اصولِ موضوعہ کی طرح طے ہے کہ اعلانِ جنگ کے بغیر جنگ کے کوئی معنے نہیں۔ اعلان جنگ سے مطلب یہ ہے کہ اگر فریقِ ثانی صلح کرنا چاہے تو کرے۔ وہاں کے شہری اپنے تحفظ کا سامان کرلیں۔ وہاں کی حکومت دفاع اور ہجوم کے بارے میں آخری فیصلہ کرلے۔ لیکن جاپان سات آٹھ برس تک چین سے برسرِ پیکار رہا۔ اس کے لاکھوں آدمی ہلاک کر دیئے اس کے کتنے شہروں پر قبضہ کرلیا۔ اسے بری طرح تباہ و برباد کر دیا لیکن اعلانِ جنگ نہ کرنا تھا نہ کیا۔ اور اس کے اتحادی ———— جن میں امریکہ اور برطانیہ بھی شامل تھے ———— خاموشی سے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی نے روس پر حملہ کیا لیکن اعلانِ جنگ کی ضرورت محسوس نہ کی۔

۵۔ معاہدۂ دوستی

معاہدہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس پر عمل ہو۔ دوستی کے پیمان اس لئے باندھے جاتے ہیں کہ دشمنی کا کوئی امکان باقی نہ رہے لیکن اس بیسویں صدی کی دونوں جنگوں میں دنیا نے بڑے بڑے عجیب تماشے دیکھے اور بلاوجہ و بلا سبب دوستی کے رشتے ٹوٹتے ہوئے دیکھے۔

۱۳ اگست ۱۹۱۴ء کو جرمن چانسلر نے برلن میں جو تقریر کی تھی۔ اس کے اقتباسات "لندن ٹائمز" نے شائع کئے تھے:۔

"حضرات! ———— ہم ضرورت کے عالم میں ہیں اور ضرورت قانون سے ناآشنا ہے۔ ہماری فوجوں نے لکسمبرگ پر قبضہ کرلیا ہے۔ اور شاید وہ اس وقت تک بلجیم پر قدم زن ہو چکی ہوں گی۔ حضرات! میں مانتا ہوں یہ اقدام بین الملی قانون کے خلاف ہے۔ لیکن ہمارے سرحدی بازو پر فرانسیسی فوج کی نقل و حرکت ہمارے لئے ایک آفت ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہمیں لکسمبرگ اور بلجیم کے جائز اعتراض کو مجبوراً پامال کرنا پڑا۔

ہم علانیہ کہتے ہیں کہ ہم ایک حق تلفی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مگر جونہی ہمارا فوجی مقصد حاصل ہو جائے گا، ہم فوراً تلافی کی کوشش کریں گے۔ جو کوئی بھی ہماری طرح خطرہ میں ہوگا۔ وہ صرف ایک ہی بات سوچ سکتا ہے کہ کسی طرح قطع و برید کر کے اپنا راستہ نکالا جائے ——؟

اور دوسری جنگ عظیم میں بھی ایسے ہی ہوشربا واقعات پیش آئے۔ البانیہ اور اٹلی میں دوستی کا معاہدہ تھا۔ البانیہ کے بادشاہ احمد بے زوغو کی شادی پر مسولینی نے خود اپنی طرف سے تحایف بھیجے تھے۔ لیکن جب جنگ چھڑی تو دوستی، دوستی کا معاہدہ، تحائف کا انبار، یہ سب رکھا رہ گیا۔ اٹلی نے بغیر کسی وجہ اور سبب کے البانیہ پر چڑھائی کی اور اسے فتح کر لیا۔ احمد بے زوغو بھاگ کر لندن پہنچے اور وہاں پناہ گزین ہو گئے۔

پولینڈ اور روس میں دوستی کا معاہدہ تھا۔ پولینڈ پر جرمن قبضہ سے صرف چند دن پہلے پولینڈ کے سفیر اور اسٹالن میں گھل مل کر ربط و ضبط کی باتیں ہوئی تھیں۔ دوستی کا رشتہ اور زیادہ مستحکم ہو گیا تھا۔ لیکن جب جرمن فوجیں فاتحانہ یلغار کرتی ہوئیں پولینڈ میں داخل ہوئیں۔ تو فوراً ہی بغیر کسی "عذر" کے باقی نصف حصہ پر روس نے قبضہ کر لیا اور جب پولینڈ کے سفیر نے اپنی چند روز پہلے کی دوستانہ ملاقات کا اسٹالن سے ذکر کیا تو اس نے بڑی معصومیت اور سنجیدگی کے ساتھ کہا:۔

"پولینڈ اب ہے کہاں ——؟"

یعنی تم کس کی طرف سے بول رہے ہو؟ کیا اس کی طرف سے جو ہمارے دندانِ آز کا شکار ہو چکا؟

۷۔ اپنا اور دوسروں کا تحفظ

اپنا تحفظ ایک معقول بات ہے، ہر شخص کرتا ہے اور کرنا چاہیئے۔ ذاتی تحفظ کے لئے اگر نادانستہ یا اتفاقاً یا غیر ارادی طور پر کسی کو ضرر پہنچ جائے تو بھی چنداں مضائقہ نہیں۔ لیکن

محض تحفظ کے خیال سے دوسروں پر حملہ کر دینا' دوسرے ملک پر قبضہ کر لینا غیر قوموں کو غلام بنا لینا کہاں تک جائز ہے ؟ ـــــــ اس سوال کا جواب موجودہ مہذب متمدن اور انسانیت نواز دنیا تو یہ دیتی ہے کہ بالکل جائز ہے۔ اور اگر یہ بات نہیں تو بتایا جائے کہ دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے یونان پر کیوں اپنے پیراشوٹ اتارے تھے ؟ جرمنی نے معاہدۂ دوستی و اخلاص کے باوجود دفعتہً روس پر کیوں حملہ کر دیا تھا ؟ چرچل کی فوجیں افریقہ کے ایک دور دراز مقام زنجبار پر کیوں قابض ہو گئی تھیں ؟ روس، برطانیہ اور امریکہ کی فوجوں نے ایران میں کیوں ڈیرہ خیمہ ڈال لیا تھا ؟ جاپان نے صلح و مفاہمت کی گفت و شنید کرتے کرتے پرل ہاربر پر کیوں دھاوا بول دیا تھا ؟

غالب اور مغلوب

جنگ جب ہوتی ہے تو فریقین میں سے ایک جیت جاتا ہے۔ دوسرا ہارتا ہے۔ اب جیتا ہوا ہارے کے ساتھ کیا کرتا ہے ؟

عہد مغلیہ میں چنگیز اور ہلاکو کے بارے میں ہم نے تاریخ میں یہ پڑھا تھا کہ وہ جس شہر کو جیت لیتے تھے۔ اس کے باشندوں کو شہر سے باہر ایک میدان میں جمع کر کے قتل کر دیتے تھے اور شہر کا مال و اسباب اور زر نقد لوٹ کر آگ لگا کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ لیکن آج کے عہد اور دور عروج میں ہم کیا دیکھتے ہیں ؟ مہدی سوڈانی کو شکست دینے کے بعد لارڈ آف خرطوم " لارڈ کچنر نے کیا کیا تھا ؟ حبش پر جب مسولینی کی فوجیں قابض ہو گئیں۔ تو ایک امریکی سیاح نے اپنے تاثرات سفر میں لکھا تھا ـــــــ اطالوی سپاہیوں کی ہوس پرستی کا شکار حبش کی ہر وہ عورت ہو چکی ہے جو بالغ ہے ! ـــــــ پہلی جنگ عظیم کے بعد بھی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی جرمنی میں بے روزگاری اور بے عصمتی ہوا اور پانی کی طرح عام ہو گئی۔ جاپان میں آج دو لاکھ سے زیادہ بن باپ کے بچے موجود ہیں۔ یہ بچے یتیم نہیں ہیں۔ ان کے باپ زندہ ہیں داد عیش دے رہے ہیں لیکن یہ ان کے ناجائز بچے ہیں۔ جو ممالک مفتوح و مغلوب نہیں ہوئے تھے بلکہ دوست ، ساتھی اور شریک جنگ تھے۔ وہاں بھی بالادستوں نے زیر دستوں کے ساتھ کیا کچھ

نہیں کیا؟ کلکتہ سے لے کر رنگون تک کے سارے علاقے میں اتحادی سپاہیوں نے جس ہوسناکی کا مظاہرہ کیا اس سے کون واقف نہیں ہے؟

دراز دستی ایں کوتاہ آستیناں بیں!

کھیتوں میں کام کرنے والی لڑکیاں، ٹرک پر گذرنے والے سپاہیوں کی دستبرد سے نہ بچ سکیں اور جو لڑکیاں فوج کے مختلف شعبوں میں ملازم تھیں ان کے بارے میں تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

۸۔ تاوانِ جنگ

جب ایک فریق شکست کھاتا ہے اور دوسرا فتحیاب ہوتا ہے۔ تو جیتا ہوا فریق ہارے ہوئے فریق پر تاوانِ جنگ عاید کرتا ہے۔ اصل اور اصل کے ساتھ سود در سود بھی۔ تمام ماہرینِ سیاسیات بین الاقوام اس پر متفق ہیں کہ دوسری جنگ عظیم کا سبب پہلی جنگ عظیم کے بعد وہ معاہدہ ورسیلز تھا جس نے جرمنی پر اتنا نامنصفانہ اور ظالمانہ بوجھ لاد دیا تھا جسے وہ برداشت نہ کر سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر ابھرا اور اس نے ایک مرتبہ پھر دنیا کو ہلاکت کے خطرہ میں ڈال دیا۔

اور اب دوسری جنگ کے بعد پھر ہم نے دیکھا کہ تاوانِ جنگ عاید کرنے کے سلسلہ میں جس بددیانتی اور جن ناانصافیوں کا مظاہرہ کیا گیا، انہوں نے پھر تیسری عالمگیر جنگ کے لئے فضا ہموار کر دی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آتش فشاں کب پھٹے اور لاوا اگلنے لگے۔

۹۔ انسانیت کا احترام

جنگ بہر حال انسانوں میں ہوتی ہے درندوں اور جانوروں میں نہیں ہوتی۔ انسان اور جانور میں مابہ الامتیاز صرف یہ ہے کہ انسان اخلاقِ عالیہ سے متصف ہے اور جانور اس سے محروم ہے۔ لیکن اخلاقِ عالیہ کی نمائش صرف اس وقت تک ہے جب تک لڑائی نہیں چھڑتی۔ جب جنگ کے میدان میں توپیں آگ اگلنے لگتی ہیں۔ تو اخلاقِ عالیہ کے صفاتِ حسنہ

یکسر اخلاق ذمیمہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ؎

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

وہ جنگ ہی ہے جب بڑی آسانی سے دن دہاڑے اور ظاہر ظہور اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکل جاتا ہے۔ انسانیت کبریٰ کا وعظ کہنے والا عظیم و جلیل انسان تربیت گاہوں اور ہسپتالوں، کالجوں اور سکولوں، عبادت گاہوں اور صنم خانوں تک کو معاف نہیں کرتا۔ اس کی شہ زوری کا نشانہ مقابل فوج نہیں ہوتی۔ میدان جنگ سے دور اور جنگ سے نفور نہتے اور عافیت پسند شہری اور دیہاتی ہوتے ہیں جن پر بم پھینکے جاتے ہیں جن کا پانی بند کیا جاتا ہے۔ جن کی غذائی رسد میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ جن کے ہسپتالوں اور مدرسوں کو مسمار کیا جاتا ہے تاکہ وہ سہم جائیں، ان میں ہراس پیدا ہو۔ اور گھبرا کر اپنی حکومت اور قوم کے لئے پورس کے ہاتھی ثابت ہوں۔ ماہرین حربیات کا خیال ہے۔ جنگ ختم کرنے کا اس سے بہتر کوئی تیر بہدف نسخہ نہیں؛

۱۰۔ دورانِ جنگ کے وعدے

دورانِ جنگ میں وعدوں کا کاروبار خوب چلتا ہے۔ یہ موسم بہار اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک جنگ جاری رہتی ہے۔ ان وعدوں کی نوعیت بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ لڑنے والے اپنے گروہ کو بڑھانے، اپنی جتھہ بندی میں اضافہ کرنے اور اپنے ہمنواؤں اور طلبگار کی تعداد زیادہ کرنے کے لئے خوب خوب وعدے کرتے ہیں۔ غلاموں سے آزادی کے وعدے کرتے ہیں۔ کمزوروں کو نئے نئے وسائل و ذرائع کی بشارت دیتے ہیں۔ برابر کے ساتھیوں کو مالِ غنیمت اور مفتوح ممالک کی باہمی تقسیم کا لالچ دیتے ہیں۔

اور ــــــــــــــ جب جنگ سر ہو جاتی ہے۔ تو ان وعدوں کا ایفا صرف اسی حد تک کیا جاتا ہے۔ جس حد تک نئے حالات اجازت دیں جس حد تک مفاد اور مصلحت

کا تقاضا ہو جس حد تک فتح مندی کی آن اور شان میں فرق نہ آئے پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کے خلاف عربوں کو بھڑکایا گیا تھا کہ وہ ترک حکومت کے خلاف بغاوت کر دیں۔ تاکہ آزاد عرب مملکت قائم ہو سکے۔ ترکوں کے خلاف مصر میں حجاز میں، شام و لبنان میں، عراق میں ہر جگہ بغاوت ہوئی۔ خلیفۃ المسلمین کے خلاف عرب مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑی بیدردی سے ترکوں کو مار مار کر اپنے ملک سے نکال باہر کر دیا۔ اتحادی عربوں کی اس سعادتمندی سے بڑے خوش تھے۔ وعدوں کے انعام اور زیادہ پر زور ہو گئے۔ لیکن جب اتحادی غالب آئے اور ترک ہار گئے تو انہوں نے، اپنے وعدوں کا ایفا اس طرح کیا کہ مصر اور عراق برطانیہ کے اقتدار میں آ گئے۔ شام و لبنان پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم کرنے کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ طرابلس وغیرہ کے علاقے اطالیہ کے تصرف میں رہے۔ جرمنی سے افریقہ کی جو نوآبادیاں چھینی گئیں۔ وہ بھی اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کر لیں۔۔۔۔ آزادی کسی کو نہ ملی مضبوط شرکار نے سب کچھ لے لیا اور کمزور شرکار کے حصے بخرے ہو گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد میثاق اوقیانوس" عالم وجود میں آیا۔ اس معاہدہ کے باوجود نہ تیونس آزاد ہوا نہ مراکش طنجہ کو آزادی ملی نہ طرابلس برطانوی اقتدار کی قید و بند سے رہا ہوا۔ انڈونیشیا والوں نے سر اٹھایا تو ہالینڈ کی مدد کے لئے ہندوستان سے انگریزوں نے اور دوسرے مقامات سے دوسرے اتحادیوں نے فوجیں بھیج دیں۔ پھر وہ آزاد ہوا تو ہالینڈ نے "پولیس ایکشن" کے ذریعہ آزادی چھین لی۔ حالات سے مجبور ہو کر پھر آزاد کیا۔ لیکن آزادی کے باوجود بہت سی "ترجیحات" حاصل کر لیں اور نیوگنی کا علاقہ دبا لیا۔ غرض کوئی وعدہ بھی صحیح معنوں میں شرمندۂ تکمیل نہ ہوا۔

۱۱۔ اعلانِ جنگ کی بنیاد

موجودہ دور میں جنگ کی بنیاد مذہب نہیں ہے۔ عقائد کا اختلاف بھی نہیں ہے۔ دنیا کے اخلاقی مفاسد کی تطہیر بھی نہیں ہے۔ صرف سیاست ہے اور سیاست بالعموم

اسباب و دلائل کے تابع نہیں ہوتی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں مسٹر چرچل نے اعلان کیا اگر امریکہ نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ تو ۲۴ گھنٹہ میں برطانوی فوجیں جاپان کے خلاف صف آرا ہو جائیں گی روزویلٹ اور چرچل مل کر عصمت اتونو کے پاس پہنچے کہ شریک جنگ ہو جائیے۔ روس نے فن لینڈ سے کہا ہمارے ساتھ مل کر بے جانے بوجھے دشمنوں سے لڑو ورنہ ہم تم سے لڑیں گے۔ چنانچہ دونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ ان لڑنے والوں میں متعدد ایسے تھے جو ایک دوسرے کے قطعاً دشمن نہ تھے۔ لیکن سیاست نے انہیں جنگ کے میدان میں پہنچایا۔ اور لڑنے لگے۔ یہ جانے بغیر کہ جنگ کا مقصد صالح ہے یا غیر صالح؟ ظاہر ہے۔ ملک گیری جوع الارض اور توسیع مملکت کے جذبۂ فاسد کو صحیح بنیاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ نہ استحصال بالجبر کاروباری فروغ اور استعمار پسندی کو مناسب بنیاد مانا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ دشمن کا حق

میدان جنگ میں آنے کے بعد دشمن تمام حقوق سے محروم ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے پاس صرف ایک ہی حق رہ جاتا ہے یہ کہ ہلاک کر ڈالا جائے۔ آبدوز آدمیوں سے بھرے ہوئے جہازوں کو غرقاب کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ڈوبنے والے "دشمن" تھے۔ طیارے شہری آبادی کو ہلاک کر ڈالتے ہیں کہ وہ "دشمن" حکومت کی رعایا تھے۔ ضرورت ہو تو دشمن کے ہسپتالوں کے آتش ریز بم اور شہریوں کے لئے ہلاکت آفریں جراثیم بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ مقصد دشمن کی جان لینا ہے اور حصول مقصد کے لئے ہر طریقہ اور ذریعہ جائز اور مباح ہے۔

۱۳۔ ظالم یا مظلوم؟

ہم راستہ چلتے ہوئے کسی نابینا کو دیکھتے ہیں تو اس کی لاٹھی پکڑ کر صحیح راستہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ کسی کو گرفتار بلا دیکھتے ہیں تو اس کی مدد میں تامل نہیں کرتے۔ کسی کو ایذا رسانی پر آمادہ دیکھتے ہیں تو اسے ملامت کرتے ہیں۔ کسی کو چوری کرتے، ڈاکہ ڈالتے، قتل کرتے دیکھتے ہیں

اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اپنی عام اور روزمرہ کی زندگی میں ہم ظالم کو برا سمجھتے ہیں اور مظلوم کی مدد پر کمربستہ رہتے ہیں لیکن جنگ کے میدان میں یہ اصول یکسر بدل جاتا ہے۔

جنگ کے دوران میں ہم ظالم اور مظلوم کی طرف توجہ نہیں کرتے، صرف دوست اور دشمن کو دیکھتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو بے تامل ظالم کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں اور مظلوم کی سرکوبی کرتے ہیں۔ چوروں لٹیروں اور قاتلوں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ اور جو لوٹے گئے، قتل کئے گئے۔ ان پر روانی کے ساتھ تلوار چلا دیتے ہیں۔

حبش مظلوم تھا لیکن مدد اٹلی کی جاری رہی۔ البانیہ بھی مظلوم تھا لیکن مسولینی کا ہاتھ کوئی نہ پکڑ سکا۔ چین کی مظلومیت بھی ایک حقیقت تھی لیکن جاپان سے سفارتی اور دوستانہ تعلقات سب کے قائم رہے۔ ہندوستان بھی مظلوم تھا لیکن کسی اتحادی نے برطانیہ سے کہا نکل جاؤ؟ فلپائن بھی مظلوم تھا لیکن امریکہ سے یہ مطالبہ کرنے والا کوئی نظر نہ آیا کہ اسے آزاد کر دو۔ طیونس۔ الجزائر۔ مراکش بھی مظلوم ہیں لیکن مجلس اقوامِ متحدہ تک میں یہ ہمت نہیں کہ وہ فرانس کو یہ حکم دے کہ ان مظلوموں کو اور زیادہ نہ ستاؤ۔ جنوبی افریقہ میں وہاں کے قدیم باشندوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے اور جن لوگوں کا دامن ماؤ ماؤ تحریک سے ذرا بھی داغدار ہے بلکہ جن پر یہ شبہ بھی ہے کہ یہ ماؤ ماؤ کے ہمدرد ہیں ان کا "شکار" کیا جا رہا ہے۔ تلوار سے، بندوق سے، مشین گن سے، ہر چیز سے۔ غرض ہر جگہ ظلم کا بول بالا ہے اور مظلومیت کی فریاد نقار خانہ میں طوطی کی آواز سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ———— جنگ ظالم اور مظلوم کے فرق کو مٹا دیتی ہے۔ ایک نیا فرق پیدا کر دیتی ہے۔ دوست اور دشمن، دوست کی ہر سفاکی اور خون آشامی کارِ خیر اور دشمن کی زیادہ سے زیادہ ہلاکت اور بربادی کارِ ثواب!

۱۴۔ مفاد کا مسئلہ

جنگ و پیکار کے اسباب و وجوہ میں جہاں اور بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہاں

ایک سب سے بڑا سبب "مفاد" ہوتا ہے۔ ہمارے مفاد کا تقاضا تھا لہٰذا ہم نے جنگ کی۔ برطانیہ کے "مفاد" کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ملایا میں موجود رہے لہٰذا ہے۔ امریکہ کے "مفاد" کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی فوجیں جاپان میں موجود رہیں لہٰذا ہیں۔ ہندوستان کے "مفاد" کا تقاضا یہ تھا کہ حیدر آباد آزاد نہ رہ سکے۔ ٹراونکور آزادی کا جھنڈا نہ لہرا سکے۔ لہٰذا ایک کے خلاف "پولیس ایکشن" ہوا دوسرے کے خلاف "ناکہ بندی"! کشمیر کے چالیس لاکھ باشندے صرف اس لئے بھارت کے ساتھ وابستہ رہنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں کہ بھارت کا "مفاد" اسی میں ہے۔ برطانیہ اگر جبل الطارق (جبرالٹر) اسپین کے حوالے کر دے تو اس کا "مفاد" مجروح ہو جائے گا۔ وہ نہر سویز کا علاقہ خالی کرنے میں بھی اسی لئے لیت ولعل سے کام لیتا رہا۔ کہ "مفاد" نے اس کے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔ غرض مفاد کا لامتناہی سلسلہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ "مفاد" جب بھی ٹکراتا ہے جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور جب تک زیادہ سے زیادہ خوفناک صورت میں یہ جنگ رونما نہیں ہوتی۔ مفاد کی ٹکر بھی ختم نہیں ہوتی۔

مفاد کا زیادہ سچا نام "خود غرضی" ہے! ہمارا مفاد دوسرے کا نقصان ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں جب ہم دوسرے کو نقصان پہنچا لیتے ہیں تب مفاد حاصل کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں یہ جائز ہے لیکن کیا حقیقۃً بھی اسے جائز ہونا چاہیئے؟ کیا انصاف، رواداری اور مساوات عامہ کا تقاضا یہی ہوسکتا ہے ——————؟

اور اسلام؟

ہم نے دیکھ لیا آج کی دنیا جنگ میں کیا کچھ جائز رکھتی ہے؟ محکوموں اور غلاموں سے کیا برتاؤ کرتی ہے؟ زیردستوں اور کمزوروں سے اس کا سلوک کیا ہے؟ —————— اب ہمیں دیکھنا ہے۔ اسلام کا مسلک کیا ہے؟ وہ جنگی قیدیوں، دشمن سپاہیوں، محکوم لوگوں اور غیر مسلموں سے کس برتاؤ کی تلقین کرتا ہے؟ عہد شکنی کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ غیر مصافی آبادی کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہے؟ ظالم کے بارے میں اس کی پالیسی کیا ہے:

اسلام کا نظام!

اسلام صرف ایک دین اور مذہب نہیں۔ وہ ایک دستور، جہات اور ضابطۂ زندگی بھی ہے وہ صرف یہ نہیں بتاتا کہ ایسا کرو تمہاری روح پاک ہو جائے گی۔ وہ یہ بھی حکم دیتا ہے کہ ایسا کرو تمہاری دنیا سنور جائے گی۔ وہ صرف آخرت ہی کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ وہ دنیا کو بھی پوری اہمیت دیتا ہے۔ وہ صرف مسجد کے اندر موجود نہیں۔ اس کا نشیمن انسان کا دل ہے۔ وہ ہر کام، ہر فعل، ہر خیال، ہر عمل کا جائزہ لیتا اور احتساب کرتا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، ملنے جلنے، پڑھنے لکھنے، آنے جانے ہر چیز پر اس کی قدغن ہے۔ ہر چیز کو وہ دیکھتا پرکھتا اور جانچتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ دنیا کو چھوڑ دو آخرت کو پا لوگے۔ وہ یہ کہتا ہے —— دنیا کو اچھی طرح برتو۔ آخرت بن جائے گی۔ وہ دین کے لئے دنیا کو اور دنیا کے لئے دین کو لازمی اور اساسی قرار دیتا ہے وہ ایک کو دوسرے کی ضد اور مخالف قرار نہیں دیتا وہ ایک کا دوسرے سے اشتراک و تعاون لازمی قرار دیتا ہے۔ جس شخص کی دنیا اچھی نہیں اس کا دین بھی کامل نہیں جو دنیا نہیں بنا سکتا وہ عاقبت بھی محمود نہیں بنا سکتا اس نے ہر چیز کا ایک ضابطہ مقرر کر دیا ہے وہ جنگ کے میدان میں، خلوت خانہ میں، مسجد کی محراب میں، کاروبار کی دکان اور دفتر میں ہر جگہ موجود ہے۔ اس کی فرمانروائی اور سلطانی ہر جگہ قائم ہے۔ اس نے ہر عمل کو ایک مقصد کا تابع کر دیا ہے۔ مقصد اگر نہیں حاصل ہوتا تو پھر عمل بیکار ہے۔ یہ امتیاز دنیا کے ادیان و مذاہب میں صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے صاف اور واضح الفاظ میں عبادات و اعمال کی تعیین و تحدید کر دی ہے تاکہ ہر وقت یہ بات پیش نظر رہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کا مقصد کیا ہے؟ اور ہمارے قول و عمل سے وہ مقصد حاصل بھی ہوا یا نہیں؟ اور یہ بات بغیر جائزہ اور احتساب کے نہیں حاصل ہو سکتی:

مقاصد کی تعیین!

نماز کے بارے میں فرمایا!

ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر   نماز ہر قسم کی برائیوں سے انسان کو روکتی ہے۔

روزہ کے بارے میں ارشاد ہوا

لعلکم تتقون

تاکہ روزہ کے ذریعے تم لوگ پرہیزگار بن جاؤ

زکوٰۃ کا مقصد یہ قرار دیا

خذ من اموالھم صدقۃ
تطھرھم وتزکیھم بھا

لوگوں کے مال و دولت میں سے ایک حصہ بطور صدقہ کے لو کیونکہ تم اس کے ذریعہ ان کے بخل اور حرص و طمع کی بداخلاقیوں کو پاک وصاف کرسکو گے۔

حج کا مقصد یوں متعین کیا

لیشھدوا منافع لھم ویذکروا
اللہ فی ایام معلومات

حج کا اصلی مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے فوائد کو حاصل کرسکیں اور اس کے ساتھ ہی چند مخصوص دنوں میں خدا کی یاد کر لیا کریں!

جہاد

اب جہاد یعنی جنگ کو لیجئے ——— اس بارے میں بھی اسلام نے سب سے الگ سب سے جدا اور نہایت مناسب اور مبنی بر انصاف طرز کار اختیار کیا ہے اس نے اس سلسلہ میں معمولی سے معمولی جزئیات تک کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس نے کھول کھول کر احکام و مسائل بیان کئے ہیں۔ اس نے وضاحت اور تشریح کے ساتھ ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی یا شک وشبہ کا امکان باقی نہ رہ جائے۔ سب سے پہلی اصلاح اس نے یہ کی کہ "جنگ" کا لفظ ہی ترک کر دیا۔ اس کے بجائے "جہاد" کی اصطلاح وضع فرمائی جنگ کا لفظ قتل و غارت، ظلم و بربریت، سفاکی اور شقاوت کا آئینہ دار ہے۔ اور جہاد کے لفظ میں مقاتلہ سے زیادہ اصلاح نفس اور تزکیہ اعمال کا مفہوم پوشیدہ ہے ——— جنگ تلوار ہے' جہاد اصلاح :

اس سلسلہ میں اگر ہم ترمذی کی ایک حدیث کو پیش نظر رکھیں تو شاید ہمارا مقصد زیادہ واضح ہو سکے گا۔ جنگ میں لوٹ مار سلب و نہب اور قتل و غارت ایک معمولی سی چیز ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ محرکاتِ جنگ میں ایک محرک مفتوح کے مال و اسباب کا لوٹنا بھی ہے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ لیکن اسلام کا جہاد چونکہ تزکیۂ نفس اور ضبطِ عادات کا نام ہے۔ اس لئے مالِ غنیمت کبھی بھی جہاد کا لازمی جزو نہ بن سکا۔ جہاد کا مقصد اعلیٰ اور اشرف ہے۔ وہ ایسی پست چیزوں سے اپنا دامن آلودہ نہیں کر سکتا۔

فلما كان يوم بدر وقعوا في الغنائم قبل ان تحل لهم فانزل الله لولا كتاب من الله لكم فيما الذتم عذاب عظيم ٥ (ترمذی کتاب التفسیر)

جب غزوۂ بدر پیش آیا تو صحابہ مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ حالانکہ اس وقت تک مالِ غنیمت مسلمانوں پر حلال نہیں ہوا تھا۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی کہ اگر خدا کی مشیت نے اس کا فیصلہ پہلی طرح نہ کر دیا ہوتا۔ تو جو مال تم نے غنیمت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ اس پر عذابِ عظیم نازل ہوتا!

جہاد اور جنگ

مسلمانوں کے جہاد اور دوسروں کی لڑائی میں وہی فرق ہے جو آگ اور پھول میں۔ جنگ دوسروں نے بھی کی اور مسلمانوں نے بھی؛ ——— دوسروں کی جنگ نے تباہی ہلاکت، غارت گری، قتل و نہب اور انہدام و تخریب کے سوا کچھ نہ دیا اور مسلمانوں کے جہاد نے ریگستان کو لالہ زار بنا دیا۔ جاہلوں کو علم و یانت اور تقویٰ کی نعمت عطا کی نادار اور محکوموں کو تاجِ خسروی اور تختِ سکندری بخشا۔ جہاں جہالت تھی وہاں علم کا دیا روشن کیا جہاں ناانصافی تھی وہاں عدل کا مینارہ قائم کیا۔ جہاں تعصب کی کارفرمائی تھی وہاں رواداری کا پیام پہنچایا۔ جہاں ظلم و جور کا سکہ چلتا تھا وہاں رحم و مروت اور اخوت و انصاف کے

ایوانوں کی بنا ڈالی۔ جہاں مظاہر کی پرستش ہوتی تھی وہاں ایک خدا کا کلمہ بلند کیا۔ جہاں اونچ نیچ اور پست و بلند کے پیمانے کام کرتے تھے۔ وہاں مساوات کا معیار سامنے رکھا۔ جہاں رشوت، استحصال اور ناجائز نفع اندوزی کا بازار گرم تھا۔ وہاں امانت و دیانت اور نفع خلائق کا درس دیا ———— اسلام جہاں پہنچا۔ اس نے وہاں کی دنیا بدل دی۔ جبر و جور سے نہیں۔ صرف اسوۂ حسنہ سے۔ یہ کہانی بڑی طویل ہے۔ لیکن جتنی طویل ہے اس سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز بھی ہے ؂

اسلام پر الزام

مسلمانوں پر ہمیشہ دشمنوں اور مخالفوں نے الزام عاید کیا کہ وہ نا روادار ہیں، متعصب ہیں تنگ دل ہیں۔ وہ نامسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔ وہ غیر مسلموں کو اپنے ساتھ عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کا موقع نہیں دے سکتے۔ وہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنا لیتے ہیں۔ اور جو مسلمان بننے سے انکار کرتا ہے اسے یا تو قتل کر دیتے ہیں یا جلا وطن کر دیتے ہیں۔ جب سے پاکستان عالم وجود میں آیا ہے۔ یہ اعتراضات اور الزامات اور زیادہ شدت کے ساتھ دہرائے جا رہے ہیں۔ اور دنیا کو باور کرایا جا رہا ہے کہ مسلمان ہرگز اسے گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کے اس نئے دیس میں غیر مسلم آزادی اور مساوات کی زندگی بسر کریں۔ یہ اسی پروپیگنڈے کا نتیجہ تھا کہ پاکستان کے ان مقامات کے ہندو بھی ترک وطن پر آسانی سے آمادہ کر لئے گئے۔ جہاں کسی قسم کا فساد یا کشت و خون نہیں ہوا تھا۔ جہاں نہ کسی کی دکان لوٹی گئی نہ مکان چھینا گیا تھا۔ جہاں کامل امن و امان تھا۔ اور کامل ہم آہنگی اور ربط و خلوص کی زندگی بسر کی جا رہی تھی ؂

تاریخ کی گواہی

اس کتاب میں واقعات و شواہد سے تاریخی دلائل سے مسلم اور غیر مسلم مورخین کے بیان سے میں یہ ثابت کروں گا۔ کہ دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے

جس نے "لا اکراہ فی الدین" کا حکم دیا۔ اور جس کے پیرووں نے بہت سی گمراہیوں اور غلط کاریوں کے باوجود اس حکم سے کبھی سرتابی نہیں کی۔

عیسائی جب فاتح کی حیثیت سے اسپین میں داخل ہوئے تو مسلمانوں کو عیسائی بننا پڑا، یا وہاں سے جلا وطن ہونا پڑا۔ ایک مشہور امریکی مصنف نے اپنی مشہور کتاب "مورسکوز" (MORISCOS) میں شرح و بسط کے ساتھ اسپین کی سرکاری دستاویزوں سے ثابت کیا ہے کہ مسلم حکومت کے اختتام کے بعد کتنے مسلمان، مسلمان ہونے کے جرم میں زندہ جلا دیئے گئے، قتل کئے گئے، پھانسی پر لٹکائے گئے، کتنوں کی زمین چھینی گئی، جائداد ضبط کی گئی، مال و متاع پر ڈاکہ ڈالا گیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے ایک ہزار برس تک ہندوستان پر حکومت کی، مگر یہاں اس طرح کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت کی پوری تاریخ موجود ہے۔ یہ تاریخ دوستوں نے بھی لکھی ہے اور دشمنوں نے بھی۔ اور سب نے اس اعتراف پر اپنے تئیں مجبور پایا کہ مسلمانوں سے بڑھ کر روادار قوم اس کرۂ ارض پر اب تک نمودار نہیں ہوئی۔

مباحث کی نوعیت

پیش نظر کتاب "اسلام اور رواداری" تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۱) پہلے حصہ میں میں نے دکھایا ہے کہ رواداری کی تعلیم قرآن نے کیا دی ہے؟ حدیث نبوی میں رواداری کی تاکید کس طرح آئی ہے؟ اور فقہائے اسلام کا اس باب میں کیا حکم ہے؟ یہ تو گویا ہوا قول ——— پھر میں نے دکھایا ہے کہ اس قول پر عمل کس طرح ہوا؟ اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے واقعات پیش کئے گئے ہیں کہ اسلام کی تاریخ کا صحیح معیاری دور تھا اور مرکز بھی۔ اس دور کے واقعات سے یہ بات بڑی آسانی سے واضح ہو جاتی ہے کہ اس سلسلہ میں اسلام کا قول و عمل کیا ہے؟

(۲) دوسرے حصے میں خلافت راشدہ سے لے کر خلافت عثمانیہ تک یعنی تقریباً تیرہ سو سال کے عہد خلافت و ملوکیت کے تاریخی واقعات مندرج ہیں۔ اس میں بنو امیہ، بنو عباس

فاطمئین مصر، خلافت اندلس اور تواریخ کے واقعات بھی درج ہیں۔

(۳) تیسرا حصہ صرف ہندوستان کے واقعات پر مشتمل ہے۔ ہندوستان پر ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے حکومت کی۔ یہ مدت بہت کافی ہوتی ہے۔ اگر رواداری کے جادۂ صحیح سے وہ ذرا بھی ڈگمگا گئے ہوتے تو آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ یہ نقشہ مسلمانوں کے مفید مطلب خواہ کتنا ہی ہوتا لیکن اسلام کے شایانِ شان ہرگز نہ ہوتا۔ میں نے جامعیت کے ساتھ ضروری اور سبق آموز واقعات مندرج کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس ایک ہزار سال میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ ایسی روادارانہ زندگی بسر کی جس کا عشر عشیر بھارت کی سیکولر حکومت میں بھی نظر نہیں آتا۔

خلاصۂ کلام

مسلمانوں کی چودہ سو برس کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس تاریخ کو اسلام کے مخصوص دوستوں اور کرم فرماؤں نے خوب کھنگالا ہے۔ کڑی تنقیدی نظر سے دیکھا ہے اپنی طرف سے بہت سی باتیں زیبِ داستاں کے لئے بڑھا بھی دی ہیں لیکن وہ بھی اگر کسی چیز پر دلیل اور برہان کے ساتھ گرفت نہیں کر سکے ہیں۔ تو وہ اسلام کی رواداری ہے۔ بلکہ بعض انصاف پسند غیر مسلم مورخین (لین پول وغیرہ) نے تو کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ کہ اسلام کی رواداری ایک روشن اور تابناک حقیقت ہے اور بعض نے قلبِ مجروح کے ساتھ اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ کہ ان کی قوم نے جب حاکمیت کی مسند پر قدم رکھا اور اقتدار و اختیار کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ تو مسلمانوں کی رواداری کا جواب تعصب، ظلم، سفاکی اور بہیمیت کے ساتھ دیا۔ اندلس صقلیہ اور بھارت کے واقعات اس دعوے کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔

اندلس میں ہر عیسائی اور یہودی کو وہی حقوق حاصل تھے جو ایک مسلمان کو۔ لیکن جب عیسائیوں نے اندلس پر قبضہ کیا۔ تو ان مسلمانوں تک کو نذرِ آتش کر دیا گیا جو عیسائی بن چکے تھے لیکن جن کی عیسائیت میں اسلام کا رنگ جھلک رہا تھا۔ صقلیہ (سسلی) میں بھی مسلمانوں

نے کسی کو جبراً عیسائی نہیں بنایا۔ لیکن جب مسلمان وہاں سے نکالے گئے تو اس طرح کہ پھر اُس سرزمین پر نہ کوئی مسجد قائم رہ سکی نہ خانقاہ۔ نہ مسلمان رہ سکا نہ اسلام کی کوئی یادگار۔ بھارت میں مسلمانوں نے طویل مدت تک حکومت کی اور کسی کے مذہب پر ڈاکہ نہیں ڈالا ہندوؤں کی حکومت اب چند سال سے قائم ہوئی ہے۔ لیکن مسلمان تو مسلمان، عیسائی تک پہنچنے لگے ہیں کہ ہماری زندگی وہاں دوبھر بنائی جا رہی ہے۔

اس پس منظر کی روشنی میں یہ اوراق انشاءاللہ نشانِ راہ ثابت ہوں گے :

(رئیس احمد جعفری ندوی)

قرآن کی رو دار تعلیم

کتاب اللہ کی تصریحات

ہم اپنی گفتگو کا آغاز اُس کتاب سے کریں گے جس کے بارے میں مسلمانوں کا عق
ہے کہ وہ خدا کی بھیجی ہوئی ہے۔ جس کے ایک ایک حرف اور ایک ایک شوشہ پر ان کا ایمان ہ
جس کے تقدس اور جس کی طہارت کی وہ قسم کھاتے ہیں جس کا ہر حکم اور ہر ہدایت صرف اس
لئے ہے کہ بے چون وچرا اس کی تعمیل کی جائے۔ حدیث، فقہ اور مجتہدات کے بعض پہلوؤں کی صحت او
عدم صحت پر گفتگو ہو سکتی ہے کہ بعض فرقے حدیث کی دینی حیثیت کے قائل نہیں بعض فقہ ک
اہمیت نہیں دیتے بعض مجتہدات پر اعتراض کرتے اور ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن
مسلمانوں کا ہر فرقہ جس چیز کے ہر ہر حرف اور نقطہ پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ صرف قرآن ہے
لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آغاز سخن اسی متفق علیہ کتاب سے کیا جائے!

قرآن کا روادارانہ مسلک

انجیل، توریت، وید، گیتا اور ژند اوستا وغیرہ کی تاریخی حیثیت اور قطعیت کے بار
میں کسی قسم کی گفتگو چھیڑنا مقصود نہیں۔ اس کتاب میں صرف مسلمانوں سے بحث
ہے۔ اور اسلام کے بدترین مخالف بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ جو قرآن آج ہمارے سامنے
موجود ہے یہ بالکل وہی ہے جو آج سے چودہ سو برس پہلے محمد بن عبداللہ بابآبائنا وامہاتنا
نازل ہوا تھا۔ اس میں نہ ایک شوشہ بڑھا ہے نہ ایک نقطہ کم ہوا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم سے ج
استنباط کیا جائے گا اور جو حوالہ دیا جائے گا وہ شک وریب سے بالا ہوگا۔ ایک مسلمان جس
طرح ۱ھ میں اس پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اسی طرح ۱۳۷۴ھ میں بھی رکھتا ہے۔ قرآن
تعلیم وتلقین، اس کے بنائے ہوئے اصول وضابطے، اس کا پیش کیا ہوا دستور وآئین، اس کے
قائم کئے ہوئے روایات ومعاملات، اس کے حل کئے ہوئے مسائل ومشکلات آج بھی جوں ک
توں موجود ہیں۔ ان میں کوئی تغیر نہیں ہوا ——— اور جب تک مسلمان اس کرۂ ارض
کے اوپر اور اس چرخ نیلی فام کے نیچے موجود ہیں ——— ہو بھی نہیں سکتا ———

میرا دعویٰ ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ جس رواداری، وسعتِ قلب و ظرف، عالی حوصلگی اور مساواتِ کامل کا نمونہ پیش کیا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب اور دنیا کی کوئی قوم اس معاملہ میں اس کی حریف نہیں بن سکتی۔ میرا یہ دعویٰ بھی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے محکوم غیر مسلموں کے ساتھ ہر دور اور ہر عہد میں ——— خواہ وہ عملی اعتبار سے اسلام کے اصول و تعلیم سے کتنے ہی ہٹ گئے ہوں ——— جس مساوات، رواداری اور شفقت کا برتاؤ کیا ہے۔ اس کی مثال بھی تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ "اسلام اور رواداری" کا جہاں تک تعلق ہے۔ دو باتیں خاص طور پر پیش نظر رہنی چاہئیں:۔

۱۔ قول

۲۔ عمل

——— قول کے سلسلہ میں ہم قرآن کریم، حدیث نبوی اور فقہ اسلامی کا دفتر کھنگالیں گے۔ کہ یہی تینوں چیزیں مسلمانوں کے ایمان، عقیدہ اور اقوال کا معیار ہیں۔ پھر عمل کی طرف متوجہ ہوں گے جس کی داستان تاریخ کی زبان سے ہم سنیں گے۔

رواداری کا میثاق

ہر نیا مذہب یہ چاہتا ہے کہ دوسرے ادیان ختم ہو جائیں اور وہ ان سب کی جگہ لے لے۔ ہر داعی مذہب یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی دعوت پھیلے اور روئے زمین پر چھا جائے۔ لیکن اس خواہش اور کوشش میں بہت جلد جبر اور جور کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں روم وغیرہ میں عیسائیت جس طرح پھیلی وہ ایسی داستان ہے جس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ اور اگر حالات کی نامساعدت کمزوری اور بے بسی کے باعث جبر و جور ممکن نہیں ہوتا۔ تو تند اور سخت الفاظ کی یورش شروع ہو جاتی ہے لیکن اسلام اور داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دامن ان دونوں چیزوں سے پاک ہے۔ داعی اسلام کی جد و جہد کا مرکز صرف یہ خیال ہے کہ دوسرے اس دعوتِ حق کو سنیں، سمجھیں، مانیں اور گردن جھکا دیں۔ لیکن بایں ہمہ وہ اسے پسند نہیں کرتا کہ جبر و جور یا سب و شتم سے کام لیا جائے

وہ صاف اور واضح الفاظ میں فرماتا ہے۔

قل یایھا الکافرون ۝ لا اعبد ما
تعبدون ۝ ولا انتم عابدون ما اعبد ۝
ولا انا عابد ما عبدتم ۝ ولا انتم عابدون
ما اعبد ۝ لکم دینکم ولی دین ۝

(اے پیغمبر) کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان
معبودوں کی پرستش نہیں کرتا جن کی تم کرتے ہو
اور جس کی میں پرستش کرتا ہوں اس کی پرستش تم نہیں
کرتے۔ نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا
جن کی تم پرستش کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی پرستش کروگے
جس کی میں پرستش کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا
دین اور میرے لئے میرا دین۔

یہ چند آیتیں رواداری کا ایک ایسا میثاق ہیں جو اپنی نوعیت میں فرد ہے جس کی مثال صفحۂ ارض پر کہیں نہیں ملتی۔ یہ میثاق صاف واضح اور غیر مشکوک الفاظ میں کافروں اور مشرکوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں، اپنے روایات، معاملات اور مسائل پر قائم رہیں لکم دینکم ولی دین۔ یہ دو الفاظ رواداری اور وسعت قلب کا ایسا چارٹر ہیں جس پر آج بھی دنیا کی کسی قوم کا عمل نہیں۔ صرف یہی نہیں کہ عمل نہیں، نظری اور اصولی طور پر بھی جسے دنیا نے یا دوسرے الفاظ میں مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں اور ملتوں نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ ہم تاریخ تک کو جھٹلا سکتے ہیں لیکن کیا مشاہدات کو بھی جھٹلا دیں گے؟ ہماری آنکھیں آج اپنے گردوپیش کیا دیکھ رہی ہیں؟ کیا اس معاملہ میں دنیا کی کوئی قوم بھی دیانت داری کے ساتھ ہماری حریف بن سکتی ہے؟ ——— کلا ثم کلا!

تفسیر جلالین میں ان آیات کا شان نزول یہ بتایا گیا ہے۔

قال رھط من المشرکین للنبیؐ تعبد
الھتنا سنۃ ونعبد الھک سنۃ [1]

یعنی مشرکین کی ایک جماعت نے آنحضرتؐ
سے کہا کہ سمجھوتہ یوں ہو سکتا ہے کہ ایک برس آپ

[1] تفسیر جلالین صـ ۵۰۵

ہمارے معبودوں کو پوجیں۔ ایک سال ہم آپ کے
خدا کو پوجا کریں گے۔

اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے۔ نہیں، عقائد کے معاملہ میں مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے مسلک سے منحرف نہیں ہو سکتے تم اپنے مسلک پر قائم رہو۔

رواداری کی اساس

لیکن آخر اسلام اس قدر وسیع القلب اور رواداریوں ہے؟ وہ اپنی سچائی کو زور و قوت اور طاقت کے بل پر منوانے سے کیوں گریز کرتا ہے؟ وہ صرف افہام و تفہیم اور دعوت و تبلیغ ہی پر زور کیوں دیتا ہے؟ وہ بھی موقع پاکر کیوں نہیں تلوار نکالتا اور مخالفوں، ورانداؤں، بدخواہوں منکروں، کافروں اور مشرکوں کی گردن اڑا دیتا ہے؟

ہاں ایسا ہو سکتا تھا لیکن اس لئے نہیں ہوا کہ دلیل تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ اسلام ناقابل فہم فلسفے، پیچیدہ اور دور از کار نظریات، عوام الناس کی فہم سے بالاتر تصورات، داستانوں، قصوں، کہانیوں، روایتوں اور شعروں کا مجموعہ نہیں ہے۔ جسے اگر کوئی نہ سمجھے یا سمجھنا نہ چاہے تو اس کی اصلاح کے لئے تلوار کا نسخہ ضروری ہو۔ وہ اپنے جلو میں آیات محکمات رکھتا ہے۔ دلائل واضح رکھتا ہے۔ ایسی نشانیاں رکھتا ہے جو آنکھ بند کر لینے کے بعد بھی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ خارج از قیاس باتیں نہیں کرتا۔ ایسی باتیں کہتا ہے جنہیں ایک عالی، ایک جاہل، ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے۔ وہ افلاطون اور سقراط کا فلسفہ نہیں پیش کرتا۔ آیتیں اور نشانیاں پیش کرتا ہے۔ وہ ذہن اور دماغ کو مرعوب اور دہشت زدہ نہیں کرتا۔ انہیں صحیح راستہ پر ڈالتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ مانو اور نہیں مانو گے تو مٹ جاؤ گے۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ دیکھو اور غور سے دیکھو سنو اور توجہ سے سنو۔ سوچو اور غیر جانبداری کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے خالی الذہن ہو کر سوچو۔ اس دنیا کے نظام کو اور اس کی باقاعدگی کو دیکھو۔ دریاؤں کی روانی، سمندروں کا مد و جزر، چاند، سورج اور ستاروں کا طلوع و غروب۔ ایک ہی پانی سے سیراب ہو کر اور ایک ہی زمین میں

دفن ہو کر اور ایک ہی زمین سے پیدا ہو کر کسی بیج کا گیہوں بن جانا کسی کا جوار کسی کا دھان کسی کا آم کسی کا خربوزہ کسی کا تربوز ——— یہ تاثیر کس نے پیدا کی ہے؟ یہ نظام کس نے قائم کیا ہے؟ یہ اصول کس نے بنایا ہے؟ ذرا سوچو کیا ان بتوں نے جن کے خالق تم خود ہو؟ اور ذرا سے توجہی کر دو تو وہ پھر مٹی کا ڈھیر بن جائیں؟ کیا ان دیویوں اور دیوتاؤں نے جنہیں یہ توفیق بھی نہیں کہ سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع کر دیں؟ کیا ان مظاہر اور مناظر نے جنہیں تم بڑے ذوق و شوق سے پوجتے اور مانتے ہو؟ لیکن جو قدرت کی ایک معمولی ضرب کی تاب بھی نہیں لا سکتے ——— کیا یہ باتیں خدا کی یکتائی پر دلالت نہیں کرتیں؟ اس کی سلطانی اور کار فرمائی کا زندہ جاوید اور ناقابلِ تردید ثبوت نہیں؟ ——— جب سوچو گے تو دل مانے گا لیکن دماغ خاندانی بندشوں، دماغی الجھنوں، روایاتی دشواریوں کا سنگ گراں پیش کر دے گا۔ پھر اگر تم حق کو محسوس کرنے کے باوجود نہیں مانتے تو بدقسمت ہو۔ اس قابل ہو کہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اب حق و باطل مخلوط نہیں الگ ہو چکے ہیں تمہارے سامنے دونوں راستے موجود ہیں خواہ حق کو قبول کر لو خواہ باطل کو۔ چنانچہ سورۂ بقر میں فرمایا۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی	دین میں زبردستی کا کچھ کام نہیں۔ گمراہی سے ہدایت الگ ظاہر ہو چکی ہے۔

گویا رواداری کی اساس یہ قرار پائی کہ چونکہ حق اور باطل نے جدا گانہ اور ممتاز صورت اختیار کر لی ہے۔ لہٰذا اب جبر و جور کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ ہاں افہام و تفہیم کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

تفسیر جلالین میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ

ظہر[1] بالایات البینات ان	یعنی آیات بینات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے

---

[1] تفسیر جلالین ص۳۹

الایمان رشد — کہ ایمان "رشد" (ہدایت) ہے۔ اور کفر "غی" (گمراہی)

افہام و تفہیم

قرآن کریم کا جتنا غائر مطالعہ کیا جائے گا۔ اتنی ہی یہ حقیقت منکشف ہوتی چلی جائے گی۔ کہ اسلام صرف افہام و تفہیم کا قائل ہے۔ وہ دل جیتنا چاہتا ہے۔ سر اور زبان نہیں۔ وہ رواداری کے اصول پر اتنا زیادہ جما ہوا ہے کہ اسے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ جوشِ عقیدت یا غلو میں اگر کوئی شخص مذاہب باطلہ کے معبودوں کے لئے کوئی نازیبا اور ناملائم لفظ استعمال کرے۔ وہ باطل کو باطل کہتا ہے۔ جہالت کو جہالت، کفر کو کفر، شرک کو شرک اور گمراہی کو گمراہی قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ تسلیم نہیں کرتا کہ حقانیت ثابت کرنے کے لئے دلیل کے علاوہ سب و شتم یا ہتھیار کا سہارا بھی لیا جائے۔ چنانچہ سورۂ انعام میں فرمایا

ولا تسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبوا الله عدوا بغیر علم — خدا کے علاوہ جو لوگ دوسروں کو پوجتے ہیں۔ انہیں برا بھلا مت کہو کیونکہ پھر وہ بھی بغیر جانے بوجھے از راہ عداوت خدا کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔

غور فرمائیے۔ آپ کے سب و شتم کے جواب میں جو لوگ خدا کو برا بھلا کہیں گے۔ ان کے لئے قرآن نے دو لفظ استعمال کئے ہیں

عدوا :

اور

بغیر علم!

یعنی جو لوگ تمہارے جواب میں خدا کے لئے نازیبا اور ناملائم الفاظ استعمال کریں گے وہ جہالت (بغیر علم) اور عداوت (عدوا) کا کرشمہ ہوگا[1] نہ کہ واقعیت اور حقیقت کا۔ لہذا

---

[1] تفسیر جلالین۔ صفحہ ۱۲۲

ایسے لوگوں کو اس کا موقع ہی نہ دینا چاہیئے۔ تم اگر یہ چاہتے ہو کہ تمہاری عزت کی جائے تو ضرور دوسروں کی عزت تمہیں کرنا پڑے گی۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے خدا کے خلاف ناشائستہ اور ناگفتہ بہ الفاظ نہ سنو۔ تو لازمی ہے کہ معبودانِ باطل کے خلاف بھی لب کشائی کرتے وقت احتیاط برتو۔ تم اگر انہیں برا نہیں کہو گے۔ تو یہ کافر اور مشرک مجبور ہوں گے کہ تمہارے خدا کے خلاف یاوہ گوئی سے کام نہ لیں۔

صاوی نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بتوں کے سب وشتم کی جو ممانعت آئی ہے وہ

ففی الحقیقۃ النھی عن سب اللّٰہ[1] — درحقیقت سبِّ خداوندی سے روکنے کے لئے ہے۔

حکمت اور موعظت

اسلام نے نہایت غیر مشکوک اور بالکل واضح طور پر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اسلام کی دعوت کس طرح دی جائے؟ بحث و مباحثہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نزاع جدال کی صورت اختیار کر لیتا ہے لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا وہ اسے ناپسند ہی نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے منع بھی کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ النحل میں ارشاد ہوتا ہے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن (النحل) — اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظت سے کام لے کر لوگوں کو دعوت دو۔ اور ان سے بحث کرو تو بطریق احسن۔

"حکمت اور موعظت کتنے جامع الفاظ ہیں۔ یہ نہیں فرمایا جاتا کہ لوگوں کو دین کی دعوت تلوار کی نوک پر دو۔ یہ بھی نہیں ارشاد ہوتا کہ تبلیغ مذہب کے لئے تحریص اور ترہیب سے کام لیا جائے کہ یہ چیزیں زبان کو قابو میں لا سکتی ہیں۔ دل کو اثر پذیر نہیں کر سکتیں۔ تاکید فرمائی گئی

---

[1] تفسیر جلالین صفحہ ۱۲۲

رب کے دین کی طرف حکمت اور موعظت کے ساتھ دعوت دو تاکہ وہ دعوت دل تک پہنچے۔ اور دل جس چیز کو قبول کر لیتا ہے پھر اس سے کبھی منحرف نہیں ہوتا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے گرہ میں باندھ لیتا ہے اور اسی کا ہو رہتا ہے ——— !

عام زندگی کے مسائل پر بھی جب بحث و گفتگو کا آغاز ہوتا ہے، تو بہت جلد یہ گفتگو درشتی اور تلخی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ پھر وہ مسائل جو عقائد سے تعلق رکھتے ہوں ان پر بحث و گفتگو کا انجام عام طور پر سب و شتم اور دست و بازو کے مظاہرۂ قوت پر ختم ہوتا ہے۔ اسلام اس انداز کلام کو پسند نہیں کرتا وہ سچائی کا منادی ہے اور سچائی کے لئے نہ زور و قوت کی ضرورت ہے نہ جبر و اکراہ کی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسے پیش ایسے انداز میں کیا جائے جو دل میں اتر جائے جس سے اعراض یا انکار کا امکان باقی نہ رہے۔ اور اس کے لئے حکمت و موعظت کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہو سکتا۔ حکمت اور موعظت کا اصول پیش نظر رکھ کر جب بھی دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا جائے گا، اثر انگیز اور نتیجہ خیز ثابت ہو گا۔ اور جب اس اصل الاصل کو نظر انداز کر دیا جائے گا تو جنگ و پیکار اور سب و شتم کے سوا کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے داعی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیشہ اسی اصول کو پیش نظر رکھا۔ اور داعیٔ اسلام کے جانشینوں نے بھی اسی اصول کو اپنا شعار بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام پھیلتا، پھولتا، بڑھتا اور پروان چڑھتا رہا۔

کتب تفسیر میں بھی ان دونوں الفاظ کی معنویت اور اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے چنانچہ زمخشری، قاضی اور بیضاوی وغیرہ نے لفظ حکمت سے مراد لیا ہے "الحکمۃ الفصیحۃ" پھر اس کی مزید تشریح کی ہے۔

وھی الدلیل الموضح للحق المزیح للشبھۃ[1] — یعنی حکمت اس چیز کا نام ہے جو شبہ کے مقابلے میں حق کو واضح کر دیتی ہے۔

---

[1] صفحہ ۲۴۸

اسی طرح "موعظہ حسنہ" کے لئے مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد "القول الرفیق" ہے۔ پھر اس کی تشریح کی ہے۔

ای الذی فیہ الرفق

یعنی وہ بات جس میں رفق و مدارات کا پہلو غالب ہو۔

اب "مجادلہ احسن" کو لیجئے یعنی وہ کون سا مجادلہ ہے جو احسن ہو؟

وجادلهم بالتي هي احسن كالدعاء الى الله بآياته والدعاء الى حججه[1]

کفار و مشرکین سے احسن طور پر مجادلہ کرو یعنی انہیں اللہ کی آیتوں اور نشانیوں اور حجتوں اور دلیلوں کی طرف دعوت دو۔

تفسیر کبیر میں امام رازیؒ نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

المجادلة هي المنازعة لا لاظهار الصواب بل لالزام مخصم لكن المراد ههنا المناظرة والجدل الاحسن ان يكون دليلا مركبا من مقدمات مسلمة في المشهور عند الجمهور او مقدمات مسلمة عند ذلك القائل (الكبير)

مجادلہ اس منازعہ (جھگڑے) کا نام ہے جس کا مقصد اظہار صواب نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ مقابل کو الزامی جواب دے کر خاموش کر دیا جائے۔ لیکن اس جگہ مناظرہ اور جدل احسن سے مراد ایسی دلیل ہے، جو ان مقدمات سے مرکب ہو جو جمہور (عوام) کے نزدیک طے شدہ ہیں۔ نیز ان مقدمات سے مرکب ہو، جو خود قائل کے لئے بھی تسلیم شدہ ہوں۔

صرف تبلیغ نہ کہ جبر و جور

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنے شہر، قوم، خاندان اور گھر کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ خالص نفسیاتی اور دل میں کھب جانے والے انداز میں ایک اللہ کی

---

[1] تفسیر جلالین صفحہ ۲۸۸

بادشاہت کا اعلان کرتے تھے۔ بت پرستی کے معائب اور نقائص بیان فرماتے تھے۔ کفر و شرک کے رذائل کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ ایک ایسا دستورِ حیات پیش فرماتے تھے۔ جو ہر اعتبار سے "فطری" تھا۔

آپ کی تعلیم کیا تھی؟ ——— عقاید میں یہ کہ خدا کو ایک مانا جائے۔ کفر و شرک سے اجتناب کیا جائے۔ رسالتِ محمدی کا اعتراف کیا جائے اور قرآن کو خدا کی آخری کتاب سمجھا جائے ——— اور اعمال میں یہ کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ جوا نہ کھیلو۔ شراب نہ پیو۔ زنا نہ کرو۔ لڑکی کو لڑکی کا، ماں کو ماں کا، بیوی کو بیوی کا، باپ کو باپ کا حق دو۔ امانت میں خیانت نہ کرو۔ یتیموں کے مال و دولت پر حریصانہ نظر نہ ڈالو۔ کسی کا حق نہ مارو۔ سب کے ساتھ رفق و ملاطفت کے ساتھ پیش آؤ ——— یہ اور اسی طرح کے دوسرے اعمال و عقاید تھے۔ جن کی طرف اسلام لوگوں کو بلا رہا تھا۔

لیکن جن کو یہ دعوت دی گئی، وہ کون تھے ———؟

یہ وہ لوگ تھے جو عقائد و اعمال کی ہر گمراہی میں مبتلا تھے!

یہ ایک خدا کے بجائے سینکڑوں ہزاروں خداؤں کو مانتے تھے۔ یہ بتوں کو پوجتے تھے یہ مظاہر کی پرستش کرتے تھے۔ یہ درختوں، دریاؤں، سمندروں، جانوروں کے آگے سر جھکاتے تھے۔ یہ چاند، سورج اور ستاروں کو خالقِ کل اور ربِ اکبر مانتے تھے۔ یہ ہر قوت اور طاقت کے آگے سربسجود ہو جاتے تھے۔ ان کی جبینِ نیاز سب کے سامنے جھک جاتی تھی سوا ایک خدا کے!

اور اعمال میں ان کا کیا رنگ تھا ———؟

یہ دھڑلّے سے شراب پیتے تھے، یہ جوا کھیلتے تھے اور گھر کی آخری پونجی تک نہیں عزت، ناموس اور رفقا تک ہار جاتے تھے۔ یہ اپنی بیویوں اور لڑکیوں کو بھی داؤں پر چڑھا دیتے تھے۔ یہ اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ یہ اپنی سوتیلی ماؤں سے شادی

کر لیتے تھے۔ یہ حق کے لئے نہیں "آن" کے لئے تلوار نکال لیتے تھے اور وہ تلوار اس وقت تک میان میں نہیں جاتی تھی جب تک خون کے دریا نہ بہہ جائیں۔ یہ جب انتقام پر اتر آتے تھے تو اس کا سلسلہ نسلوں اور پشتوں تک جاری رہتا تھا۔ یہ بے گناہوں کا خون کرتے تھے۔ یہ بے تامل اور بے تکلف شریف اور پاکباز عورتوں کو متہم کرتے تھے۔ یہ لڑکی کو لڑکی کا، ماں کو ماں کا اور بیوی کو بیوی کا حق نہیں دیتے تھے، دیتے کیا مانتے بھی نہ تھے۔ یہ ہر حق کے توڑنے میں جری تھے۔ معاہدات کی انکی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔ جو ان کا محبوب اور بہترین مشغلہ تھا۔ زنا کاری سے انہیں اجتناب نہیں شوق تھا۔ یہ بچوں کو قتل کر دیتے، عورتوں کو پکڑ لیتے، مردوں کو ہلاک کر دیتے یہ کسی اصول کے قائل نہیں تھے۔ کسی نظم و ضبط کے خوگر نہیں تھے۔ کسی دستور و نظام کے پابند نہیں تھے۔ ہر وہ بات کر گذرتے تھے جو پسند آجاتی تھی۔ جو یہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ یہ جس مذہب کو مانتے تھے۔ اس کے اصولوں پر بھی عمل ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے بعض مہینوں کے لئے طے کر لیا تھا کہ وہ محترم ہیں۔ اور اس دوران میں جنگ نہیں کریں گے۔ لیکن ضرورت اور مصلحت کا تقاضا دیکھتے تو بے تکلف انہی مہینوں میں تلوار کھینچ لیتے، اور بڑے فخر سے جنگ و پیکار کا سلسلہ شروع کر دیتے۔

ان لوگوں نے جب رسول اللہ کی دعوت حق سنی تو کان کھڑے ہوئے۔ سوچا اگر اسلام کو قبول کر لیتے ہیں تو ساری مشیخت ختم ہو جائے۔ جو گھروندے بنا رکھے ہیں وہ ڈھے جائیں گے جو ڈھکوسلے قائم کر رکھے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔ اونچ نیچ کی جو تفریق قائم کر لی ہے وہ کڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ جائے گی۔ لہٰذا انسنی کی ان سنی کر دی۔ ان کا دل قبول کر لیتا تھا۔ دماغ انکار کر دیتا تھا۔ یہ دل سے بغاوت کرتے تھے اور دماغ کے سامنے سپرانداز ہو جاتے تھے۔ یہ نہ صرف خود اسلام قبول کرنے سے گریز کرتے تھے۔ بلکہ یہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا ان کا ہم قوم یا ہم وطن اسلام قبول کرے۔ جو ایسا کرتا تھا یہ اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ اس کی جان کے گاہک بن جاتے تھے۔ اسے طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دیتے تھے۔ اس

بال بچوں کو ستاتے تھے، اس کے لئے جینا دوبھر کر دیتے تھے۔ ان کی کوشش صرف یہ ہوتی تھی کہ جس نے اسلام قبول کر لیا ہے وہ اس سے منحرف ہو جائے۔

آنحضرتؐ کفار و مشرکین کی یہ دھاندلی دیکھتے تھے، مگر خاموش رہتے تھے۔ وہ جتنے جوش و خروش اور جذبہ و حوصلہ کے ساتھ دعوت پیش کرتے تھے، اس سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کفار اس دعوت کی مزاحمت کرتے تھے۔ وہ شور مچاتے تھے تاکہ آنحضرتؐ کی آواز کم سے کم کانوں تک پہنچ سکے۔ ہنگامہ آرائی کرتے تھے تاکہ کم سے کم لوگ دعوت اسلام سے آشنا ہو سکیں۔ وہ داعی اسلامؐ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وحشیانہ برتاؤ کرتے تھے تاکہ وہ اپنی دعوت سے باز آ جائیں۔

قدرتاً ایک انسان کی حیثیت سے دعوتِ حق کے جواب میں کفار کا یہ طرز و اسلوب دیکھ کر آپؐ دل برداشتہ ہو جاتے تھے۔ آپؐ کے قلب کو تکلیف ہوتی تھی کہ جب حق اس لئے ہے کہ قبول کیا جائے اور سچائی کی غایت یہ ہے کہ وہ حکمرانی کرے۔ تو یہ کیا بات ہے کہ حق کے سننے سے اعراض کیا جاتا ہے اور سچائی کے ماننے سے انکار کر دیا جاتا ہے؟

خدائے بزرگ و برتر اپنے آخری نبی اور رسول کی یہ ذہنی کلفت دیکھتا تھا اور تسلی دیتا تھا کہ مبلّغ کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ نتائج کی طرف نظر رکھے۔ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے فرض کو انجام دیتا رہے۔ وہ صاف الفاظ میں اپنے رسولؐ سے مخاطب ہو کر فرماتا تھا تمہارا کام یہ نہیں ہے کہ دکھ جھیلو، غم اٹھاؤ، پریشان ہو اور دوسروں کے لئے فکر مند ہو۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں، وہ اجر پائیں گے۔ جو نہیں قبول کرتے ان سے خدا سمجھ لے گا۔

چنانچہ سورۂ نحل میں ارشاد فرمایا:۔

فان تولوا فانما علیک البلاغ المبین

اگر یہ لوگ سمجھانے پر بھی منہ موڑ لیں۔ تو اے پیغمبر! تمہارے ذمہ صرف کھلے طور پر پیام کا

پہنچا دینا ہے۔

بلاغ مبین ——————— یعنی ایسی تبلیغ جو واضح ہو، نمایاں ہو، شک و ریب اور شبہات سے بالاتر ہو جس میں پیچ و خم نہ ہو، کجی نہ ہو۔ جو ناقابل فہم اور ناقابل قیاس نہ ہو۔ جو گنجلک نہ ہو جس میں کسی قسم کا اینچ پینچ نہ ہو۔ ایک لفظ "مبین" ان تمام مفہوموں پر حاوی ہے ——— پھر جب تم نے تبلیغ کا فریضہ انجام دے لیا اور تمام شرائط و حدود کے ساتھ اس فرض سے عہدہ برآ ہو لئے یعنی تبلیغ مبین کر لی۔ تو اب تمہیں افسردہ اور ملول ہونے کی ضرورت نہیں نتیجہ خدا کے ہاتھ میں چھوڑ دو۔

ای فلا لوم علیک وھذا تسلیۃ[1] — یعنی اگر وہ لوگ روگرداں ہو جائیں۔ تو اے محمدؐ آپ پر کوئی الزام نہیں ——— ان الفاظ میں گویا آنحضرتؐ کو خدا کی طرف سے تسلی دی گئی ہے کہ وہ پریشان نہ ہوں ٥

لہ صلی اللہ علیہ وسلم ٥

---

[1] صفحہ ۲۲۲ جلالین ۱

دعوت اسلام کے جواب میں

کفار و مشرکین کا اعراض و انکار

جب کوئی نئی دعوت کسی قوم یا ملت کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو اس کی ندرت تدریجاً لوگوں کو قبول کی بجائے رد پر آمادہ کر دیتی ہے۔ پھر اسلام کی دعوت تو اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے بالکل ہی نرالی چیز تھی۔ اس کے قبول کرنے سے صرف سلفی عقائد کا قلعہ ہی منہدم نہیں ہوتا تھا بلکہ اُن مرغوبات سے بھی دستبرداری اختیار کرنا پڑتی تھی، جو قلب و دماغ کے لئے نشاط و مسرت کے موجب تھے۔ ان مشغول کو بھی چھوڑنا پڑتا تھا، جو گوشت اور ناخن کی طرح ناقابلِ انفصال تھے۔ ان تعلقات سے بھی علیحدگی اختیار کرنا پڑتی تھی جن کے استحکام پر زمانے کیسے کیسے عہد و پیمان گواہ تھے۔ اسلام کا قبول کرلینا صرف ایک لفظ کا زبان

سے نکال دینا نہیں تھا۔ ایک بالکل نئی اور جدید زندگی کا اختیار کر لینا تھا اور پرانی زندگی سے بجسر قطع تعلق کر لینا!

دعوت اسلام کا جواب

دعوتِ اسلام کے جواب میں کفار و مشرکین جن اعراض و اغماض کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس سے آپؐ بہت زیادہ دل تنگ اور پریشان ہوتے تھے۔ اگر سونے کی جگہ پیتل اور چاندی کے بدلے تانبا چلنے لگے۔ تو قدرتاً جس کے پاس سونے اور چاندی کا ذخیرہ ہے وہ کڑھے گا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ اپنی آنکھوں سے اپنی قوتِ تمیز سے اپنے ادراک و احساس سے کام کیوں نہیں لیتے؟ چنانچہ رسول اللہؐ پر بھی کفار و مشرکین کا اعراض و اغماض دیکھ کر یہ کیفیت بار بار طاری ہوتی تھی۔ آپ زرِ خالص پیش کرتے تھے لیکن لوگ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور پیتل کی طرف لپکتے تھے۔ یہ رنگ دیکھ کر قلب نبوی پر حد درجہ گراں گزرتا تھا۔ چنانچہ اس کیفیت کے بارے میں قرآن کریم نے کہا (سورہ شوریٰ)

فان اعرضوا فما ارسلنٰک علیھم حفیظا ان علیک الا البلاغ — اگر (سمجھانے پر بھی) یہ لوگ روگردانی کریں۔ تو ہم نے تم کو ان پر داروغہ بنا کر تو بھیجا نہیں۔ تمہارے ذمے تو صرف (حکم الٰہی) کا پہنچا دینا ہے

اس آیت میں وضاحت کے ساتھ یہ حد بندی کر دی گئی کہ دوسروں کے لئے کڑھنے اور رنج اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ فریضۂ تبلیغ خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دے لو اور بس!

"کافروں پر آپ کو داروغہ بنا کر تو نہیں بھیجا گیا ہے" ——— اس کی تفسیر کرتے ہوئے صاوی نے کہا ہے۔

فلا تحزن اولا عتاب علیک[1] — یعنی آپؐ رنجیدہ نہ ہوں۔ یا دوسرے الفاظ میں

---

[1] صفحہ ۴۰۵

کفار کے اعراض سے آپ پر عتاب الٰہی نازل نہیں ہوگا۔

سورۂ عنکبوت میں بھی یہی بات ارشاد ہوئی

وما علی الرسول الا البلاغ المبین۔ — رسول کے ذمہ تو خدا کا حکم، صاف طور پر پہنچا دینا ہے اور بس۔

لوگ (کفار و مشرکین) اس بلاغ کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؛ اس سے آپ کو کوئی سروکار نہیں۔

عتاب وحساب

سورۂ رعد میں فرمایا

وان ما نرینك بعض الذی نعدھم او نتوفینك فانما علیك البلاغ وعلینا الحساب ۝

(اے پیغمبر عتاب کے) جو جو وعدے ہم ان سے کرتے ہیں چاہے بعض وعدے ہم تم کو دکھا دیں اور چاہے دکھلانے سے پہلے ہم تم کو دنیا سے اٹھا لیں۔ بہرحال تبلیغ تمہارا کام ہے اور حساب لینا ہمارا کام۔

اس آیت کی تفسیر یہ ہے

خواہ یہ کفار اپنے انکار کا جواب آپ کی زندگی میں دیکھیں یا آپ کی وفات کے بعد ——— بہرحال

وانما علیك البلاغ لاعلیك الا التبلیغ وعلینا الحساب اذا صاروا الینا فنجازیھم[1]

آپ کی ذمہ داری تبلیغ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم ان کے حساب کے ذمہ دار ہیں۔ جب وہ ہمارے پاس آئیں گے تو ہم انہیں پوری پوری جزا دیں گے

---

[1] صفحہ ۲۰۵ (جلالین)

ان آیات میں خدا نے رسولؐ اللہ سے فرمایا ہے کہ تم زندہ رہو یا نہ رہو — کیونکہ موت بہرحال انسان کو آنی ہے — کفار کے عدوان و طغیان کے بار میں ہم ان کے خلاف عتاب و عقاب کا فوری فیصلہ کریں یا نہ کریں۔ یہ ہمارا کام ہے اور یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ ہمیں کون سا کام کرنا چاہیئے اور کون سا نہیں؟ اور جس کام کو کرنا چاہیئے اس کے صدور اور وقوع کے لئے کون سا وقت منتخب کیا جائے، بہرحال ہر شخص کے اعمال کا ہم محاسبہ کریں گے۔ جو کھرا ثابت ہوگا وہ بچ جائے گا جو کھوٹا ثابت ہوگا اسے سزا ملے گی۔ لہٰذا تم بغیر کسی فکر کے اپنا فریضۂ تبلیغ انجام دیتے رہو۔ اور اس بات پر ذرا بھی رنج نہ کرو کہ تمہاری دعوت مسموع ہوتی ہے یا نہیں؛

اطاعت اور بلاغ

جو لوگ یہ سمجھ لیں کہ اسلام دین حق ہے، جو اسے مان لیں کہ قرآن خدا کا آخری کلام ہے۔ جو اسے تسلیم کرلیں کہ محمدؐ خدا کے آخری نبی ہیں۔ ان کا فریضہ یہ ہے کہ بے چون و چرا احکام خدا اور رسول کی اطاعت کریں۔ جو خدا کہے اسے مانیں۔ جو رسولؐ بتائے اس کے آگے گردن جھکا دیں۔ لیکن جو لوگ اسلام کو قبول کرنے سے انکار کردیں خدا کی خدائی اور رسولؐ کی رسالت تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ تو ہم ان سے سمجھ لیں گے۔ ہمارے رسول اور پیامبر کا کام بس اتنا ہی ہے کہ وہ پوری صفائی اور سچائی کے ساتھ بندوں تک ہمارا پیام پہنچا دے یہاں سے اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سورۂ تغابن میں ارشاد فرمایا

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول فان تولیتم فانما علیٰ رسولنا البلاغ المبین

خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اگر تم روگردانی کرو تو ہمارے رسولؐ کے ذمہ صاف طور پر ہمارے احکام کا پہنچا دینا اور بس!

یعنی اگر یہ لوگ اسلام سے منہ موڑ لیں

فلا ضرر ولا باس علی رسولنا[1]

تو نہ ہمارے رسول کو کوئی نقصان پہنچے گا نہ اس کا کوئی حرج ہو گا۔

اہل کتاب سے خطاب

اہلِ کتاب اور مشرکین کو بھی قرآن نے مخاطب قرار دیا چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا۔

قل للذین اوتوا الکتاب والامیین ءاسلمتم فان اسلموا فقد اھتدوا وان تولوا فانما علیک البلاغ واللہ بصیر بالعباد ہ

اہل کتاب اور ناواقفوں سے کہہ دو کہ تم بھی اسلام لاتے ہو یا نہیں؟ پس اگر اسلام لے آئیں تو بے شک راہ راست پر آ گئے۔ اور اگر منہ موڑ لیں۔ تو تم پر صرف (حکم الٰہی) کا پہنچا دینا ہے

گویا سارا زور تبلیغ ہی پر ہے۔ نہ کہ اس کے اثرات و نتائج پر۔ یہ خطاب یہود، نصاریٰ اور مشرکین عرب سے ہے[2]۔

مزید وضاحت!

سورۂ نور میں ان لوگوں کو مخاطب کیا جن تک رسول اللہ نے دعوت پہنچائی تھی، فرمایا

قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولوا فانما علیہ ما حمل وعلیکم ما حملتم وان تطیعوہ تھتدوا وما علی الرسول الا البلاغ المبین ہ

(ان سے) کہو کہ خدا اور رسول کا حکم مانو، لیکن اگر تم روگردانی کروگے تو جو ذمہ داری رسولؐ پر ہے اس کے جوابدہ وہ ہیں اور جو ذمہ داری تم پر ہے اس کے جوابدہ تم ہو اور اگر رسولؐ کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤ گے اور رسولؐ کے ذمہ تو صرف (حکم خدا کا) پہنچا دینا ہے۔

---

[1] صفحہ ۷۶۲ جلالین، [2] صفحہ ۸۴ جلالین،

قرآن مجید میں اس طرح کی متعدد آیات ملیں گی جن میں آنحضرتؐ کو تسکین
گئی ہے کہ وہ ردِّ دعوت پر ملول و افسردہ نہ ہوں۔ نتائج کو خدا کے ہاتھ میں چھو
اور اپنے فریضہ کی طرف متوجہ رہیں۔ ان آیتوں میں خواہ یہ مکّی ہوں یا مدنی یعنی
اس دور میں نازل ہوئی ہوں جب ہجوم کفار کے مقابلہ میں آپؐ بالکل یکہ و تنہا
یا اس زمانہ میں جب آپؐ مدینہ منورہ پہنچ چکے تھے اور پروانہ وار مسلمان آپؐ
جان نثار کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ اور تیار تھے۔ ہر دور میں یہی تلقین کی گئی
کہ تم (اے محمدؐ) اپنا دھیان صرف تبلیغ کی طرف رکھو۔ اس کی فکر نہ کرو کہ دعوت
جاتی ہے یا نہیں؟ کسی موقعہ پر بھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جو لوگ دعوت اسلام کے
سے انکار کر دیں یا ماننے سے گریز کریں۔ ان پر سختی کرو، ان پر جبر کرو، انہیں مجبور کرو کہ
تمہاری دعوت قبول کر لیں اور تمہارا پیام گوش ہوش سے سنیں ؛

تذکیر اور عذاب اکبر

سورۂ غاشیہ میں آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا

فذکر انما انت مذکر ۝ لست
علیھم بمصیطر ۝ الا من تولی وکفر ۝
فیعذبہ اللہ العذاب الاکبر ۝

(اے پیغمبر تم لوگوں کو) سمجھاؤ۔ اور تم
سمجھا دینے والے ہو۔ تم ان پر داروغہ ن
تو مسلط ہو، نہیں۔ ہاں جو روگردانی کر
انکار کرے تو خدا اس کو بڑا عذاب دے گا۔

اس آیت مبارکہ میں تین باتیں علی الخصوص فکر و تامل کی مستحق ہیں

۱۔ آنحضرتؐ سے فرمایا کہ لست علیھم بمصیطر ــــــــ یعنی تم
کافروں اور مشرکوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔ اگر یہ تمہاری باتیں نہیں
اسلام نہیں قبول کرتے، حق کے ماننے سے انکار کرتے ہیں تو کرنے دو۔ تم نے تبلیغ کر
اور اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو گئے تمہیں ملول اور افسردہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں

صرف اپنے اعمال و افعال اور خیالات و عقاید کے ذمہ دار ہو نہ کہ دوسروں کے۔ تم راہ راست پر قائم رہو۔ دوسرے راہ راست اختیار کرتے ہیں یا نہیں۔ اس سے تمہیں قطعاً کوئی سروکار نہیں۔

۲۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا۔ کہ جو لوگ اسلام کی دعوت قبول نہیں کرتے وہ حق، صداقت اور سچائی کو ٹھکراتے ہیں۔ اور اس طرح ایک بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ گناہ کی سنگینی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایسے منکروں کے لئے فرمایا ——— فیعذبه الله العذاب الاکبر ان الفاظ کی تہدید میں کتنا زور ہے یعنی خدا ان منکروں کو عذاب اکبر میں مبتلا کر دے گا۔ جس گناہ کی سزا صرف عذاب نہیں بلکہ عذاب اکبر ہو۔ اس کی سنگینی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ گویا رسول کو اور اس کے ذریعے ساری دنیا کو یہ بھی بتا دیا کہ یہ دعوت کتنی زبردست اہمیت کی حامل ہے؟

اتنی عظیم و جلیل دعوت جس سے جحود و انکار "عذاب اکبر" کا موجب ہو۔ پھر بھی وہ سنگین اور تلوار کے بجائے "تذکیر" ہی اپنے جلو میں ساتھ لاتی ہے ——— تذکیر یعنی یاددہانی! اس سے زیادہ کچھ نہیں! نہ قوت، نہ طاقت، نہ جور نہ جبر! بلکہ جس شدت کے ساتھ عذاب اکبر کی وعید سنائی۔ اسی زور کے ساتھ رسول کو یہ بھی بتا دیا "انما انت مذکر" یعنی تم صرف تذکیر کرنے والے ہو۔ یاددہانی کرنے والے۔ پیغام پہنچا دینے والے ہو "فذکر" اپنا کام کرتے رہو۔ پیغام پہنچاتے رہو۔ یہاں تمہارا کام ختم ہو جاتا ہے۔

"مصیطر" یعنی داروغہ کی تشریح مفسرین کے الفاظ میں یہ ہے۔

لستَ علیھم بمصیطر[1] مصیطر کے معنی ہیں اس شخص کے جو مسلط

---

[1] صفحہ ۸۰۴ (جلالین)

من المسطر بمعنى التسلط يقال سطر علیہ ای تسلط[1]

ہوجائے اور کفار کو ایمان قبول کرنے پر مجبور کر
سطر کے معنی تسلط کے ہیں چنانچہ عربی میں کہ
میں "سطر علیہ" یعنی اس پر مسلط ہوگیا

عذاب اکبر کے بارے میں مفسرین کا خیال ہے۔ عذاب آخرت مراد ہے اسکے مقابل
عذاب اصغر وہ سمجھا جاتا ہے۔ جو دنیا سے متعلق ہو۔ مثلاً قتل گرفتاری سزایابی وغ

یاوہ گوئی اور درشت کلامی

دعوتِ اسلام کے جواب میں کفار بڑی یاوہ گوئی اور درشت کلامی کا مظاہر
کرتے تھے۔ ان کے الفاظ جو سراسر سرکشی، تمرد، شرارت اور بدنفسی پر مبنی ہوتے تھے
آنحضرت کو آپ کے دل پر اثر انداز ہوتے تھے یہ کافر اور مشرک اسلام کی تعلیمات
خلاف، خدا کے خلاف، اسلام کے اصول اور دستور کے خلاف طرح طرح کی یاوہ گوئیا
کرتے تھے۔ آپ سنتے تھے اور خاموش رہتے تھے لیکن دل پر تو ان کا اثر پڑتا ہی تھا
لاکھ ضبط کرنے پر بھی ذہن و دماغ میں یہ سوال بہر حال پیدا ہوتا تھا۔ کہ آخر ان کی بدز
بدکلامی پر خدا کی طرف سے ڈھیل کیوں مل رہی ہے؟ چنانچہ سورۂ ق میں ارشاد ہوا

نحن اعلم بما یقولون وما انت علیهم بجبار فذکر بالقرآن من یخاف وعید ہ

یہ (منکر) جو کچھ کہتے ہیں ہم جانتے
ان پر (حاکم) جابر نہیں ہو۔ جو شخص ہا
سے ڈرتا ہے۔ اس کو قرآن سنا کر سمجھاتے

"جبار" کی تفسیر کرتے ہوئے صاوی نے لکھا ہے۔

وما انت علیهم بجبار تجبرهم علی الایمان من الاجبار رو الجبر

اے محمد آپ کافروں پر جبار
گئے ہیں کہ انہیں ایمان لانے پر مجبور کر

---

[1] (صفحہ ۸۹ جلالین)

بدکلامی کا جواب

سورۂ جن میں اور زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیامِ اسلام اس کی حقیقت اور نتائج و عواقب پر گفتگو کی۔ صاف اور کھلے الفاظ میں کفار منکرین و مشرکین کو بتایا کہ ہم میں سے ہر شخص خود ہی اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو خود ہی اپنے افکار و تصورات، عقاید و خیالات اور نظریات کو ٹٹولنا چاہیئے کہ ان میں اور حقیقت میں کہاں تک مطابقت اور ہم آہنگی ہے؟ میرا کام یہ ہے کہ میں خدا کو پوجوں، اس کا پیام ان لوگوں تک پہنچا دوں جو حقیقتِ حال سے ناواقف ہیں۔ اور پھر بھی جو لوگ نہیں مانتے نہیں سنتے نہیں دیکھتے انہیں یہ بھی بتادوں کہ منکروں کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے۔ گو میں ان پر جبر و جور نہیں کر سکتا۔ لیکن خدا کی گرفت سے وہ بہر حال نہیں بچ سکیں گے

چنانچہ سورۂ جن میں ارشاد ہوا

قل انما ادعوا ربی ولا اشرك
به احدا قل انی لا املك لكم
ضرا ولا رشدا قل انی لن یجیرنی من
الله احد ولن اجد من دونه ملتحدا
الا بلاغا من الله و رسلته و من
یعص الله و رسوله فان له نار
جهنم خالدین فیها ابدا ہ

(اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہہ دو۔ کہ میں تو صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہوں۔ اور کسی کو اس کا شریک نہیں کرتا (ان سے) کہو کہ تمہارا نقصان یا فائدہ میرے اختیار میں نہیں (ان سے) کہو کہ خدا (کے غضب) سے کوئی بھی پناہ نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس کے سوا کہیں مجھ کو ٹھکانہ مل سکتا ہے۔ میرا بچاؤ تو اس میں ہے۔ کہ خدا کے حکم اور اس کے پیغام پہنچا دوں۔ جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا۔ اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

الابلاغا کی تفسیر کرتے ہوئے صاوی نے لکھا ہے۔

ای لا املک لکم الا البلاغ الیکم یعنی تمہارے اوپر اس سے زیادہ میرا کوئی اور اختیار نہیں ہے کہ پیام الٰہی تم تک پہنچادوں۔

مدارک میں اس کی تفسیر یوں آئی ہے۔

ای ان لم ابلغ لم اجد من یعنی اگر میں خدا کا پیام تم تک نہ پہنچاؤں تو

دونہ ملتحدا ولا مجیرا لی پھر اس سے مجھے پناہ دینے والا کون ہوگا؟

یعنی میری تبلیغ کی بنیاد خود اپنا تحفظ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں:

مشرکین کے ایرادات

آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے اسلام کا پیام سن کر کفار ومشرکین عجیب عجیب قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ طعن، تشنیع، تعریض، انکار، جحود، طغیان، سرکشی سب کچھ، وہ صرف یہی نہیں کرتے تھے کہ اسلام کے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہوں۔ وہ دل دکھانے والے الفاظ بھی استعمال کرتے تھے۔ وہ دل شکن الفاظ میں دعوتِ حق کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ ان سب باتوں کو سنتے تھے اور دعوتِ حق کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔

یہ کفار اگرچہ جاہل اور ناخواندہ تھے۔ لیکن اعتراض کرنے میں جہالت کے باوجود زیادہ سے زیادہ ذہانت کا ثبوت دیتے تھے۔ یہ آنحضرتؐ سے پوچھا کرتے تھے۔ جب خدا خالقِ کائنات ہے۔ اس کے اشارے پر یہ سارا نظامِ کائنات چلتا ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ پھر وہ چاہے تو دلوں کو بھی بدل سکتا ہے۔ تصورات اور معتقدات میں بھی انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ وہ کیا نہیں کر سکتا۔ پھر وہ آپ کو زحمتِ تبلیغ و تذکیر کیوں دیتا ہے کہ کوئی مانتا ہے اور کوئی نہیں مانتا۔ کوئی سنتا ہے اور کوئی سننے سے انکار کر دیتا ہے سیدھا اور صاف راستہ یہ ہے کہ خود خدا ہمارے دل بدل دے۔ ہماری زبانِ انکار، اقرار

سے آشنا ہو جائے گی، ہمارا شرک توحید سے بدل جائے گا۔ ہمارا عجز و طغیان، اطاعت و انقیاد کا لباس پہن لے گا۔ پھر نہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف و اذیت سے دو چار ہونا پڑے گا نہ ہمیں، ساری دنیا موحد بن جائے گی، کائنات کا گوشہ گوشہ پیامِ اسلام سے آشنا ہو جائے گا۔ اس کرۂ ارض کا ہر باشندہ دینِ حق قبول کر لے گا۔ اور اگر خدا ایسا نہیں کرتا تو اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ خود اس کی مرضی یہی ہے کہ ہم کفر پہ جمے رہیں۔

ان باتوں میں کتنا گہرا طنز تھا؟ کتنا کھلا ہوا انکار تھا؟ کتنے استقلال و استحکام کے ساتھ راہِ ضلالت پر استوار رہنے کا عزم تھا؟ یعنی آپ لاکھ دعوت و تذکیر کا سلسلہ جاری رکھیں ہم تو اپنے مسلک و مذہب پر قائم رہیں گے۔

چنانچہ سورۂ نحل میں خدا نے کفار و مشرکین کے ان الفاظ کو نقل کر کے جو وہ دعوتِ اسلام کے جواب میں از راہ طنز و توہین استعمال کیا کرتے تھے۔ آخری جواب دے دیا ہے۔

وقال الذین اشرکوا لوشاء الله ماعبدنا من دونه من شیء ولا اٰباؤنا ولا حرمنا من دونه من شیء کذٰلک فعل الذین من قبلهم فهل علی الرسل الا البلاغ المبین ۝

مشرکین کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی اور چیز کی پرستش کرتے اور نہ ہمارے بڑے ہی۔ اور نہ ہم اس کے حکم کے بدون کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ ایسا ہی ان سے پہلوں نے کیا تو پھر اب رسولؑ پر سوا اس کے کیا ذمہ داری ہے کہ وہ تبلیغ کا فریضہ واضح طور پر سر انجام دے لیں۔

"بلاغ مبین" کی تفسیر میں مہائمی نے کہا ہے۔

الابلاغ المبین ولیس علیهم هدایة

یعنی پیغمبروں کی ذمہ داری صرف تبلیغ ہے۔ ہدایت نہیں!

مشرک امن کی جگہ پہنچا دیا جائے

کوئی مشرک مسلمانوں میں اگر کسی طرح پہنچ جائے تو اس کے ساتھ اسلام نے حسن سلوک کی بلند ترین تعلیم دی ہے

مذہب اور عقیدہ کا اختلاف بہت قدیم ہے اور جتنا یہ قدیم ہے اتنا ہی مہلک اور جانسوز بھی ہے۔ ہر گناہ معاف کیا جا سکتا ہے۔ ہر خطا بخش دی جا سکتی ہے۔ ہر غلطی سے صرف نظر کر لیا جا سکتا ہے لیکن کبھی اور کسی حالت میں اس شخص کو معاف نہیں کیا جا سکتا جو مذہبی اختلاف رکھتا ہو اور اگر معاف بھی کر دیا جائے تو بھی اس کے ساتھ رواداری، حسن سلوک اور وسعت قلب کا مظاہرہ تو ہرگز نہیں کیا جا سکتا، اسے پناہ نہیں دی جا سکتی اس کی رہنمائی نہیں کی جا سکتی، اس کے ساتھ نیکی اور مساہمت کا برتاؤ نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اسلام جس طرح اپنی تمام چیزوں میں منفرد اور یگانہ ہے۔ اسی طرح اس معاملہ میں بھی اس کا مسلک دوسرے ادیان سے جدا ہے۔ وہ صاف الفاظ میں حکم دیتا ہے۔ کہ اگر کوئی مشرک ——— یعنی وہ شخص جو ایک خدا کو نہیں مانتا۔ بلکہ بہت سے دیوتاؤں دیویوں اور معبودوں کو پوجتا ہے ——— تم سے ——— جس اور مجبور ہو کر ——— جان کی امان طلب کرے تو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اسے پناہ دو، اس کے کانوں تک اپنی دعوت اور پیام پہنچاؤ، اور پھر بحفاظت تمام اسے کسی امن اور عافیت کی جگہ پہنچا دو ——— اس سے بڑھ کر ایک غیر مذہب کا اور ایک غیر مذہب کے پرستار کے جذبات کا احترام کیا ہو سکتا ہے؟

چنانچہ سورۂ توبہ میں فرمایا

ان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللّٰہ ثم ابلغہ مأمنہ ذلک بانھم قوم لا یعلمون ۵

اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ اطمینان سے کلام خدا کو سن لے۔ پھر اس کو اس کے امن کی

جگہ (اپس پہنچا دو۔ یہ (سلوک) اس لئے (کرنا
ضروری) ہے کہ یہ (مشرک) نادان لوگ ہیں

کافر کو اس کے مقام امن تک پہنچا دینے کا جو ذکر قرآن میں آیا ہے۔ اس کی تفسیر
کرتے ہوئے صاوی نے کہا

ابلغه مامنه ای ان اراد
الانصراف ولم یسلم وصله الی قومه
لیتدبر فی امره

کافر کو اس کے مقام امن تک پہنچا دو۔ یعنی
اگر وہ بات اسلام سننے کے بعد وہ واپس جانا چاہے
اور اسلام نہ قبول کرے تو اسے اس کی قوم تک
حفاظت سے پہنچا دو تاکہ (بعد میں) وہ اطمینان
کے ساتھ خالی الذہن ہو کر معاملہ پر غور کر سکے۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے۔ کہ یہ "پناہ طلب کرنے والا کافر" وہ ہے جو

استامنك من القتل — تم سے جان بخشی چاہ رہا ہو!

یعنی جس کی زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہو

اس آیۂ کریمہ سے جو نتائج و ہدایات علامہ جصاص نے پیدا کئے ہیں۔ ان کا ذکر
اس جگہ ضروری ہے۔ فرماتے ہیں۔

قد اقتضت هذه الآية
جواز امان الحربي اذا طلب ذلك
منا ليسمع دلالة صحة الاسلام
لان قوله تعالى وان استجارك معناه
استأمنك وقوله تعالى فاجره
معناه فامنه حتى يسمع كلام
الله الذي فيه الدلالة على صحة

اس آیت کا اقتضا یہ ہے۔ کہ حربی
جب ہم سے امان طلب کرے۔ تو اسے امان
دے دینا جائز ہے۔ تاکہ وہ اسلام کی
صحت اور صداقت کے دلائل سن سکے۔ کیونکہ
اللہ کا قول (استجارک۔ اگر تم سے پناہ کا
خواستگار ہو) یہ معنی رکھتا ہے۔ کہ اگر وہ تم
سے طالب امن ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول

التوحيد وعلى صحة نبوة النبي صلى
الله عليه وسلم هذا يدل على ان
الكافر اذا طلب منا اقامة الحجة
وبيان توحيد الله وصحة نبوة النبي
صلى الله عليه وسلم وانه غير جائز
لنا قتله اذا طلب ذلك منا الا بعد
بيان الدلالة واقامة الحجة لان
الله قد امرنا باعطائه الامان حتى
يسمع كلام الله وفيه الدلالة
ايضا على ان علينا تعليم كل من
التمس منا تعريفه شيئا من امور الدين
لان الكافر الذى استجارنا يسمع
كلام الله انما قصد التماس معرفة
صحة الدين وقوله تعالى ثم ابلغه
مامنه يدل على ان على الامام
حفظ هذا الحربي المستجير ومنع
الناس من تناوله بشر لقوله
واجره وقوله ثم ابلغه الى مامنه
فى هذا دليل ايضا على ان على الامام
حفظ اهل الذمة والمنع
من اذيتهم والتخطي الى

پس اسے پناہ دو: یہ معنی رکھتا ہے کہ
اسے امن دے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام
سن لے۔ جس میں صحت توحید کے دلائل
ہیں اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی صحت
نبوت کی دلیلیں ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت
ہوتی ہے کہ اگر کوئی کافر اللہ کے بیان توحید اور
نبی ص کی صحت نبوت کے بارے میں اقامت
دلیل و برہان کا مطالبہ کرے۔ تو ہمارے لیے
اس کا قتل کر دینا ناجائز ہے۔ جبکہ اس
سلسلہ میں وہ ہم سے طالب امن ہو۔ سوا
اس صورت کے کہ ہم دلیلیں بیان کر چکیں۔
اور حجت قائم کر لیں۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ
نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اسے امان دیں۔
یہاں تک کہ وہ کلام الٰہی سن لے۔ اور اس
سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے۔ کہ اگر
کوئی ہم سے امور دین کی تعریف و تبیین چاہے
تو ہم اسے تعلیم دیں۔ اس لئے کہ وہ کافر
ہمارے پاس اس لئے پناہ گزین ہوا ہے کہ
صحت دین کی معرفت حاصل کرے۔ اور
اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "پھر اسے (کافر یا
مشرک کو) اس کے امن میں پہنچا دو" دلیل

ظلمهم۔ [1]

ہے۔ اس بات کی کہ مستجیر حربی کی حفاظت
...... امام وقت پر واجب ہے۔ اور
لوگوں کو اسے گزند نہ پہنچانے سے روکنا فرض
ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اسے امان
دو" اور خدا کے اس قول سے کہ اسے اس کے
امن تک پہنچا دو۔ یہ دلیل بھی نکلتی ہے۔ کہ امام
وقت کا یہ فرض ہے کہ وہ اہل ذمہ کا فرد
مشرک کے جان و مال کی حفاظت کرے۔
انہیں کسی طرح کی اذیت اور تکلیف نہ پہنچنے دے
اور انہیں ہر طرح کے ظلم و جور سے بچائے

غور کیجئے۔ یہ سورۂ توبہ کے الفاظ ہیں۔ یہ سورۂ مدنی ہے۔ یعنی مدینہ منورہ میں آنحضرتؐ پر نازل ہوئی ہے۔ یعنی اس کے نزول کا زمانہ وہ ہے جب اسلام جڑ پکڑ چکا تھا۔ مسلمان طاقت اور شوکت حاصل کر چکے تھے۔ بے بسی اور بے کسی کا یعنی مکی زندگی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اس دور میں بھی رواداری پوری شان جمال کے ساتھ اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔ کہیں سے بھی رحم، رعایت اور مروت کے بجائے جبر، جور اور زیادتی کی حوصلہ افزائی کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ غور فرمائیے نہ صرف یہ کہ ردِّ دعوت پر کسی قسم کے انقباض اور برہمی کا اظہار نہیں فرمایا گیا ہے۔ بلکہ اسے "ناواقفیت" سے تعبیر کیا گیا ہے ——— انهم لا يعلمون ——— اس سے بڑھ کر کوئی مثال اس آسمان کے نیچے آج تک رواداری، حسن سلوک اور چشم پوشی کی مل سکتی ہے؟

---

[1] احکام القرآن مطبوعہ مصر (از علامہ جصاص رحمۃ اللہ علیہ) ج ۳۔ صفحہ ۱۰۳-۱۰۴

اظہار و اخفاء

سورہ مائدہ میں —— یہ سورہ بھی مدنی ہے —— کفار و مشرکین کی خفیہ اور علانیہ گھاتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدائے بزرگ و برتر نے فرمایا۔

ما على الرسول الا البلاغ والله	پیغمبر صرف (ہمارے حکم) پہنچا دینے کا ذمہ دار
يعلم ما تبدون وما تكتمون	ہے (اور اے کافرو، مشرکو!) اللہ تمہاری کھلی
	چھپی (سب باتوں) کو جانتا ہے۔

یعنی تم یہ نہ سمجھو کہ تم ظاہر طور اور ڈھکے چھپے جو کچھ کہتے اور کرتے ہو۔ وہ صرف تم ہی تک محدود ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے بنی نوع تمہاری باتوں کی سن گن نہ پا سکیں۔ تمہاری گھاتوں کی تہ تک نہ پہنچ سکیں۔ لیکن تم خدا سے تو اپنی کوئی چیز نہیں چھپا سکتے۔ اس کی نظر سے نہ تمہارا خیال چھپ سکتا ہے نہ عمل۔ رسولؐ تو صرف اتنا ہی کرے گا۔ کہ ہمارا پیام پہنچا کر فارغ ہو جائے گا۔ باقی رہے تمہارے مکنونات اور مکتومات۔ سو ان کے بارے میں یاد رکھو کہ ہم انہیں خوب جانتے ہیں!

نہ ماننے کی اجازت

قرآن میں کہیں بھی کوئی اشارہ اس امر کا نہیں مل سکتا کہ جو شخص یا جماعت دعوت اسلام کا جواب انکار کی صورت میں دے اس کے ساتھ کسی قسم کی بھی زیادتی روا رکھی جائے۔ قرآن جتنا جتنا اپنی دعوت کی حقانیت اور صداقت پر زور دیتا ہے، اتنا ہی زور وہ اس امر پر بھی دیتا ہے۔ کہ اس پیام حق کو سننے کے بعد جو تمہارا ضمیر کہے جو تمہاری رائے ہو اسی پر عمل کرو۔ اگر بات دل میں اتر جائے تو مان لو۔ نہ اترے تو نہ مانو۔ مان لوگے تو دین و دنیا دونوں جگہ فلاح و نجاح کے دروازے تم پر کھل جائیں گے نہیں مانوگے تو عذاب و عتاب کے سزاوار ٹھہرو گے۔ لیکن یہ عذاب و عتاب جو کچھ بھی ہوگا اور جس درجہ میں بھی ہوگا۔ وہ صرف خدا کی طرف سے ہوگا۔ رسولؐ کی طرف سے، مسلمانوں کی طرف سے

مسلم حکومت، معاشرے اور سوسائٹی کی طرف سے نہیں —— اس لئے کہ اسلام اس کا قطعاً قائل نہیں ہے کہ گوشمالی کر کے کسی کو راہ ہدایت دکھائی جائے۔ چنانچہ سورہ کہف میں ارشاد ہوا

قل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر

(ان سے) کہو کہ حق خدا کی طرف سے ہے جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔

سورہ زمر کی تشریح و وضاحت اور زیادہ نمایاں ہے

قل اللہ اعبد مخلصاً له دینی فاعبدوا ما شئتم من دونه

(ان سے) کہو کہ میں تو خدا ہی کی فرمانبرداری مدنظر رکھ کر اس کی عبادت کرتا ہوں۔ تم اس کے سوا جس کو چاہو پوجو۔

بصائر و نظائر

خدا نے انسان کو پیدا کیا، اسے بصارت بھی عطا کی اور بصیرت بھی، چشم ظاہر بھی اور چشم باطن بھی، ساتھ ہی ساتھ اسے فکر و شعور کی نعمت سے مالا مال کیا۔ اسے یہ صلاحیت دی کہ وہ اندھیرے اجالے میں تمیز کر سکے، نیکی بدی کو پہچان سکے حق اور باطل کو پرکھ سکے اس کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے کتابیں بھیجیں پیغمبر بھیجے۔ بھلائیوں سے رغبت کا اور برائیوں سے استکراہ و انقباض کا ملکہ پیدا کیا۔ پھر بھی اگر وہ دل کی آنکھیں بند رکھتا ہے، بصیرت سے کام نہیں لیتا چشم باطن کو معطل کر دیتا ہے۔ تو اس کی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں۔ خود اسی شخص پر ہے۔ کہ وہ ماحول اور دوسرے عوامل سے اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ حق کو چھوڑ دیتا اور باطل کو اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

قد جاءکم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسه ومن عمی فعلیها

لوگو، تمہارے خدا کی طرف سے دل کی آنکھیں تو تمہارے پاس آچکی ہیں۔ پھر (اب،

وما انا علیکم بحفیظ ۰ جو دیکھتا ہے تو اس کا نفع اس کی ذات کے لئے ہے۔ اور جو اندھا ہو جاتا ہے تو اس کا وبال اسی کی جان پر ہے۔ اور میں کچھ تم لوگوں کا کچھ محافظ تو ہوں نہیں!

"وما انا علیکم بحفیظ" کی تفسیر مفسرین نے یوں کی ہے۔

رقیب لاعمالکم انما انا نذیر — یعنی اے لوگو! میں تمہارے اعمال کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں۔ میں تو صرف نذیر ہوں یعنی خدا کے غضب سے تمہیں ڈرانے والا ہوں خواہ ڈرو یا نہ ڈرو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہ ساری دنیا مسلمان کیوں نہیں ہو جاتی؟ خدا کے قبضہ و اختیار میں سب کچھ ہے

وہ جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب

پھر وہ کیوں نہیں چاہتا۔ کہ یہ کفر و شرک کا امتیاز ختم ہو جائے؟ اور ساری دنیا خدا کی یکتائی کے سامنے سر جھکا دے؟ یہ خیال ہر انسان کے دل میں آتا ہے، اور آ سکتا ہے۔ وہ سوچتا ہے میری دعوت حق ہے مگر وہ مقبول نہیں ہوتی۔ لوگ ناحق اور ناراستی کی طرف بے تکلفی اور شوق و ذوق کے ساتھ لپکتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ خدا لوگوں کے دل بدل دے۔ ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا کر دے کہ وہ کفر و شرک کی طرف راغب نہ ہوں اور حق و صداقت کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں؟

لیکن یہ کارگاہ عالم اپنا ایک مستقل نظام رکھتا ہے۔ یہاں ہر چیز صرف اس لئے نہیں واقع ہو جاتی۔ کہ اسے واقع ہونا چاہیئے۔ ہر چیز کے وقوع و صدور کے لئے کچھ خاص شروط و حدود ہیں۔ اس دنیا میں جس طرح روشنی ضروری ہے تاریکی بھی اپنی ضرورت کا ثبوت رکھتی ہے

فرشتوں کے گروہ میں ابلیس، انسان کی صفوں میں فرعون، شداد، ہامان، ابوجہل ——— !

بظاہر یہ کتنی تعجب خیز بات ہے، کہاں فرشتوں کا گروہ اور کہاں ابلیس، کہاں اشرف المخلوقات انسان اور کہاں نمرود و ابوجہل۔ کہاں خلق محمدؐ اور کہاں کفار و مشرکین مکہ کی دریدہ دہنی۔ لیکن اس دنیا میں کسی امر کا وقوع و صدور، صرف تقدس اور صداقت کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ کچھ دوسرے عوامل اور محرکات بھی ہوتے ہیں۔ اور وہ اثرات بہرحال بروئے کار آکر رہتے ہیں۔ لہٰذا باطل کے وجود، طغیان کے وقوع، تمرد کے صدور اور حق سے اعراض و انکار کے اظہار پر دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ نتائج سے بے پروا ہو کر زیادہ شدت کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہنے کی ضرورت ہے۔ کفار و مشرکین کی روش پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دل گرفتگی کے بارے میں قرآن نے یہی کہا ہے۔ چنانچہ سورۂ انعام میں ارشاد ہوا،

ولو شاء الله ما اشركوا	اگر خدا چاہتا تو یہ شرک نہ کرتے۔ ہم نے
وما جعلناك عليهم حفيظا ۔ وما	تم کو ان پر کوئی محافظ (مقرر) نہیں کیا اور نہ تم
انت عليهم بوكيل ○	ان کے وکیل ہو (کہ انہیں بھٹکنے نہ دو)

اس مفہوم کو اور زیادہ کھول کر سورۂ یونس میں خدا تعالیٰ نے فرمایا

ولو شاء ربك لآمن في الارض	اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو دنیا کے تمام
كلهم جميعا افانت تكره الناس	آدمی سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو کیا
حتى يكونوا مؤمنين ○	تم لوگوں کو مجبور کر سکتے ہو کہ وہ (سب کے سب)
	ایمان لے آئیں؟

اس کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین نے کہا ہے

افانت تكره الناس ما	کیا تم خدا کی مرضی کے خلاف لوگوں
لو شاء الله	کو مجبور کر سکتے ہو؟

صاوی کا قول ہے:-

تسلیة للنبیؐ عن حرصه علی ایمانهم کلهم۔

یہاں رسول اللہؐ کو تسلی دی گئی ہے۔ کیونکہ آپ یہ تمنا رکھتے تھے۔ کہ سب کے سب کافر اور مشرک مسلمان ہو جائیں ؏

اسلام کے ممیزات اور خصوصیات

غیر مسلموں کو اعتقاد اور عمل کی آزادی

اسلام کے نکتہ چینوں نے نہ جانے کیوں اسلام کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی ہمیشہ ب اور ناروا کوشش کی ہے۔ ایک بڑا طبقہ اس خیال پر مصر ہے کہ اسلام تلوار کے ے پھیلا۔ یہ لوگ اتنا نہیں سوچتے کہ اگر واقعی اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، تو یہ تلوار کے ہاتھ میں آئی کہاں سے؟ اسلام کی صدا جب مکہ میں بلند ہوئی تو اس کی مظلومیت عالم تھا کہ داعیِ اسلام پر آوازے کسے جاتے تھے۔ اس کی دعوت کا مذاق اڑایا جاتا اس کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے۔ سجدہ کی حالت میں اس کی پیٹھ پر اونٹ نی اور بوجھل اوجھڑی رکھ دی جاتی تھی۔ شور و غل اور ہنگامہ آرائی میں اس کی آواز دبا جاتی تھی۔ اسے زخمی اور لہولہان کر دیا جاتا تھا۔ اور وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ آخر اس نے "ہجرت" ترک وطن اور نقل اقامت کی ٹھانی۔ اس لئے کہ اب مکہ میں رہنا اور یہ مظالم سہتے رہنا اس

کے اور اس کے رفقا کے لئے ناممکن ہوگیا تھا۔

ہجرت کے بعد اسلام کا قافلہ مدینہ پہنچا۔ مدینہ آنے والے مسلمان اپنا سب کچھ چھو
کر آئے تھے۔ ضروریاتِ زندگی کی معمولی سے معمولی برتنے والی چیزیں بھی اپنے ساتھ
لا سکے تھے۔ مدینہ میں جب یہ پہنچے ہیں۔ تو عالم یہ تھا کہ نہ تو ان کے پاس تلوار تھی، نہ چھری
تیغ، نہ تبر، نہ لاٹھی، نہ ڈنڈا، نہ نیزہ، نہ سنگین۔ یہ آشفتہ حال تھے۔ پریشان روزگار تھے۔
کے بدن پر جو کپڑے تھے وہ بھی ثابت نہ تھے۔ ان کے کھانے کا کوئی سامان نہ تھا۔ انصا
———— گنے چنے انصار نے ———— انہیں بھائی بنا لیا تھا وہی کھلاتے پ
تھے۔ البتہ ان کے پاس صداقت کی قوت تھی۔ اور یہ صداقت کا پرچار کر رہے تھے۔
میں یہود بھی تھے۔ عیسائی بھی اور مشرک بھی اور یہ سب اسلام سے متنفر تھے۔ داعیِ اس
سے بیزار تھے، دعوتِ اسلام کے مخالف تھے اور ان سب کے پاس چمکتی ہوئی دھار
تلواریں بھی تھیں اور وہ ان تلواروں کو استعمال بھی کرتے تھے۔ پھر بھی، اسلام پھیلتا رہا، پروا
چڑھتا رہا۔ دلوں میں گھر کرتا رہا، تلوار کے زور سے نہیں اس لئے کہ تلوار تھی ہی نہیں
صداقت، راستی اور سچائی کے زور سے۔ اس طاقت سے اسلام کبھی محروم نہیں ہوا یہ طا
ہمیشہ اس کے ہاتھ میں رہی۔ اور ماننا چاہیئے کہ یہ طاقت اپنی کاٹ میں تلوار سے کہی
بڑھ چڑھ کر تھی۔

جو اپنے لئے وہی دوسروں کیلئے

اسلام کے پیروؤں نے جس طرح مکہ کے مفسدوں اور مدینہ کے باشندوں سے ا
لئے حریتِ خیال و اعتقاد کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح دوسروں کے لئے بھی یہ حق تسلیم
تھا۔ مسلمانوں کو یہ حق کبھی نہ ملا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے کسی کو یہ حق د
سے انکار کیا ہو۔ کبھی اور کسی دور میں بھی نہیں۔ بلکہ طاقت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے
حق کو فرض بنا دیا۔

اسلام کی خصوصیات

بات یہ ہے کہ اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ اس کی بنیاد مساوات، عدل اور رواداری پر ہے۔ وہ ہرگز یہ گوارا نہیں کرتا۔ کہ جو لوگ اسے مانتے ہیں وہ نازک سے نازک مرحلہ پر بھی اس کے اصولوں کو توڑیں۔ اس کے نظام میں خلل ڈالیں۔ اس کے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے قاعدوں سے روگردانی کریں۔ وہ غیر مسلموں کے ساتھ حد سے زیادہ رعایت کرتا ہے کسی کام میں مداخلت نہیں کرتا۔ ان کے عقیدے اور خیال کو جبر و جور سے بدلنے کا حامی نہیں۔ ان کو زیادہ سے زیادہ ڈھیل دیتا ہے۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مسالمت کا برتاؤ کرتا ہے۔ انہیں کسی ناواجب سے ناواجب فعل سے بھی نہیں روکتا، سوا اس صورت کے کہ وہ بر سرِ عام اس کا ارتکاب کریں۔ اور یہ ارتکاب معصیت، امن عامہ اور اخلاق عامہ کے لئے مخل انداز ثابت ہو ——— جہاں وہ غیر مسلموں کے ساتھ اتنی رعایت کرتا ہے۔ وہاں وہ مسلمانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سختی کرتا ہے کہ وہ اس کے حدود کو توڑنے کا جرم نہ کریں۔ وہ ہر حالت میں اور ہر مرحلہ پر اس کے وقار اور اس کی آن کا خیال رکھیں۔ کبھی بھی ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو۔ جو اسلام کی بدنامی کا موجب ہو سکے۔ وہ بار بار مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں ——— اور ظاہر ہے کہ یہ دشمن غیر مسلم ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی باہمی دشمنی اسلامی تصورات سے دور ہے ——— تک سے ایسا برتاؤ نہ کریں کہ جو عدل اور انصاف کے خلاف ہو۔ وہ ذہنی اور دماغی توازن ہر حالت میں قائم رکھیں۔ کبھی بھی ایسا نہ کریں کہ اس توازن کو کھو دیں۔ اور ایسی حرکت کر بیٹھیں جو عدل و انصاف اور اصول کے خلاف ہو۔ اگر وہ ایسا کریں گے۔ تو انہیں حق نہیں کہ اپنے تئیں سچا اور کھرا مسلمان کہہ سکیں۔ کیونکہ سچا اور کھرا مسلمان صرف وہی ہے جو ہجوم میں، تنہائی میں بے بسی کی حالت میں، اقتدار اور اختیار کے دور میں، غرض کبھی بھی یہ نہیں فراموش کرتا کہ وہ خود کچھ نہیں ہے۔ اس کا ہر فعل صرف اسلام کے لئے ہے۔ اپنے ہر کام اور فعل کا وہ خدا کے

سامنے جوابدہ ہے۔ اور ایک دن اسے چھوٹے اور بڑے، اچھے اور برے ظاہر اور پوشیدہ
ہر کلام اور ہر فعل کا جواب دینا پڑے گا۔ ایک دن میزان عمل میں اس کی ہر چیز تولی جائے
اور اس دن جس نے نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس سے بدی کا ارتکاب ہوا ہوگا
بھی اسے بچشم خود دیکھ لے گا ——— فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل
مثقال ذرۃ شرا یرہ ——— چنانچہ ان تاکیدوں اور احتیاطوں اور پیش بندیوں
کے بعد مسلمانوں سے مخاطب ہو کر سورہ مائدہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا

ولا یجرمنکم شنآن قوم علی — کسی جماعت سے دشمنی کے باعث
ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی — ہو کر عدل سے منہ موڑ لو۔ ہر حالت میں انصاف
کرو وہ تقوی سے قریب تر ہے۔

دوستی کا گر

یہ سچ ہے کہ نیکی اور برائی میں مصالحت نہیں قائم ہو سکتی ہے۔ یہ بھی درست ہے
حق اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اور باطل صرف اس لئے ہے کہ مٹ جائے اور مٹا دیا جائے
جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں
انتہا پسندی کا جوش نتیجۃً نیکی کو بدی بنا دے ——— ہاں نیکی بھی بدی بن سکتی
ہے۔ اگر اسے غلط طریقہ سے پیش کیا جائے۔ اور بدی بھی مظلوم ہو سکتی ہے۔ اگر کسی
دفاع اور اقدام دونوں میں ان حدود و شرائط کا خیال نہ رکھا جائے، جو اللہ تعالیٰ نے
آخری کتاب میں وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیئے ہیں۔ پس ہر مسلمان کے لئے
لابدی ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی اسلام کے حدود و شرائط میں نہ تبدیلی کرے
میں ترمیم کی کوشش کرے۔

سورہ حم سجدہ میں خدا نے نہایت صاف اور واضح الفاظ میں اپنے نیک
بندوں سے ارشاد فرمایا

لاتستوی الحسنة ولا السیئة ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینك وبینه عداوة كانه ولی حمیم

نیکی اور برائی یکساں نہیں ہو سکتیں بدی کا دفعیہ بطریق احسن ادا کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اور جس کے بیچ عداوت ہے وہ پکا دوست بن جائے گا۔

خدا کی ذمہ داری

رسول اللہ کو بار بار اس طرف متوجہ کیا گیا۔ کہ کون ہدایت کو قبول کرتا ہے۔ اور کون ضلالت پر قائم رہتا ہے۔ یہ کام تمہارا نہیں۔ ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت اور گمراہی پر جمے رہنے کی جبلت ———— یہ باتیں خدا کی طرف سے ہیں تم ان کی فکر میں مر گر دان نہ ہو تم ان کے بارے میں اپنے ذہن و دماغ کو پریشان نہ کرو۔ تم انہیں سوچ سوچ کر اپنے اوپر افسردگی، غم، صدمہ اور بے چینی کی کیفیت طاری مت کرو۔ یہ چیزیں تمہاری حدود سے خارج ہیں۔ اس دنیا کا پیدا کرنے والا، اس دنیا کو قائم رکھنے والا اس دنیا کی ہر چیز پر تصرف، اقتدار اور کامل و غیر مسئول اختیار رکھنے والا صرف خدا ہے۔ اور یہ اسی کا کام ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت عطا کر دے اور جسے چاہے گمراہی اور ضلالت کے راستے پر رہنے دے۔ تم یہ باتیں سوچ سوچ کر کیوں ہلکان ہوتے ہو؟

چنانچہ سورۂ بقر میں فرمایا

لیس علیكم ھداھم ولكن اللہ یھدی من یشاء

کفار و مشرکین کی راہ یابی تمہارے ذمہ نہیں۔ یہ اللہ کا کام ہے۔ جسے چاہے ہدایت عطا فرمائے۔

گمراہوں کا حشر

پھر یہی بات بعد زیادہ تسکین و دلدہی کے لہجہ میں سورہ رعد میں فرمائی

انما علیك البلاغ وعلینا الحساب

تمہارا کام صرف تبلیغ ہے اور ہمارا

کامل محاسبہ!

یعنی انسان کا کوئی عمل ضائع نہیں جاتا۔ تم تبلیغ و ہدایت کے فرائض نتائج سے بے پروا ہو کر محض حسبۃً اللہ انجام دیتے رہو۔ بارگاہِ ایزدی سے اس کا تمہیں اجر و افر ملے گا اور جو لوگ کان رکھتے ہیں مگر سنتے نہیں۔ جو حق کو ٹھکراتے ہیں اور باطل کی پرستش کرتے ہیں وہ جائیں گے کہاں؟ بہرحال آج نہیں تو کل انہیں ہمارے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ اپنے تمام اعمال و افعال کی جوابدہی کرنی ہے۔ ہم ان سے اس سرکشی اور جحود کا جواب طلب کریں گے اور اس کی سزا بھی دیں گے۔ اس دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ہمیشگی کی زندگی رکھتی ہو۔ خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان، متحرک ہو یا منجمد، باشعور ہو یا بے حس۔ یہ پہاڑ، دریا، سمندر، درخت یہ سب چیزیں فنا ہوں گی۔ اور یہ انسان جو اس کرۂ ارض پر خدا کا نائب بنا ہوا ہے۔ یہ بھی فنا کے آغوش میں پہنچے گا۔ اس پر بھی موت طاری ہوگی۔ بس مگر اس کی زندگی صالح اور نیک تھی تو اجر پائے گا۔ اگر بری اور غیر صالح تھی تو عتاب اور عذاب سے دوچار ہوگا۔ ہم نے ہدایت کے لئے اپنے پیامبر بھیجے۔ پس جس نے یہ پیام سنا اور سر جھکا دیا فھو فی عیشۃ راضیۃ اور جس نے سنی کی ان سنی کر دی۔ خدا کے پیام کو تمرد اور طغیان کے ساتھ ٹھکرا دیا وہ اپنے کئے کی سزا بھگتے گا واما من خفت موازینہ فامہ ھاویہ ——— اور پھر خدا خود پوچھتا ہے۔

وما ادراک ماھیہ؟ یعنی کچھ جانتے بھی ہو جن کے اعمال ہلکے ثابت ہوں گے اور جو "ہاویہ" میں ڈالے جائیں گے وہ "ہاویہ" ہے کیا چیز؟

فرمایا

نارٌ حامیۃ

یعنی وہ بھڑکتی ہوئی اور دہکتی ہوئی آگ ہے ——— تو جب ان کے لئے یہ سب تیاریاں ہو چکیں وہ اپنے اعمال کی جزا و سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتے ہم

تمہیں دلگیر اور ملول و افسردہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

مسلمانوں کا طغرائے امتیاز

کوئی انسان بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ لغزشوں سے اس کا دامن پاک ہے۔ مسلمانوں سے بھی تاریخ کے ہر دور میں کچھ نہ کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن غیر مسلموں کے ساتھ رواداری، ملاطفت، وسعت قلب اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کچھ اس طرح مسلمانوں کی فطرت میں رچ گیا ہے۔ کہ انہوں نے کبھی بھی غیر مسلموں کو مسلمان ہو جانے پر مجبور نہیں کیا نہ غیر مسلم ہونے کے سبب انہیں عام انسانی حقوق سے محروم کیا۔ مسلمان فرمانرواؤں نے خود مسلمانوں کو بہت ستایا، پریشان کیا، آپس کی جنگ میں خون کی ندیاں بہادیں لیکن غیر مسلموں کا جب سوال آیا تو ان کی پُرشکن پیشانی رحم و مروت کی علامت بن گئی۔ انہوں نے کبھی بھی غیر مسلموں کو ہدفِ ستم نہیں بنایا۔ یہ کردار نتیجہ ہے ان واضح قرآنی ہدایات کا جنہیں مسلمانوں نے اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور اس طرح جذب کیا کہ یہ چیز ان کی طبیعت کا جزو بن گئی۔ اور اس خصوصیت کا اعتراف خود غیر مسلموں نے بڑی صفائی اور بے باکی کے ساتھ کیا۔

الفضل ماشهدت به الاعداء

سب سے بڑی بڑائی وہ ہے جس کا اعتراف دشمن بھی کرنے پر مجبور ہو جائے۔ چنانچہ کرنل جیمس بیکر کا حسب ذیل تاریخی بیان خاص طور پر قابل غور و مطالعہ ہے۔ کرنل جیمس بیکر لکھتے ہیں:-

ایک شخص جارج برنیکو وچ نے، جو گریک چرچ کا پیرو تھا۔ ایک رومن کیتھولک شخص ہینا ڈس سے پوچھا۔ کہ اگر تم فتحیاب ہوئے تو کیا کرو گے؟ اس نے جواب دیا۔ کہ تمام باشندوں کو جبراً رومن کیتھولک بناؤں گا۔ اس کے بعد برنیکو وچ سلطان ترکی کی خدمت میں گیا۔ اور ان

سے بھی یہی سوال کیا۔ وہاں سے یہ جواب ملا۔ کہ میں ہر مسجد کے قریب ایک گرجا بنواؤں گا اور تمام لوگوں کو اجازت دوں گا۔ کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خواہ مسجدوں میں سجدہ کریں یا گرجاؤں میں صلیب کے سامنے جھکیں۔ جب اہل سرویا نے یہ سنا تو انہوں نے لیٹن چرچ کے محکوم بننے کے مقابلہ میں سلطان کی اطاعت کو زیادہ پسند کیا۔[لہ]

یہ سلطان محمد ثانی کا ذکر ہے۔ ان کے عہد میں بوسنیا اور بلغاریہ کے بہت سے اعیان و اشراف نے اسلام قبول کیا۔

ریورنڈ سائرس ایک عرصہ دراز تک امریکن مشنری (عیسائی مبلغ) کی حیثیت سے ٹرکی میں مقیم رہے۔ انہوں نے اپنے طویل دوران قیام میں بدنام ترکوں کو اچھی طرح دیکھا پرکھا، جانچا ——— دور سے نہیں، نزدیک ہو کر، قریب رہ کر، بلکہ گھل مل کر۔ لیکن وہ بھی جب ترکوں کے بارے میں اپنے خیالات و تاثرات ایک لیکچر کی صورت میں بمقام بوسٹن۔ (اکتوبر ۱۸۷۷ء) ظاہر کرنے کھڑے ہوئے۔ تو اپنے تئیں مجبور پایا کہ اعتراف کریں

"ترکی افسر عموماً مہربان ہوتے ہیں۔ تمام تکالیف اور مصائب جو پراٹسٹنٹ مشن کو ترکی میں جھیلنا پڑتی ہیں۔ اس کے بانی وہ عیسائی پیشوا اور مجالس کلیسا تھے۔ جو پراٹسٹنٹوں کے مخالف ہیں۔ ترک فطرتاً متحمل مزاج واقع ہوئے ہیں۔ قرآن میں خصوصیت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ اہل کتاب کو یعنی ان مذاہب کو جو الہامی کتاب رکھتے ہیں۔ آزادی دینا چاہیئے۔ اور اس حکم کے بموجب عیسائیوں کے متعدد فرقے نیز یہودی اسلامی سلطنت کی حفاظت میں آگئے ———

لہ "ٹرکی اِن یورپ" مصنفہ جیمس بکر ایم-اے صفحہ ۲۷۹

روسیوں اور ترکوں میں یہی تو فرق ہے۔ کہ ترکی میں عیسائیوں کے تمام فرقے مسلمانوں کی طرح آزادی کے ساتھ تماص اپنے مدرسے اور کنیسے قائم کر سکتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو اپنے مذہب میں بھی داخل کر سکتے ہیں۔ لیکن روس میں کسی روسی کو یہ اجازت نہیں کہ وہ سلطنت کے کلیسا سے منحرف ہو سکے اور نہ کسی بت پرست یا تاتاری ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سوائے سلطنت کے کلیسا کے کوئی دوسرا مذہب قبول کر سکے ورنہ سزا کا مستوجب ہوگا۔ ترک لڑائی کے وقت نہایت خونخوار اور وحشی ہیں لیکن صلح کے زمانے میں بہت متحمل المزاج ہوتے ہیں۔ مسیحی مذہب اور رعایا کے حق میں یقیناً یہ بہتر ہوگا کہ ترک یورپ میں رہیں۔ بہ نسبت اس کے کہ روس قسطنطنیہ پر قابض ہو جائے[1]

بنیادی چیز: حریت اعتقاد

حقیقت یہ ہے کہ اسلام حریت اعتقاد کے معاملہ میں بہت زیادہ فراخ دل ہے۔ وہ کسی کو اس حق سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔ اور اسلام کی تاریخ میں قدم قدم پر یہ چیز ہمیں جھلکتی ہوئی نظر آئے گی۔

علامہ عبدالوہاب خلاف اپنی کتاب السیاستہ الشرعیۃ میں تحریر فرماتے ہیں

"اسلام نے حریت اعتقاد کو تسلیم کیا ہے۔ ہر فرد کو آزادی کامل عطا کی ہے۔ کہ وہ اپنی عقل و نظر اور فکر و فہم کو بنیاد و اساس بنا کر جو عقیدہ چاہے اختیار کرے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اسلام نے توحید اور ایمان کی بنیاد بحث و نظر پر رکھی ہے نہ کہ جبر و جور اور محاکاۃ و تقلید پر"

---

[1] بوسٹن جرنل، بحوالہ ہیرن ہنری ڈی دریں در کتاب "انگلش پالیسی ان دی ایسٹ" مطبوعہ لندن ۱۸۷۸ء صفحہ ۳۳ تا ۳۴

قرآن کریم کی متعدد آیات میں لوگوں کو دعوت دی گئی ہے۔ کہ وہ زمین و آسمان پر اور خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں پر نظر ڈالیں۔ اس دعوت کا مقصد یہی ہے کہ غور و فکر کے بعد ایمان صحیح اور دین حق کی طرف رجوع کریں۔ مثلاً قرآن کریم میں وارد ہوا ہے۔

اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض وما خلق اللّٰہ من شیئٍ

دوسری جگہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللّٰہ من السماء من ماءٍ فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون ۝

یعنی

"زمین و آسمان کی پیدائش میں، رات اور دن کے اختلاف میں، دریا کے اندر، کشتی کی روانی میں جس سے لوگ نفع اندوز ہوتے ہیں اس بارش میں جو اللہ تعالیٰ برساتا ہے۔ جس سے مری ہوئی زمین پھر زندگی سے آشنا ہو جاتی ہے۔ ہوا کے چلنے میں، آسمان اور زمین کے درمیان، بادل کی تسخیر میں سمجھدار لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔"

متعدد آیاتِ قرآنی میں ایسے لوگوں پر ناراضگی کی گئی ہے۔ جو بحث و نظر کے بجائے تقلید و محاکاۃ سے ایمان لاتے ہیں۔

مثلاً قرآن میں آیا ہے۔

بل قالوا انا وجدنا آباءنا علیہ وانا علی آثارھم مھتدون ٥

یعنی

ہم نے تو اپنے باپ دادا کو اس طریقہ پر پایا ہے۔ اور ہم تو انہیں کے راستے پر چلتے رہیں گے!

بہت سی آیات قرآنی ایسی ہیں جن میں اکراہ و جبر کے ساتھ ایمان کی مذمت کی گئی ہے مثلاً

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی

یعنی

دین کے معاملہ میں زبردستی جائز نہیں کیونکہ اب ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا

افانت تکرہ الناس ان یکونوا مومنین

یعنی

(اے رسولؐ) کیا تم لوگوں کو مجبور کرنا چاہتے ہو۔ کہ وہ ایمان لے آئیں؟

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے

لکم دینکم ولی دین

یعنی

تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین

پھر جب اسلام میں اعتقاد کی بنیاد نظر عقل اور بحث و تفکیر فی

آیات اللہ ہے نہ کہ تقلید، محاکاۃ و جبر اور ترہیب و جور تو اس سے بڑھ کر حریت اعتقاد اور کیا ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم کی آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مبلغ اور داعی کے لئے سب سے بڑا آلہ تذکیر اور موعظہ حسنہ ہے۔ جتنا بھر دمہ وہ اس آلے پر کر سکتا ہے کسی پر نہیں کر سکتا۔ خدا تعالٰے اپنے برگزیدہ رسول سے فرماتا ہے

فذکر انما انت مذکر لست علیهم بمصیطر

یعنی

یاد دلاؤ تم یاد دلانے والے ہو۔ تم ان لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

مذکورہ حقائق سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی۔ کہ اسلام نے حریت اعتقاد کو پورے طور پر تسلیم فرمالیا ہے۔

اب دوسری شق لیجئے

اسلام نے جہاں مسلمانوں کی اقامت شعائر کی حفاظت و صیانت کے سلسلہ میں پابندیاں عاید کی ہیں۔ وہاں اس نے یہ بھی کیا ہے۔ کہ غیر مسلموں کے لئے اس امر کی پوری آزادی تسلیم کر لی ہے۔ کہ وہ اپنے شعائر دینی قائم کریں۔ اپنے کنائس اور معابد میں اپنی مذہبی ریت رسم پورے اطمینان اور بے فکری کے ساتھ انجام دیں۔ غیر مسلموں کو اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ وہ اپنے معاملات اور احوال شخصی (PERSONAL LAW) میں اپنے احکام کی پوری آزادی کے ساتھ پیروی کریں۔ اس رواداری اور اسلامی طرز عمل اور حریت اعتقاد کی بنیاد

رسول اللہ کا وہ ارشادِ گرامی ہے ۔ جو آپؐ نے ذمیوں کے بارے میں فرمایا تھا:

لھم مالنا وعلیھم ماعلینا

یعنی

"ہم اگر راحت میں ہیں تو وہ بھی آرام اٹھائیں گے ہم اگر دکھ میں ہیں ۔ تو وہ بھی مصیبت برداشت کریں گے۔"

جتنے عہدنامے غیر مسلموں سے کئے گئے ۔ ان میں جہاں ان کی حریت ذات و مال تسلیم کی گئی ۔ وہاں ان کے عقائد اور اقامت شعائر کی آزادی بھی مانی گئی ۔

اہل ایلیا سے عہد عمرؓ میں جو معاہدہ کیا گیا ۔ اس میں صاف صاف مرقوم تھا ۔

"اہل ایلیا کو جان و مال کی آزادی دی جاتی ہے ۔ ان کے کنیسوں کی آزادی تسلیم کی جاتی ہے ۔ ان کی ساری قوم کی آزادی کا وعدہ کیا جاتا ہے ۔ ان کے کنائس کو نہ توڑا پھوڑا جائے گا ۔ نہ انہیں نقصان پہنچایا جائے گا ۔ نہ ان کو دین بدلنے پر مجبور کیا جائے گا نہ ان میں کسی کو مذہبیت کی اساس پر ، خواہ مخواہ تکلیف دی جائے گی ۔ نہ ان کی صلیبوں اور دوسری چیزوں کو برباد کیا جائے گا ۔"

حقائق بالا سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی ۔ کہ عقیدہ کا جہاں تک تعلق ہے ۔ اسلام عقل کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے ۔ کہ وہ نظر صحیح تک پہنچ سکے ۔ اور پوری وسعت کے ساتھ یہ سہولت بہم پہنچاتا ہے ۔ کہ بحث و تفکیر فی آیات اللہ اور دلائل واضحہ کے ساتھ ہر شخص دین و عقیدہ

کو جانچ اور پرکھ کر اختیار کرے۔"[1]

ایک آیت کی شان نزول اور تفسیر

لا اکراہ فی الدین کے سلسلہ میں اگر ہم مفسرین کرام کے افکار و آراء کا تفحص کریں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ دین کے معاملہ میں جبر اور زیادتی کو روا رکھنا اسلام کی روح اور مسلک کے قطعاً خلاف ہے۔ حضرت حسن رضؓ اور حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ

انہا خاصة فی اہل الکتاب الذین یقرون علی الجزیة	یہ آیت خاص طور پر ان اہل کتاب (غیر مسلموں) کے بارے میں ہے۔ جو جزیہ پر راضی ہو گئے ہوں (یعنی اسلام کی امان میں آ گئے ہوں)

اس آیت کی شان نزول علامہ جصاص نے یہ بتائی ہے کہ

انما نزلت فی بعض ابناء الانصار کانوا یہودا فاراد آباؤہم اکراہہم علی الاسلام	یہ آیۂ کریمہ انصار کے بعض بیٹوں کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے جو یہودی تھے۔ اور ان کے (مسلمان) والد انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے!

پھر آگے چل کر اس کے بارے میں علامہ موصوف ایک شبہ رفع فرماتے ہیں۔ اس آیت کے انداز بیان سے بظاہر ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہ گویا خبر یا مشورہ ہے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ

لا اکراہ فی الدین امر فی صورة الخبر	لا اکراہ فی الدین کی آیت خبر کی صورت میں امر ہے۔[2]

---

[1] السیاسۃ الشرعیہ مطبوعہ مصر [2] احکام القرآن مطبوعہ مصر ج ۱ ۔ ص ۵۳۶

یعنی یہ خدا کا حکم ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔

کسی مذہب نے کسی دوسرے مذہب کے لئے احترام اور حریت کا یہ حق آج تک اگر دیا ہو تو بتایا جائے۔ دنیا سپاس اور ممنونیت کے ساتھ ان معلومات کا مطالعہ کرے گی :

دشمن کی گواہی

اسلام کے خلاف یورپ کے مستشرقین نے عجیب عجیب افسانے تراشے ہیں۔ طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کی ہیں، نت نئے الزامات لگائے ہیں، اسلام کے عقائد، تعلیم اور نظام پر نکتہ چینیاں کی ہیں۔ لیکن ایسے جاہلانہ اور بھونڈے انداز میں کہ اگر کوئی شخص اسلام کے مبادیات سے بھی واقف ہے۔ تو وہ ان خرافات پر یقین نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں نے اسلام کے پیام کو جتنا جتنا مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اتنا ہی اتنا وہ نمایاں اور تابناک ہوتا چلا گیا ہے۔ مسلمان اگر عہد خلافت راشدہ کے بعد بھی من حیث المجموع اسلام کی رسی کو مضبوط پکڑے رہتے تو شاید آج دنیا کا مذہب صرف اسلام ہوتا۔ اسلام کی تاریخ بالکل مختلف نظر آتی۔ پھر بھی اسلام پر پوری طرح عامل نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ جس رواداری، عدل اور مساوات کا برتاؤ کیا ہے۔ اس کا اعتراف مسلمانوں کے دشمنوں اور اسلام کے بدترین نکتہ چینوں نے بھی کہیں کھلے دل سے اور کبھی دبی زبان سے کیا ہے۔ اندلس کی جتنی تاریخیں انگریزی اور فرنچ میں ملیں گی، وہ سب ایک خاص نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں پر جو مظالم روا رکھے گئے ——— جن کی مثال تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے ——— اس کا جواز بغیر اس کے کسی طرح ممکن ہی نہ تھا لیکن بایں ہمہ ان بدترین مخالفین اور دشمنوں نے بھی مانا ہے کہ مقدام یہودیوں کے ساتھ مسلمانوں نے جو روادارانہ برتاؤ کیا۔ اس سے پہلے وہ اس برتاؤ سے اپنے سارے عہد محکومی میں کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ اور عیسائیوں کے ساتھ انہوں نے جو فراخدلانہ برتاؤ مرعی رکھا اس کی نظیر کسی غیر ملکی اور اجنبی کیا معنی ہم مذہب اور ہم قوم فاتح کے دور تک بھی تلاش بسیار کے باوجود نہیں فراہم کی جا سکتی۔

اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک حکومت کی احسان کے ناشکر گذار محکوموں نے انہیں بدنام کرنے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن سر جادوناتھ سرکار نے جو علم تاریخ کے ماہر خصوصی ہیں یہ انکشاف کر کے دنیا کو محو حیرت کر دیا کہ بنارس کے متعدد مندروں اور بت خانوں کو اور ان کے مہنتوں اور پجاریوں کو اورنگ زیب عالمگیر نے متعدد جاگیریں مرحمت کی تھیں جن کے کاغذات اور دستاویزیں اب تک اصحاب متعلقہ کے پاس موجود ہیں اور یہ جاگیریں عہد انگلشیہ تک برابر قائم رہیں۔ کسی حکومت نے بھی ان میں ترمیم و تنسیخ کی جرأت نہیں کی۔

غرض قول اور عمل ہر اعتبار سے مسلمانوں کی تاریخ۔ رواداری اور وسعت قلب کا ایک یادگار اور ناقابل فراموش ریکارڈ ہے جس کے حروف مرور ایام نے دھندلے کر دیئے ہیں مگر جس کی معنویت آج بھی اور آج سے لے کر قیامت تک ہر مرد صاحب نظر ال بنی رہے گی۔

مشرکوں اور ذمیوں کا احترام، حقوق اور مراعات

آیات قرآنی اور وحی الٰہی کے مطابق

اسلام کا دارو مدار ایمان کی بنیاد و اساس اور اسلامیت کا معیار و منبٰی کتاب و سنت کے سوا کسی اور چیز کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہر وہ فتوٰی جو کتاب اور سنت کے مطابق ہے۔ قبول کر لیا جائے گا۔ اور جو اس کے خلاف ہو رد کر دیا جائے گا ہر وہ مسلک جو کتاب و سنت سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس قابل ہے کہ اسے سر آنکھوں پہ جگہ دی جائے اور جو اس کے برعکس ہو۔ وہ گو ساری دنیا کے لئے قابل قبول ہو لیکن ایک مسلمان سے کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتا۔

ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں؟

غیر مسلموں کے ساتھ ہمیں کیا سلوک کرنا چاہیئے؟ ذمیوں کو یعنی ان غیر مسلموں کو جو

ہمارے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے ہوں کس طرح کے حقوق حاصل ہیں؟ کافروں اور مشرکوں کو آزادیٔ خیال و اعتقاد، آزادیٔ اجتماع اور آزادیٔ عمل کہاں تک حاصل ہے؟ ان چیزوں کا فیصلہ ہم سب سے پہلے قرآن حکیم سے کریں گے۔ اور وہاں جب کوئی چیز نہ ملے اور خلش باقی رہ جائے۔ تو پھر ہم سنت رسول اکرم ؐ سے رجوع کریں گے کتاب و سنت میں اس موضوع پر اتنا کافی مواد موجود ہے کہ اس کی روشنی میں ہر مسئلہ کا تصفیہ بغیر کسی پریشانی اور دشواری کے ہو سکتا ہے۔

خدا کی تقدیر یہ تھی کہ دنیا میں مسلمان بھی رہیں اور غیر مسلم بھی۔ اور ضروری تھا کہ یہ بات وضاحت کے ساتھ بتا دی جاتی۔ کہ ان غیر مسلموں کے انکار و طغیان۔ جحود و تمرد سرکشی اور بغاوت کے سلسلہ میں مسلمان کیا رویہ اختیار کریں؟ پھر جب یہ پڑوسی ہوں۔ تو ہمسائگی کے سلسلہ میں انہیں کس طرح مراعات دی جائیں۔ جب یہ مسلمانوں کے زیر میں آجائیں یعنی ان کے ماتحت اور رعیت بن کر زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ تو اسلامی حکومت، اسلامی امیر اور مسلمانوں کا برتاؤ ان کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے؟ مسلمان اور نامسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب تک یہ تفصیلات اور جزئیات سامنے نہ ہوں۔ اس وقت تک نہ مسلمان یکسوئی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ نہ غیر مسلم چین اور آرام سے رہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ کی تمام باتوں کو قرآن حکیم نے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اور سنت نبویؐ میں بار بار ایسی مثالیں نظر کے سامنے آتی ہیں۔ کہ پھر نہ کوئی غلط فہمی باقی رہ سکتی ہے نہ شبہ وارد ہو سکتا ہے؟

ذمی کے بدلے میں مسلمان کا قتل

اسلامی سٹیٹ میں ایک ذمی (غیر مسلم رعایا) کی حیثیت کیا ہوگی؟

قبل اس کے کہ اس کا جواب قرآن کریم سے دیا جائے۔ ایک نظر ہمیں موجودہ اور گذشتہ دنیا پر ڈال لینی چاہیئے۔ اب تک یہ اصول تسلیم شدہ چلا آرہا ہے کہ فاتح اور حاکم قوم

کے افراد جو حقوق رکھتے ہیں، وہ مفتوح اور محکوم قوم کے افراد کو حاصل نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں نہ جانے کتنے آدمی ہر سال انگریزوں کی ٹھوکروں سے تلی پھٹ جانے کے باعث ہلاک ہوتے تھے۔ مگر کسی انگریز کو قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا نہیں دی گئی۔ اطالیہ نے جب حبش فتح کیا تو ہر حبشی کا خون معاف تھا۔ امریکی فاتح کی حیثیت سے جاپان میں داخل ہوئے نہ جانے کتنے جاپانی ان کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مگر کیا مجال ہے کہ کوئی امریکی موت کی کرسی پر بٹھایا گیا ہو۔ جاپان کو چھوڑیئے خود امریکہ کے اندر ہر سال ایک معقول تعداد حبشیوں کی امریکیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوتی رہتی ہے۔ حالانکہ امریکہ دراصل انہی کا ملک ہے امریکی تو درحقیقت پردیسی ہیں۔

لیکن اسلام کا نظریہ اس باب میں بالکل مختلف ہے!

وہ دین و عقاید سے قطع نظر، شہری حقوق کا جہاں تک تعلق ہے۔ ایک مسلمان اور ایک ذمّی میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔ وہ قانون ہاتھ میں لینے کی سزا جس طرح اور جتنی ایک ذمّی کو دیتا ہے۔ اتنی ہی ایک مسلمان کو بھی دیتا ہے۔ وہ فاتح قوم کا جداگانہ تشخص اور امتیاز بالکل تسلیم نہیں کرتا۔ اس نے یہ اصول دنیا کے سامنے اس زمانہ میں رکھا، جب دنیا میں کوئی حکومت بھی اپنے مفتوحوں اور محکوموں کے ساتھ یہ برتاؤ کرنے کو تیار نہیں تھی!

اسلام نے قتل کی سزا قصاص رکھی ہے۔ یعنی

النفس بالنفس

جان کے بدلے میں جان!

ایک مسلمان اگر کسی مسلمان کو قتل کر دے۔ تو وہ بھی قتل کر دیا جائے گا!

ایک ذمی اگر ایک مسلمان کو قتل کر دے۔ تو وہ ضرور قتل کر ڈالا جائے!

ایک مسلمان اگر ایک ذمی کو قتل کر دے تو قطعاً قتل کر ڈالا جائے گا

کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ (مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص

واجب کیا گیا ہے، کی تفسیر کے سلسلہ میں مفسر ابوبکر جصاص فرماتے ہیں۔

یوجب القتل المسلم بالذمی اذ لم یفرق شئ منها بین المسلم والذمی وقوله تعالیٰ وکتب علیکم القصاص عام فی الکل ۔۔۔۔۔۔ و لیس فی الآیۃ فرق بین المسلم والکافر وجب اجراء حکمها علیهما وید ل علیه قوله عز وجل ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیه سلطاناً[1]

مقتول ذمی کے بدلہ میں قاتل مسلمان کا قتل واجب ہے۔ کیونکہ دعام حقوق میں، ایک ذمی اور مسلمان کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور قصاص کے واجب ہونے کا حکم عام ہے سب میں

اس آیت کریمہ کی رو سے دعام معاملات میں، ایک کافر اور مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ قصاص کا حکم دونوں پر جاری ہوگا۔ اور اس پر خدا تعالیٰ کا یہ قول دلیل ہے کہ جو مظلوم قتل ہوا ہم نے اس کے ولی کو دعوے کا حق دیا ہے۔

مسجد میں مشرک کا داخلہ جائز ہے!

مسجد مسلمانوں کا مقدس ترین مقام ہے۔ اور قرآن کریم میں صاف وارد ہے کہ انما المشرکون نجس یعنی مشرک نجس و ناپاک ہوتے ہیں۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مشرک مسلمانوں کی مسجد میں کسی طرح داخل نہیں ہو سکتا لیکن جن لوگوں کی نظر اسلام اور قرآن پر ہے۔ وہ اس خیال سے اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ علامہ جصاص نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کا ایک حصہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے وہ ارشاد فرماتے ہیں

ولم یکن اهل الذمة ممنوعین

ان مواضع (مسلمانوں کی عبادت گاہوں) میں

---

[1] احکام القرآن مطبوعہ مصر ج ۱، ص ۱۴۲

من هذه المواضع[1] — اہل ذمہ کا داخلہ ممنوع نہیں ہے

اور اپنے اس خیال کی تائید میں وہ سنت رسول صلعم پیش کرتے ہیں

عن عثمان ابن ابی العاص ان وفد ثقیف لما قدموا علی رسول الله ضرب لهم قبة فی المسجد فقالوا یا رسول الله قوم انجاس فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم انه لیس علی الارض من انجاس الناس شیئ انما انجاس الناس علی انفسهم

عثمان ابن ابو العاص روایت کرتے ہیں۔ کہ وفد ثقیف جب رسول اللہ (ص) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو آپ نے ان کے لئے مسجد میں ایک خیمہ نصب کرا دیا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو نجس لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ زمین پر لوگوں کی نجاست اثر انداز نہیں ہوتی۔ لوگ اپنے نفوس اور قلوب کے اعتبار سے گندے ہوتے ہیں۔

پھر مزید اس سلسلہ میں ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

روی یونس عن الزهری عن سعید بن المسیب ان ابا سفیان کان یدخل مسجد النبی وهو کافر[2]

یونس زہری سے اور وہ سعید ابن مسیّب سے روایت کرتے ہیں۔ کہ ابو سفیان مسجد نبوی میں داخل ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ وہ کافر تھا۔

ان دونوں حدیثوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ جصاص فرماتے ہیں

فاما وفد ثقیف فانهم جاءوا بعد فتح مکة الی النبی صلعم والآیة نزلت فی السنة التی حج فیها ابوبکر وهی سنة تسع فانزلهم النبی صلعم

جہاں تک وفد ثقیف کا تعلق ہے۔ یہ لوگ فتح مکہ کے بعد آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی۔ جس سال ابوبکر نے حج کیا تھا یعنی

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۱۰۹ [2] احکام القرآن ج ۳ ص ۱۰۹

فی المسجد واخبر ان کونهم انجاساً
لایمنع دخولهم المسجد وفی ذلک
دلالة علی ان نجاسة الکفر لایمنع
الکافر من دخول المسجد[1]

نویں ہجری سال کا واقعہ ہے۔ پھر بھی رسول اللہ
نے ان لوگوں کو مسجد میں اتارا اور بتایا کر ان کا
نجس ہونا ان کے مسجد میں داخلہ کے لئے مانع
نہیں ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ
کافر کا نجس ہونا اس کے مسجد میں داخلہ کے لئے
روک نہیں ہے۔

صدقات میں مشرک کا حصہ

صدقات یعنی رضائے الٰہی کے سلسلہ میں مسلمان جو رقمیں صرف کرتے ہیں
کیا وہ مشرکوں اور غیر مسلموں پر صرف کی جا سکتی ہیں؟ جو نہ توحید باری تعالیٰ کے
قائل ہیں نہ اس کی الہامی کتاب کے اور نہ اسلام کی صداقت کے؟
بظاہر اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ نہیں۔ مشرکوں اور غیر مسلموں کو صدقہ کی
رقم نہیں دی جا سکتی لیکن یہ جواب غلط ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کو کہیں زیادہ وسیع
نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر اس بارے میں یہ ہے کہ ایسے تمام معاملات کو
صرف انسانیت کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ مذہب و ملت کو پیش نظر رکھ کر نہیں
چنانچہ آیہ کریمہ

لیس علیک ھداھم ولکن
اللّٰہ یھدی من یشاء وما تنفقوا
من خیر فلانفسکم

ان کافروں اور مشرکوں کی ہدایت
آپ کے ذمہ نہیں ہے۔ وہ تو اللہ
ہے جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا
اور جو کچھ تم حصول خیر کے لئے خرچ کرتے
ہو وہ اپنی بھلائی کے لئے کرتے ہو

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۱۱۱

کی تفسیر بیان کرتے ہوئے علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں۔

ان المراد اباحة الصدقة عليهم وان لم يكونوا على دين الاسلام وروى ذلك عن جماعة من السلف وروى الحجاج عن سالم المكي عن ابن الحنفية قال كره الناس ان يتصدقوا على المشركين فانزل الله فتصدق الناس عليهم[1]

اس سے مراد یہ ہے کہ مشرکوں اور کافروں کو صدقہ دینا مباح ہے۔ اگرچہ وہ دین اسلام کے پیرونہ ہوں یہی مسلک سلف کے ایک گروہ سے مروی ہے۔ اور حجاج، سالم مکی سے اور وہ ابن حنفیہ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ لوگ اسے ناپسند کرتے تھے کہ مشرکین کو صدقہ دیں۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور پھر لوگ مشرکوں کو صدقہ دینے لگے۔

پھر اس سلسلہ میں اپنے قول کی مزید وضاحت کرتے ہوئے علامہ موصوف ایک دوسری آیہ کریمہ (ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا ویتیما واسیرا) سے استشہاد کرتے ہوئے کہ اسیر جنگ سے مراد غیر مسلم اور مشرک ہیں۔ فرماتے ہیں۔

فروی عن الحسن قال هو الاسراء من اهل الشرك وروی عن سعيد بن جبير وعطاء قال هم اهل القبلة وغيرهم قال ابوبكر الاول اظهر لان الاسير في دار الاسلام لا يكون الا مشركا ونظيرها ايضا قوله تعالی (لا ينهاكم الله

حسن سے روایت ہے کہ اسراء سے مراد اہل شرک ہیں۔ اور سعید بن جبیر اور عطاء وغیرہ سے روایت ہے۔ کہ یہ لوگ اہل قبلہ اور غیر اہل قبلہ ہیں۔ ابوبکر جصاص کہتے ہیں۔ کہ یہ بات تو بالکل ظاہر ہے۔ اس لئے کہ دار الاسلام میں کوئی اسیر جنگ مشرک ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے۔ کہ

---

[1] احکام القرآن ج ۱ ص [illegible]

عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم ان تبروهم وتقسطوا اليهم) فاباح برهم وان كانوا مشركين اذا لم يكونوا اهل حرب لنا والصدقات من البر فاقتضى جواز دفع الصدقات اليهم وظاهره الآية توجب جواز سائرها اليهم الا الزكوٰة)[1]

"جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں مقاتلہ نہ کریں۔ اور تمہیں ترک وطن پر مجبور نہ کریں، ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور بھلائی کا برتاؤ کرنے کو اللہ منع نہیں کرتا"۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ساتھ بر اور قسط کو مباح قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ وہ ہم سے برسرِ پیکار نہ ہوں۔ اور صدقات کا شمار بر یعنی حسن سلوک اور بھلائی میں ہوتا ہے۔ پس اقتضائے کلام یہ ہے کہ مشرکوں کو صدقہ دینا جائز ہے۔ اور ظاہر آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ زکوٰۃ کے علاوہ ہر قسم کے صدقے کی رقوم انہیں دی جاسکتی ہیں۔

پھر آگے چل کر علامہ موصوف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال ابو حنيفة كل صدقة ليس اخذها الى الامام فجائز اعطاؤها اهل الذمة وما كان اخذها الى الامام لا يعطى اهل الذمة فيجوز اعطاء الكفارات والنذور وصدقة الفطر اهل الذمة[2]

امام ابو حنیفہ رہ کا قول ہے کہ زکوٰۃ کے سوا ہر صدقہ اہل ذمہ کو دیا جاسکتا ہے البتہ زکوٰۃ اہل ذمہ پر نہیں صرف کی جاسکتی ہے (کیونکہ اس کے مصارف مقرر ہیں) البتہ کفارے، نذر اور صدقہ فطر کی رقمیں اہل ذمہ کو دی جاسکتی ہیں

---

[1] احکام القرآن ج ، ص ۱۲۸

کافر کا خون بہا

اسلام میں قتل کی سزا قتل ہے لیکن اگر مقتول کے ورثا بغیر کسی جبر و اکراہ کے رضاکارانہ طور پر خون بہا (دیت) لینے پر رضامند ہو جائیں۔ تو اس کی اجازت بھی ہے اور کوئی شبہ نہیں۔ یہ رخصت اور اجازت بہت سی مصلحتوں کی حامل ہے۔ مقتول کے چند چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بوڑھی ماں ہے۔ بیکار باپ ہے۔ قاتل اگر قتل کر دیا جائے تو ذہنی طور پر ایک قسم کا اطمینان ضرور حاصل ہو جائے گا ان ورثا کو لیکن عملی طور پر کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ البتہ اگر ان ورثا کو اتنی رقم مل جائے جس سے یہ اپنی زندگی کی گاڑی کھینچ سکیں۔ تو زیادہ بہتر صورت ہے۔ اسی طرح یہ بھی فرض کر لیں تو قاتل بھی ایک باپ ہے، ایک شوہر ہے، ایک بھائی ہے۔ ایک بیٹا ہے، ایک دوست ہے۔ کسی وجہ سے اس سے یہ غلطی ہو گئی۔ اب اگر اس کی زندگی واپس مل جائے۔ تو سارا کنبہ تباہ ہونے سے بچ جائے گا۔ اس کی زندگی سنور جائے گی، اس کے متعلقین کی آسودگی اور عافیت قائم رہے گی۔ لہذا اگر وہ خون بہا دے دے۔ تو زیادہ اچھی اور مناسب صورت ہے۔ اسلام کا قانون تو یہی فیصلہ کرے گا کہ جس نے قتل کیا ہے۔ اس کی گردن اڑا دی جائے لیکن اس میں اتنی لچک بھی ہے۔ کہ اگر قاتل خون بہا دینے پر اور مقتول کے ورثا بغیر کسی دباؤ کے خون بہا لینے پر رضامند ہوں۔ تو اس کی جان بخشی کی جا سکتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قاتل تو مسلمان ہو اور مقتول ذمی یعنی کافر ہو، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ قاتل تو حکمران قوم کا ایک فرد ہو اور مقتول محکوم قوم کا ایک فرد تو اسلام کا قانون کیا کہتا ہے؟ دنیا کی سب سے مہذب اور متمدن حکومت برطانیہ کا قانون تو ہم نے اپنے دور غلامی میں دیکھ لیا۔ نہ جانے کتنے قلی، خانساماں اور بیرے صاحب کی ٹھوکر سے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر، کوٹھی کے صحن میں اور کلب کے کمپاؤنڈ میں جان بحق

تسلیم ہوئے لیکن نہ خون بہا کا سوال پیدا ہوا نہ سزائے قتل کا۔ خواجہ رنگین قبا کے دا[illegible]
جلال شہریاری کی اس سے بڑھ کر توہین کیا ہو سکتی تھی کہ اسے قاتل کی حیثیت سے [illegible]
کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا۔ اور پھر اس کے لئے پھانسی کا پھندا تیار کیا جاتا۔ دلی سے [illegible]
کر لندن تک ایک قیامت برپا ہو جاتی لیکن اسلام نے انسانی جان کی قیمت یکساں مقر[illegible]
کی ہے۔ اس معاملہ میں وہ مومن و کافر کی تفریق پسند نہیں کرتا۔

علامہ جصاص نے اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو قرآن کی روشنی میں کی ہے۔ اس [illegible]
ایک حصہ یہ ہے۔

قال ابوحنيفة وابويوسف و محمد وزفر وعثمان البتّى وسفيان الثورى والحسن بن صالح دية الكافر مثل دية المسلم اليهودى والنصرانى والمجوسى والمعاهد والذمى سواء

قال ابوبكر الدليل على مساواتهم المسلمين فى الديات قوله عز وجل (ومن قتل مؤمنا خطأ فتحرير رقبة مؤمنة ودية مسلمة الى اهله الا ان يصدقوا) الى قوله (وان كان من قوم بينكم وبينهم ميثاق فدية مسلمة الى اهله)[1]

ابوحنیفہ، ابو یوسف اور محمد اور زفر اور عثمان [illegible]
البتی اور سفیان ثوری اور حسن بن صالح کا قو[illegible]
ہے۔ کہ کافر کی دیت (خون بہا) مسلمان کی [illegible]
کی طرح ہے۔ یعنی یہودی، نصرانی، مجوسی [illegible]
معاہد اور ذمی کی دیت وہی ہے جو مسلمان کی [illegible]
ابوبکر (جصاص) کہتے ہیں۔ کہ کافروں [illegible]
مسلمانوں کی دیت کی مساوات (اللہ تعالیٰ [illegible]
یہ قول ہے۔ کہ اگر کسی مسلمان نے کسی مسلم[illegible]
کو غلطی سے قتل کر دیا۔ تو ایک مسلمان غلام [illegible]
کرنا اور اس کے ورثا کو دیت دے دینا [illegible]
اور اگر تم میں اور کافروں میں کوئی عہد (و [illegible]
ہو۔ تو مقتول کے ورثا کو پوری دیت دی جائے [illegible]

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں۔ اس سلسلہ کی تین اصطلاحوں کو ذہن نشین کر[illegible]

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۲۹۰

چاہیئے۔ ایک چیز تو ہے ثار، یہ بدلہ اور انتقام کے معنی میں آتا ہے۔ اور کسی اصول کا پابند نہیں ہوتا۔ اسلام اسے ناجائز سمجھتا ہے۔ دوسری چیز ہے قود یعنی قصاص۔ یہ اسلام میں جائز ہے اور قاتل کی سزا اس نے مقرر کر دی ہے یعنی موت۔ تیسری چیز ہے دیت یعنی خون بہا۔ اگر مقتول کے ورثاء رضامند ہوں تو دیت پر تصفیہ ہو سکتا ہے۔ دیت کا نصاب سو اونٹ ہے یعنی قاتل مقتول کے ورثاء کو سو اونٹ یا ان کی قیمت دے گا۔

پھر آگے چل کر علامہ موصوف آیت بالا کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

والدية اسم للمقدار المعلوم من المال بدلا من نفس الحر لان الديات قد كانت متعالمة معروفة بينهم قبل الاسلام وبعده فرجع الكلام اليها في قوله في قتل المؤمن خطأ ثم لما عطف عليه قوله تعالى وان كان من قوم بينكم وبينهم ميثاق فدية مسلمة الى اهله كانت هذه الدية المذكورة بديها اذ لو لم تكن كذلك لما كانت دية لان الدية اسم لمقدار معلوم من بدل النفس لا يزيد ولا ينقص وقد كانوا قبل ذلك يعرفون

اور دیت ایک مقدارِ معلوم کا نام ہے جو ایک نفس حر کا بدل قرار پائی ہے۔ اس لئے کہ اسلام سے پہلے بھی دیت کا رواج تھا اور اسلام نے بھی ضروری اصلاحات کے ساتھ اس رواج کو قائم رکھا۔ اللہ تعالےٰ نے جہاں مسلمان کی دیت کا ذکر فرمایا ہے وہیں عطف کرکے معاہد اور ذمی کی دیت بھی وہی قرار دی ہے جو مسلمان کی، یہ دیت ایک بدیہی چیز تھی۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو دیت کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔ اس لئے کہ دیت تو ایک مقدار معلوم کا نام ہے کسی جان کے بدلہ میں۔ اس میں نہ اضافہ ہو سکتا ہے نہ کمی ہو سکتی ہے۔ اور لوگ مقادیر دیات سے پہلے ہی واقف تھے۔ گو مسلم و کافر کی دیت کے

---

[1] یعنی سو اونٹ یا ان کی قیمت

مقادیر الدیات ولم یکونوا یعرفون
الفرق بین دیۃ المسلم والکافر توجب
ان تکون الدیۃ المذکورۃ للکافر ھی
التی ذکرت للمسلم[1]

فرق سے نا واقف تھے۔ پس واجب ہوا کہ
کافر کی دیت بھی وہی ہو جو مسلمان کی ہے

اسلام نے مسلم اور کافر کا خون بہا برابر رکھا۔ اور اس میں کسی طرح کا امتیاز نہ تسلیم کر کے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ دنیاوی معاملات میں وہ بالکل "سیکولر" ہے۔ وہ صرف انسانیت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اور کافر و مسلم کا فرق پیدا کر کے ہرگز مسلمانوں کی حاکمانہ بالادستی تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ مساوات کامل کا چارٹر عطا کرتا ہے۔

ایک یہودی کے باعث آں حضرتؐ کو استغفار کا حکم

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے۔ کہ وہ نازک سے نازک موقع پر بھی عدل کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ وہ ہر حالت میں انصاف کو مقدم رکھتا ہے۔ وہ کسی طور پر بھی اسے گوارا نہیں کرتا کہ کسی غیر مسلم کے ساتھ شمہ برابر بھی زیادتی یا بے انصافی ہو سکے اس معاملہ میں اسلام کا اللہ اپنے محبوب رسولؐ اور برگزیدہ بندے تک کا سختی سے احتساب کرتا ہے۔ اور اگر کسی معاملہ میں ذرا بھی لغزش دیکھتا ہے تو ٹوکتا ہے۔ او استغفار کا حکم دیتا ہے۔ علامہ ابو بکر جصاص آیہ کریمہ ولاتکن للخائنین خصیما (خیانت کرنے والوں کی پاسداری مت کرو) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

روی انہ نزل فی رجل سرق
درعا فلما خاف ان تظھر علیہ
رمی بھا فی دار یھودی فلما
وجدت الدرع انکر الیھودی

اس آیت کی شان نزول یہ ہے۔ کہ یہ
اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے
جس نے ایک زرہ چرا لی تھی۔ اور جب
اندیشہ ہوا کہ چوری کھل جائے گی۔ تو ایک

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۲۹۰

ان يكون اخذها وذكر السارق ان اليهودي اخذها فاعان قوم من المسلمين هذا الآخذ على اليهودي فمال رسول الله صلى الله عليه وسلم الى قولهم فاطلع الله على الآخذ وبراءة اليهودي منه ونهاه عن مخاصمة اليهودي وامره بالاستغفار مما كان منه[1]

یہودی کے گھر میں پھینک دی۔ جب زرہ یہودی کے گھر میں پائی گئی۔ تو اس نے انکار کیا چوری سے۔ اور اصل چور یہودی پر چوری کا الزام دھرنے لگا۔ اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے یہودی کے مقابلہ میں مسلمان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کے قول کی طرف مائل ہو گئے لیکن اللہ نے آپ کو اصل واقعہ کی اطلاع دی اور یہودی کو بری قرار دیا۔ اور اس کے خلاف فیصلہ کرنے سے روک دیا اور استغفار کا حکم دیا۔

پھر آگے چل کر علامہ جصاص اس پر بحث کرتے ہوئے اور صورت مسئلہ کے بعض پہلوؤں کو واشگاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وهذا يدل على انه غير جائز لاحد ان يخاصم عن غيره في اثبات حق او نفيه وهو غير عالم بحقيقة امره لان الله تعالى قد عاتب نبيه على مثله وامره بالاستغفار منه[2]

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ بات ناجائز ہے۔ کہ آدمی کسی معاملہ میں اثبات حق یا اس کی نفی میں بغیر واقفیت اور علم کے حصہ لے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے ہی موقعہ پر اپنے نبی ؐ پر عتاب کیا اور استغفار کا حکم دیا۔ حالانکہ اگر اس طرح کی بات جائز ہوتی۔ تو نہ عتاب کی ضرورت تھی نہ استغفار کی۔

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۷۳ [2] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۷۳

اس سلسلہ میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اور جو ایرادات کئے جا سکتے ہیں اور جو اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے علامہ جصاص فرماتے ہیں:-

وقوله تعالیٰ (لتحكم بين الناس بما اراك الله) مما احتج به من يقول ان النبی صلی الله عليه وسلم لم يكن يقول شيئا من طريق الاجتهاد وان اقواله وافعاله كلها كانت تصدر عن النصوص وانه كقوله تعالیٰ (وما ينطق عن الهوىٰ ان هو الا وحی يوحیٰ) وليس فی الآيتين دليل علی ان النبی صلی الله عليه وسلم لم يكن يقول شيئا من طريق الاجتهاد وليس فی الآية دلالة علی نفی الاجتهاد من النبی صلی الله عليه وسلم فی الاحكام وقد قيل فی قوله تعالیٰ (ولا تكن للخائنين خصيما) انه جائز ان يكون النبی صلی الله عليه وسلم ميلا الی المسلمين دون اليهودی اذ لم يكن عنده انهم غير محقين فاذا كان

اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "اللہ جو کچھ آپ کو بتائے اس کے مطابق فیصلہ کریں۔" اس کے لئے یہ دلیل لاتا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کوئی ایسی بات نہیں فرماتے تھے جو بہ طریق اجتہاد ہو۔ اور یہ کہ آپ کے اقوال اور افعال سب کے سب نص پہ مبنی ہوتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق "آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے تھے جو کچھ کہتے تھے وہ وحی ہوتا تھا۔" تو ان دونوں آیتوں میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے یہ دلیل لائی جا سکے کہ آں حضرت بطریق اجتہاد کچھ نہیں کہتے تھے۔ کیونکہ آیہ بابکہ میں نفی اجتہاد کی آنحضرت ص کے احکام کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "آپ خائنوں کی پاسداری نہ کیجیے۔" یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم یہودی کے مقابلے میں مسلمانوں کی طرف میلان رکھیں۔ اس لئے کہ آپ ص کے

ظاهر الحال وجود الدرع عند اليهودي فكان اليهودي اولى بالتهمة والمسلم اولى ببراءة الساحة فامره الله تعالى بترك الميل الى احد الخصمين والدفع عنه وان كان مسلماً والآخر يهوديا فصار ذلك اصلاً في ان الحاكم لا يكون له ميل الى احد الخصمين على الآخر وان كان احدهما ذا حرمة له والآخر على خلافه وهذا يدل ايضا ان وجود السرقة في يد الانسان لا يوجب الحكم عليه بها لان الله تعالى نهاه عن الحكم على اليهودي بوجود السرقة عنده اذ كان جاحداً ان يكون هو الآخذ۔[1]

نزدیک وہ حق پر نہیں تھے۔ جبکہ ظاہری صورت حال یہ تھی کہ زرہ یہودی کے پاس پائی گئی تھی۔ پس یہودی تہمت کا اور مسلمان بریت کا مستحق تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا۔ کہ فریقین میں سے کسی کی طرف میل نہ رکھیں۔ نہ کسی کی مدافعت کریں۔ اگرچہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو اور دوسرا یہودی کیوں نہ ہو۔ پس اصل یہ قرار پائی۔ کہ حاکم کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔ کہ وہ فریقین میں کسی کی طرف میل رکھے۔ اگرچہ ان میں سے ایک اس کی نظر میں صاحب حرمت ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی انسان کے قبضہ سے چوری کا مال برآمد ہونا اس کے چور ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔ اس پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودی پر ایسا فیصلہ صادر کرنے سے روکا۔ جبکہ اس کے قبضہ سے چوری کا مال برآمد ہوا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ ایسے احکام وہی شریعت دے سکتی ہے۔ جو حقیقی معنٰی میں ربانی ہو۔ انسان اتنا علو ظرف کہاں سے لائے گا؟

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۵۱

یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے۔ کہ وہ انسانیت کا احترام ہر چیز پر بالا رکھ
ہے۔ اسلام کا خدا صرف مسلمانوں کا خدا نہیں "رب العالمین" ہے۔ سارے
جہانوں کا پالن ہار۔ جو اس کی بندگی کرتے ہیں انہیں وہ جنت نعیم کی بشارت دیتا
ہے۔ لیکن جو اس کی بندگی نہیں کرتے ان کے ساتھ بھی بے انصافی نہیں کرتا ان کے
ساتھ بھی احسان کرتا ہے۔ اس کی ہوا، پانی اور زمین جس طرح ہر فرد بشر کے لئے
ہے۔ اسی طرح اس کے نظام مدنی میں بھی کسی طرح کی اونچ نیچ نہیں۔

فیصلہ ظاہر پر ہوگا نہ کہ باطن پر!

"کفر کا فتویٰ" ہمارے علما کی ایک جماعت کثیرہ کا مشغلہ بن چکا ہے۔ جسے
اپنے سمجھے ہوئے اسلام کے راستہ سے ذرا ہٹا ہوا پایا۔ اسے کافر قرار دے دیا۔ بعض
فتاوائے کفر تو جدت اور ندرت سے اتنے پُر ہیں۔ کہ سود مرکب کی طرح ان کا سلسلہ
بھی نہ جانے کہاں سے شروع ہوتا ہے اور نہ جانے کہاں ختم۔ جسے کافر قرار دے دیا
گیا ہے اسے اگر کوئی کافر نہ مانے تو وہ بھی کافر، اس سے ملنے والا کافر، اس کی بیوی
مطلقہ، اس کی اولاد محروم الارث وغیرہ ذلک من الخرافات۔ لیکن یہ اسلام کی بالکل
غلط اور بے رحمانہ ترجمانی ہے۔ جو اسلام کافروں، مشرکوں اور منافقوں تک کے ساتھ
ملاطفت اور نرمی، حسن سلوک اور شفقت کا برتاؤ کرتا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ ان لوگوں
کے حق میں مجسم قہر و جلال اور شمشیر بے اماں بن جائے۔ جو اپنے اسلام کے، اپنی اسلامیت
کے معترف اور مقر ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم صاف کہتا ہے لا تقولوا لمن القی الیکم
السلام لست مؤمنا (جو کوئی تمہیں (مسلمانوں کا سا) سلام کرے اس سے یہ
کہو کہ تو مومن نہیں ہے) اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اسلام
یہ اصول ہے کہ فیصلہ ظاہر پر ہوگا باطن پر نہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص اپنے تئیں مسلمان
کہتا ہے۔ تو ہمیں حق نہیں ہے۔ کہ اسے کافر کہہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ محتاط علما

کا اصل یہ ہے۔ کہ اگر ۹۹ وجوہ کفر ہوں اور ایک وجہ اسلام کی موید ہو تو ۹۹ وجوہ کفر کو نظر انداز
کر دیا جائے گا۔ اور اس کا اسلام مان لیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے۔ کہ الفاظ
تسیم کرے جائیں گے۔ دل نہیں ٹٹولا جائے گا۔ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے علامہ جصاص
فرماتے ہیں۔

وقول من قال انی لا اعرف
توبته ای کفر سراً فانا لا نؤاخذ
باعتبار حقیقة اعتقاده لان ذلك
لا نصل الیه وقد حظر الله علینا
الحکم بالظن بقوله تعالی اجتنبوا
کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم
وقال النبی ایاکم والظن فانه
اکذب الحدیث وقال الله تعالی
ولا تقف ما لیس لك به علم وقال
اذا جاءکم المؤمنات المهاجرات
فامتحنوهن الله اعلم بایمانهن
ومعلوم انه لم یرد حقیقة العلم
بضمائرهن واعتقادهن وانما
اراد ما ظهر من ایمانهن بالقول
وجعل ذلك علماً فدل علی انه لا
اعتبار بالضمیر فی احکام الدنیا وانما
الاعتبار بما یظهر من القول وقال

اور جو شخص یہ کہتا ہے۔ کہ جو شخص چوری
چھپے کافر ہے۔ میں اس کی توبہ نہیں قبول
کرتا۔ تو معلوم ہونا چاہیئے۔ ہم حقیقت اعتقاد
کے اعتبار سے کسی کا مواخذہ نہیں کریں گے
کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ظن سے کام لے کر
حکم لگانے پر ہمیں منع کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے
"بدگمانی سے بچو۔ کیونکہ بدگمانی گناہ ہے۔"
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔
"بدگمانی سے بچو اس لئے کہ اس سے بڑھ کر
جھوٹ کوئی نہیں"! خدا تعالیٰ فرماتا ہے
جس بات کا تمہیں علم نہیں۔ اس کے پیچھے
نہ پڑو"! ایک اور موقعہ پر فرمایا۔ "جب
تمہارے پاس مہاجر عورتیں آئیں۔ تو ان کے
احوال کی پڑتال کرو ایمان کی نہیں، کیونکہ
اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ اس
سے معلوم ہوا، کہ ان کے ضمائر اور اعتقاد
کی حقیقت یعنی کنہ مت جانچو۔ مقصود

تعالیٰ (ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومنا) وذلک عموم فی جمیع الکفار وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاسامۃ بن زید حین قتل الرجل الذی قال لا الہ الا اللہ فقال انما قالہا متعوذاً قال ھلا شققت عن قلبہ[1]

صرف یہ ہے کہ ان کے ظاہرا ایمان کو مان لیں (یعنی ایمان بالقول) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ احکام دنیا میں ضمیر کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ صرف قول (اعتراف) کا اعتبار کیا جاتا ہے چنانچہ خدا فرماتا ہے "جو تمہیں (مسلمانوں کی طرح) اسلام کرے۔ اس سے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اور یہ ہدایت تمام کفار کے بارے میں عام ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زید سے جبکہ انہوں نے ایک ایسے شخص (کافر) کو قتل کر دیا تھا۔ جو زبان سے لا الہ الا اللہ کہہ رہا تھا۔ خدا سے پناہ مانگتے پوچھا۔ کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا

کیا یہ قرآنی ہدایت فیصلہ کن نہیں ہے؟

ذبیحہ کا مسئلہ

اسلام چھوت چھات کا قائل نہیں ہے۔ وہ انسانیت کے مجد و شرف کا قائل ہے۔ اختلاف عقاید، اختلاف خیال اور اختلاف دین بھی اس کی نگاہ میں انسان کو انسانیت کے درجہ سے ساقط نہیں کرتا۔ وہ پاکی اور پاکیزگی کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص نہیں کر لیتا۔ دوسروں کی بھی پاکی تسلیم کرتا ہے۔ اگرچہ دین و مذہب کے معاملہ میں ان دوسروں کا مسلک کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ دوسرے مذاہب میں اور خاص طور پر ہندوؤں میں تو یہ رواداری بالکل عنقا ہے۔ ان کے

---

[1] احکام القرآن۔ ج ۲ ص ۳۵۱

چھوت چھات کو مذہبی حیثیت حاصل ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھا سکتے۔ بلکہ اپنے ہم مذہبوں میں سے بھی دوسری ذاتوں کے ہاتھ کا بالعموم اور اچھوتوں یعنی نچلے طبقے کے ہاتھ کا بالخصوص نہیں کھا سکتے۔ لیکن اسلام اس معاملہ میں پوری فیاضی اور رواداری کا برتاؤ کرتا ہے۔ وہ عام کھانا تو الگ رہا۔ غیر مسلموں کے ذبیحہ تک کی اجازت دے دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے۔

وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم — اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں۔

روی عن ابن عباس وابی الدرداء والحسن ومجاہد وابراہیم وقتادة والسدی انہ ذبائحھم وظاھرہ یقتضی ذلک لان ذبائحھم من طعامھم ولو استعملنا اللفظ علی عمومہ لانتظم جمیع طعامھم من الذبائح وغیرھا والاظھر ان یکون المراد الذبائح خاصة[1]

ابن عباس۔ ابو درداء۔ حسن۔ مجاہد ابراہیم قتادہ اور سدی سے مروی ہے۔ کہ اس آیت میں طعام سے مراد غیر مسلموں کا ذبیحہ ہے۔ اور ظاہر کلام سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ذبائح اور طعام لازم ملزوم ہیں۔ اور اگر اس لفظ کا ہم عمومی اطلاق کریں۔ تو تمام کھانے جن میں ذبائح وغیرہ بھی شامل ہیں۔ حلال ماننا پڑیں گے۔ لہذا ظاہر تر بات یہ ہے۔ کہ اس جگہ طعام سے مراد ذبیحہ ہے۔

رسولؐ کی مثال

اپنے اس دعوے کی دلیل میں علامہ جصاص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۹۲

مثال پیش کرتے ہیں جس سے ہر قسم کا شک و شبہ رفع ہو جاتا ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودیہ
اکل من الشاۃ المسمومۃ المشویۃ	ہدیہ کیا ہوا بکری کا بھنا گوشت جس میں
التی اھدتہ الیہ الیہودیۃ ولم یسئلھا	ملا دیا گیا تھا۔ کھا لیا۔ اور اس سے یہ نہیں
عن ذبیحتھا امی من ذبیحۃ المسلم	فرمایا کہ اسے مسلمان نے ذبح کیا تھا یا
ام الیہودی[1]	یہودی نے؟

اہل کتاب کے ذبیحہ کے بارے میں یہ اتنی واضح مثال ہے کہ اس کے بعد کسی طرح کا شک و شبہ اس کے جواز اور حلت کے بارے میں پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔

اہل کتاب اور مشرک

اسلام توحید کا مذہب ہے۔ وہ شرک کو گوارا نہیں کرتا۔ وہ جب نمودار ہوا تو یہ دنیا ایک بتکدہ بنی ہوئی تھی۔ مٹی کے بنے ہوئے بت بھی تھے۔ اور عقاید کی گمراہیوں کے اصنام خیالی بھی موجود تھے۔ اس نے پوری قوت اور شدت کے ساتھ ان بتوں پر ضرب لگائی۔ اس لئے کہ وہ اس معاملہ میں کوئی مفاہمت نہیں کرسکتا۔ یہ ایسا اصول جس میں ذرا بھی لچک نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ مشرکین کو بھی انسانی حقوق سے محروم نہیں کرتا۔ اگرچہ اہل کتاب کے ساتھ مشرکوں کی بہ نسبت زیادہ فیاضی اور رواداری کا اظہار کرتا ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں اور اہل کتاب میں ایک چیز بہرحال قدر مشترک ہے۔ وہ ہے "کتاب الٰہی"۔ یعنی اہل کتاب اگرچہ گمراہ ہوچکے۔ کتاب الٰہی کو فراموش کرچکے اس میں تحریف اور تغلیط کے مرتکب بھی ہوچکے۔ لیکن بہرحال یہ وہ لوگ ہیں جن پر کتاب الٰہی نازل ہوچکی ہے۔ یہ خدا کو مانتے ہیں۔ یہ مشرکوں کے مقابلہ میں زیادہ خدا ترس ہوتے ہیں۔ یہ بتوں کو اور دیویوں کو نہیں پوجتے۔ خدا کو مانتے اور اسی کو پوجتے ہیں۔ ا

---

[1] احکام القرآن۔ ج ۲ ص ۳۲۱

لے مشرکوں کے مقابلہ میں اسلام ان کے ساتھ زیادہ مراعات کرتا ہے۔

ہمیں واضح طور پر یہی معلوم ہے۔ کہ یہودی اور عیسائی اہل کتاب ہیں۔ مجوس۔ صابئین اور ہنود وغیرہ کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کہ آیا یہ بھی اہل کتاب ہیں یا نہیں؟ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

وھذا کتاب انزلناہ مبارک فاتبعوہ واتقوا لعلکم ترحمون ○ ان تقولوا انما انزل الکتاب علی طائفتین من قبلنا۔

یہ وہ مبارک کتاب ہے۔ جسے ہم نے نازل کیا۔ پس اس کی پیروی کرو۔ اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور یہ کہو (اے ہم سے قبل دو گروہوں (عیسائی اور یہودی) پر یہ کتاب نازل کر چکا ہے۔

علامہ جصاص اس آیت پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فاختلف فی المجوس فقال جل السلف واکثر الفقھاء لیسوا اھل الکتاب وقال آخرون ھم اھل الکتاب وقائلون بذلک شواذ والدلیل علی انھم لیسوا اھل الکتاب قولہ تعالیٰ (وھذا کتاب.... الخ) فاخبر تعالیٰ ان اھل الکتاب طائفتان فلو کان المجوس اھل الکتاب لکانوا ثلاث طوائف[1]

مجوس کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہ یہ اہل کتاب ہیں یا نہیں؟ سلف کا ایک بڑا گروہ اور اکثر فقہا یہ مسلک رکھتے ہیں کہ مجوس اہل کتاب نہیں ہیں۔ اور بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں۔ کہ مجوس بھی اہل کتاب ہیں۔ لیکن جو لوگ انہیں اہل کتاب مانتے ہیں۔ وہ بہت کم ہیں۔ اور ان کے اہل کتاب نہ ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ خدا نے جن اہل کتاب گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تعداد دو بتائی ہے تین نہیں۔

---

[1] احکام القرآن۔ ج ۳ صفحہ ۱۱

یہ تو ایک علمی اور لفظی بحث تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ان لوگوں کو بھی، جو واضح طور پر اہل کتاب نہیں تھے۔ آنحضرتؐ نے اہل کتاب کے زمرہ میں شامل فرمایا ہے۔ یعنی ان کے ساتھ وہی سلوک مرعی رکھا ہے۔ جو اہل کتاب کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ جصاص مجوس کے بارے میں یہ ثابت کر چکنے کے بعد کہ وہ قطعاً اہل کتاب نہیں تھے یہ مانتے ہیں کہ رسول اللہ صؐ نے ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک مرعی رکھا۔

فان المجوس لا ينتحلون شيئًا من كتب الله المنزلة على انبيائه وانما يقرءون كتاب زرداشت وكان متنبيًا كذابًا فليسوا اذا اهل الكتاب ويدل على انهم ليسوا اهل الكتاب حديث يحيى بن سعيد عن جعفر بن محمد عن ابيه قال قال عمر ما ادرى كيف اصنع بالمجوس وليسوا اهل الكتاب فقال عبد الرحمن بن عوف سمعت رسول الله م يقول سنوا بهم سنة اهل الكتاب. فصرح عمر رض بانهم ليسوا اهل كتاب ولم يخالفه عبد الرحمن ولا غيره من الصحابة وروى عبد الرحمن بن عوف عن النبيؐ انه قال سنوا بهم سنة اهل

بلاشبہ مجوس، اللہ کی ان کتابوں کو نہیں مانتے جو انبیاء پر نازل ہوئی تھیں، وہ زردشت کی کتاب کو مانتے ہیں، جو مدعی نبی اور جھوٹا تھا۔ لہذا یہ لوگ اہل کتاب نہیں ہو سکتے۔ اور ان کے اہل کتاب نہ ہونے پر یہ حدیث دلیل ہے، یحییٰ بن سعید جعفر بن محمد سے وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ کہ حضرت عمرؓ نے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجوس کے ساتھ کیا برتاؤ کروں، کیونکہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں۔ اس پر عبد الرحمن بن عوف نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے۔ کہ ان کے ساتھ وہی طریقہ برتو جو اہل کتاب کے ساتھ برتتے ہو۔ گویا ان کے اہل کتاب نہ ہونے کا ذکر عمر رض نے کیا۔ اور عبد الرحمن اور دوسرے صحابہ نے اس قول کی مخالفت نہیں کی

الکتاب فلو کانوا اهل الکتاب لما قال سنوا بهم سنة اهل الکتاب ولقال هم من اهل الکتاب وفی حدیث آخر انه اخذ الجزیة من مجوس هجر وقال سنوا بهم سنة اهل الکتاب [1]

عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا مجوس کے ساتھ اہل کتاب کا سا برتاؤ کرو۔ اگر یہ اہل کتاب ہوتے تو آپ صلعم یہ کیوں فرماتے کہ ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کرو۔ بلکہ آپ صلعم فرماتے۔ یہ بھی اہل کتاب ہیں۔ ایک دوسری حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلعم نے اہل کتاب کی طرح اہجر کے مجوس سے جزیہ قبول فرمایا۔ اور فرمایا ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کرو۔

گویا یہ طے ہو جانے کے باوجود کہ مجوس "اہل کتاب" نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ سلوک اہل کتاب کا سا کیا گیا۔ اس اسوۂ نبوی صلعم کی روشنی میں ہندوؤں، بدھوں وغیرہ کے بارے میں بھی حالات و مصالح کے پیش نظر غور کر کے کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے :

مشرک اور اہل کتاب میں امتیاز

جب دونوں میں ترجیح کا وقت آجائے۔ تو پھر بے تامل اسلام اہل کتاب کو مشرکین پر ترجیح دیتا ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتب الی صاحب الروم "یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم ـــ !" وکتب الی کسریٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہ روم کو لکھا "۔ اے اہل کتاب آؤ ہم اس کلمہ پر جمع ہو جائیں۔ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے ـــــ !" اور کسریٰ کو جو

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۲۴

ولم ینسبہ الی کتاب وسرو ری فی قولہ تعالیٰ (الم غلبت الروم) الٰی المسلمین احبوا غلبۃ الروم لانھم اھل الکتاب واحبت قریش غلبۃ فارس لانھم جمیعاً لیسوا باھل الکتاب[1]

مکتوب تحریر فرمایا۔ اسے کسی کتاب الٰہی کی طرف منسوب نہیں کیا۔ قرآن مجید میں غلبۂ روم کے بارے میں جو آیت ہے۔ اس کے بعد مسلمان روم کی فتح چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ اہل کتاب تھے اور قریش غلبۂ فارس کے متمنی تھے اس لئے کہ وہ سب کے سب اہل کتاب نہیں تھے

اسی طرح صابئین وغیرہ کے معاملہ پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کی رواداری، وسعت ظرف اور انسانیت نوازی کی یہ انتہا ہے۔ کہ اس نے ان لوگوں کو بھی اہل کتاب کے زمرہ میں شامل کر لیا۔ جو واضح طور پر اہل کتاب نہیں تھے۔ اور ان کے ساتھ وہی حسن سلوک مرعی رکھا۔ جو اہل کتاب کے ساتھ از روئے نص رکھنے پر مجبور تھے۔ حالانکہ اگر ان کے دل رواداری کا نشیمن نہ ہوتے۔ تو ان کے لئے یہ عذر بہت کافی تھا۔ کہ چونکہ مجوس اہل کتاب نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ وہ برتاؤ کبھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر وہ ایسا کرتے تو کوئی بھی ان پر معترض ہونے کا حق نہیں رکھتا تھا!

---

[1] احکام القرآن مطبوعہ مصر ج ۲ صـ ۱۰۱

مسئلہ ارتداد

تشریع اسلامی کا ایک مہتم بالشان مسئلہ

اب ہم ایک اور بہت اہم اور بہت بڑے مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہے ارتداد کا ———— یعنی جو شخص ایک مرتبہ اسلام قبول کر کے اس سے منحرف ہو جائے۔ اور پھر سابقہ مذہب یا کسی دوسرے مذہب کو اختیار کر لے اسلام اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرتا ہے؟

کوئی شبہ نہیں یہ بہت ہی اہم اور نازک مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق دو رائیں دلائل کی کمک کے ساتھ بڑی سختی سے موجود ہیں۔

۱۔ ایک رائے یہ ہے کہ مرتد کی سزا اسلام نے قتل رکھی ہے۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اسلام مرتد کے لئے کوئی سزا تجویز نہیں کرتا۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ میں ان دونوں آراء کے درمیان کوئی محاکمہ کروں!

یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے!

میں اس بحث میں بھی نہیں پڑنا چاہتا۔ کہ قتل مرتد کے جواز کے سلسلہ میں جو دلیلیں قائم کی گئی ہیں وہ مضبوط ہیں یا کمزور؟ احادیث سے اس مسئلہ میں جو استنباط و استخراج کیا جاتا ہے۔ اس کی نوعیت کیا ہے؛ اور فقہ اسلامی نے اس سلسلہ میں جو مسلک اختیار کیا ہے وہ کس حد تک مبرہن ہے؟ میں یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ جو لوگ قتل مرتد کے قائل نہیں ہیں۔ اور دورِ نبوی یا خلافت راشدہ کی مثال طلب کرتے ہیں انہیں مطمئن کیا گیا یا نہیں؟ اس لیے کہ اگر ان مباحث پر میں گفتگو کروں۔ تو بحث کو پھیلانے اور سمجھنے کے لیے کئی ضخیم مجلدات کی ضرورت ہو گی۔ اور موجودہ حالات میں اس کا تحمل امکان نہیں۔ بہرحال ایک مابہ النزاع مسئلہ کو میں از سرِ نو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ البتہ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا ذکر نظر انداز بھی نہیں کر سکتا۔

آیات قرآنی کا جہاں تک تعلق ہے۔ وہ اس معاملہ میں بالکل صاف ہیں۔ ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جو قتل مرتد کی ترغیب دیتی ہو یا اسے جائز قرار دیتی ہو؟ اس سلسلہ میں واقعہ ردہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ واقعہ ردہ اگرچہ قرآن کی کوئی تفسیر نہیں۔ نہ اجمال قرآنی کی اسے تفصیل قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اس باب کے آخر میں اس کے بعض پہلوؤں کو میں زیر بحث لاؤں گا!

سب سے پہلے ہمیں آیات قرآنی پیش نظر رکھنی چاہئیں؛

سعیٔ ارتداد

جو لوگ اسلام کی دعوت حق قبول کر رہے تھے۔ یدخلون فی دین اللہ افواجاً اور خدا کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے تھے۔ ان کا یہ فعل کفار کی نظر میں بری طرح کھٹکتا تھا۔ وہ خود بھی اسلام قبول نہیں کرتے تھے۔ اور یہ بھی گوارا نہ تھا۔ کہ کوئی دوسرا اسلام قبول کر لے۔ جن لوگوں کو وہ دعوتِ اسلام پر لبیک کہتے ہوئے دیکھتے تھے۔ ان کے بارے

میں یہی سوچا کرتے تھے کہ کاش یہ لوگ کسی طرح اسلام ترک کرکے پھر اپنا آبائی دین اختیار کرلیں۔

سورۂ بقر میں قرآن اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ودّ کثیر من اهل الکتاب لو
یردّونکم من بعد ایمانکم کفارًا حسدًا
من عند انفسهم من بعد ما تبیّن
لهم الحق حتّٰی یاتی اللّٰه بامره ان
اللّٰه علی کل شئ قدیر ہ

(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب باوجودیکہ ان پر
حق ظاہر ہوچکا ہے (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی
وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے
بعد پھر تم کو کافر بنادیں۔ یہاں تک کہ خدا اپنا
(کوئی اور) حکم صادر کرے۔ بے شک اللہ ہر
چیز پر قادر ہے۔

یہ اشارہ ہے کفار کی سعی ارتداد کی طرف، قرآن اس واقعہ کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہ نہیں فرماتا۔ کہ ان کے بہکاوے میں آکر جو لوگ اسلام سے منحرف ہوجائیں گے۔ وہ قتل کردیئے جائیں گے ——— البتہ اپنے "حق" ہونے پر اصرار ضرور کرتا ہے۔ اور یہ وہ دعویٰ ہے۔ جس سے وہ کسی حالت میں بھی دستبردار نہیں ہوسکتا۔

ایک دوسری آیت

اسی سلسلہ میں سورۂ بقر کی ایک دوسری آیت ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ اس سے صورت مسئلہ اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے

ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردّوکم
عن دینکم ان استطاعوا ومن یرتدد
منکم فیمت وهو کافر فاولٰئک
حبطت اعمالهم فی الدنیا والاٰخرة
واولٰئک اصحاب النار هم فیها خالدون ہ

(یہ کفار) ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں
تک کہ اگر ان کا بس چلے۔ تو تم کو تمہارے دین
سے برگشتہ کردیں۔ اور جو تم میں اپنے دین سے
برگشتہ ہوگا۔ اور کفر ہی کی حالت میں مرے گا
تو ایسے لوگوں کا کیا کرایا دنیا و آخرت دونوں

جگہ اکارت جائے گا۔یہی اہل دوزخ ہیں۔اور
ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔

اس آیت میں خدا نے بتایا ہے۔کہ جو شخص ان رکفار کے کہنے میں آئے گا۔اور دین اسلام سے برگشتہ ہو جائے گا۔اس کا کیا حشر ہو گا؟
یہ نہیں فرمایا کہ وہ قتل کر دیا جائے گا۔ارشاد ہوا کہ دین و دنیا میں اس کے اعمال و افعال اکارت جائیں گے۔اس نے جو نیکیاں اور اچھائیاں اب تک کی تھیں۔وہ اس بدی اور برائی سے مغلوب ہو جائیں گی۔اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو کر خدا کے حضور میں حاضر ہو گا تو اسے جہنم کی سزا ملے گی۔اس لئے کہ اس نے حق کو قبول کیا۔پھر اس سے منحرف ہو گیا۔دنیا دارالعمل ہے اور عقبیٰ دارالجزا ہے یہاں اس نے جو کچھ بویا تھا۔وہاں وہ کاٹے گا۔اور اپنے انجام کو پہنچے گا ——— اس آیت میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ ارتداد کی سزا قتل ہے۔جو شخص مسلمان ہو کر پھر اپنا آبائی مذہب اختیار کرے گا۔وہ ہلاک کر دیا جائے گا:

ہدایت سے انکار

اب تک مرتدین کا ذکر صیغہ مستقبل یا حلقہ امکان میں تھا یعنی اگر وہ ایسا کریں تو .... یہ ہو گا یا ایسا ہو گا!

لیکن ذیل کی آیت میں خدا صاف طور پر ان لوگوں کا ذکر فرما رہا ہے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔اور پھر اس سے منحرف ہو گئے۔ارشاد ہوا (سورہ آل عمران)

كيف يهدى الله قوما كفروا بعد ايمانهم وشهدوا ان الرسول حق وجاءهم البينات والله لا يهدى القوم الظالمين	خدا ایسے لوگوں کو کیوں ہدایت دینے لگا جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔حالانکہ وہ اقرار کر چکے تھے۔کہ پیغمبر برحق ہے۔اور ان کے پاس اس کے کھلے ثبوت بھی آ چکے۔اور اللہ ایسے ہٹ دھرم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ جو لوگ اسلام قبول کر کے اس سے منحرف ہوں وہ اب خدا سے ہدایت اور راہ یابی کی توقع نہ رکھیں۔ خدا ان لوگوں کو ہدایت نہیں دے گا جو کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں ——— اس آیت سے بھی قتل مرتد کی کوئی نشاندہی کسی طرح کی نہیں ملتی۔ البتہ آگے چل کر یہ فرمایا ہے کہ ان کے اس فعل کی جزا یہ ہے کہ وہ اللہ ملائکہ مقربین اور سمجھ دار انسانوں کی لعنت، اور پھٹکار کے مستحق ہوں گے۔

چنانچہ فرمایا:-

اولئك جزاؤهم ان عليهم لعنة الله والملئكة والناس اجمعين

ان کی جزا یہ ہے۔ کہ ان پر خدا کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی پھٹکار ہو گی!

پھر اور آگے چل کر ارشاد ہوا

خالدين فيها لا يخفف عنهم العذاب ولا هم ينظرون

یہ ہمیشہ اسی (پھٹکار) میں رہیں گے۔ نہ تو ان سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔ اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس کفرانِ نعمت کی جو جزا یا سزا مقرر کی ہے وہ یہ ہے۔

۱۔ جو لوگ اسلام قبول کر کے اس سے منحرف ہو کر ہٹ دھرمی کا ثبوت دیں گے۔ ان پر خدا اور فرشتوں کی لعنت ہو گی۔

۲۔ یہ ہمیشہ اسی لعنت میں گرفتار رہیں گے۔

۳۔ ان کو جہنم کی سزا ملے گی۔

۴۔ عذاب جہنم ہلکا نہیں کیا جائے گا۔

۵۔ انہیں کسی قسم کی مہلت نہیں دی جائے گی۔

ان آیات سے یہی پانچ باتیں مترتب ہوتی ہیں۔ کسی آیت سے بھی یہ نہیں ثابت ہوتا

کہ ایسے لوگوں کو آخرت کے بجائے یہیں اسی دنیا میں سزا دی جائے اور ہلاک کر دیا جائے۔
بے شک مرتدین کے لئے قرآن نے بڑے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں
اور یہ اپنے کرتوت کے باعث اس کے مستحق بھی ہیں۔ ———— لیکن وہ کسی کی آزادی
ضمیر و عقیدہ پر پہرہ نہیں بٹھانا چاہتا تھا۔ وہ کہہ چکا

لکم دینکم ولی دین — تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے
میرا دین۔

اسی نے یہ بھی فرمایا

لا اکراہ فی الدین — دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ روا نہیں

پھر وہ ایک شخص کو جو خواہ کتنا ہی غلط کار اور گمراہ ہو۔ دنیاوی عدالت کے حوالے نہیں کر سکتا۔ مرتد اپنے نفس کو اور خدا کو دھوکا دیتا ہے۔ خدا اس سے سمجھ لے گا وہ بندوں کو اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ وہ مرتد کو واجب القتل قرار دیں۔ اور اس کی گردن اڑا دیں۔

معافی کی صورت

آگے چل کر اسی سورہ میں قرآن نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ مرتدین کو عذاب اور عتاب الٰہی اور ملائکہ کی لعنت سے نجات کیوں کر مل سکتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

الا الذین تابوا من بعد ذلك — مگر جن لوگوں نے ایسا کرنے کے بعد توبہ کی
و اصلحوا فان اللہ غفور رحیم ۵ — اور (اپنی) اصلاح کر لی۔ تو اللہ بخشنے والا
مہربان ہے۔

یعنی اگر
۱۔ توبہ کر لی جائے
۲۔ اصلاح احوال کر لی جائے۔

تو ایسے مرتدین پھر مسلمان بن سکتے ہیں؟

ایک اور آیت

اسی سورہ میں آگے چل کر فرمایا

الا الذین کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفرا لن تقبل توبتھم واولٰئک ھم الضالون ٥

جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے اور ان کا کفر بڑھتا چلا گیا تو ایسوں کی توبہ کبھی قبول نہ ہوگی اور یہ لوگ گمراہ ہیں۔

یعنی جو لوگ توبہ کر کے پھر اس سے منحرف ہوں۔ ان کے لئے اب توبہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ لیکن ایسے لوگوں کے قتل کا حکم نہیں صادر ہوا۔

مسلمانوں کی دل دہی

جو لوگ اسلام لا کر اس سے منحرف ہو جاتے تھے ——————— اور زیادہ تر یہ وہ لوگ تھے جو اسلام قبول ہی اس لئے کرتے تھے کہ بعد میں منحرف ہو کر مسلمانوں میں بددلی پیدا کریں ——————— تو قدرتاً مسلمانوں کو اس سے صدمہ پہنچتا تھا چنانچہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے سورہ مائدہ میں ارشاد فرمایا:۔

یاایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللّٰہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللّٰہ ولا یخافون لومۃ لائم ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ واسع علیم ٥

مسلمانو! تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے۔ تو خدا ایسے لوگ موجود کر دے گا جن کو وہ دوست رکھتا ہو گا۔ اور جو اس کو دوست رکھتے ہوں گے مسلمانوں کے ساتھ نرم کافروں کے ساتھ کڑے (اپنی حفاظت کرنے اور ان کے حملے روکنے میں) (اور جو) خدا کی راہ میں کوشش کریں گے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا (کچھ) خوف نہیں رکھیں گے یہ خدا کا (ایک) فضل ہے جس کو چاہے

دے۔ خدا بڑا ہی وسعت والا اور علیم ہے

یہ ہیں قرآن کریم کی وہ آیتیں جن میں ارتداد کا، سعی ارتداد کا اور مرتدین کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی آیت میں اشارۃً بھی قتل مرتد کا حکم نہیں دیا گیا لہذا قرآن کا جہاں تک تعلق ہے وہ قتل مرتد کی اجازت دیتا ہے نہ شہادت!

مرتد یا مفسد؟

آیات بالا کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام چونکہ آزادی فکر و عقیدہ پر کوئی قدغن نہیں قائم کرتا۔ اور جبری تبدیل مذہب کا قائل نہیں۔ اس لئے وہ دنیا میں مرتد کو کسی قسم کی سزا اسلامی حکومت سے نہیں دلواتا لیکن جو لوگ حق سے اعراض کریں اسے نہ مانیں یا مانیں اور مان کر ترک کر دیں۔ وہ عذاب و عتاب خداوندی سے نہیں بچ سکتے۔

جس طرح ایک کافر اسلام نہ قبول کرنے کی سزا آخرت میں پائے گا اور اس سزا سے نہیں بچ سکے گا لیکن دنیا میں اس کی آزادی رائے سلب نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح ایک مرتد بھی اگرچہ دنیا میں اپنی آزادیٔ رائے سے متمتع ہو سکے گا لیکن آخرت میں اس کفران کی سزا اسے ضرور ملے گی۔

لیکن مفسد کی صورت دوسری ہے۔ وہ ایک بہت بڑے فتنہ کا سبب بنتا ہے اس کی فساد انگیزی ملک کے امن و امان کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ لہذا اس کے لئے قتل سے بھی بڑی اگر سزا تجویز کی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ؛

واقعۂ ردّہ

اب ہم واقعہ ردّہ پر بحث کرتے ہیں :۔

قتل مرتد کے جواز میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد بعض قبائل عرب مرتد ہو گئے تھے۔ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور حضرت

ابوبکر رضؓ نے فرمایا تھا۔ خدا کی قسم اگر یہ رسول اللہ کے زمانے میں رسّی کا ایک ٹکڑہ بھی دیتے تھے۔ اور اب انکار کرتے ہیں۔ تو میں ان سے جہاد کروں گا۔

اس مسئلہ پر ہمیں بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے۔ کہ اگر وہ لوگ مرتد ہو گئے تھے یعنی اسلام سے پھر گئے تھے تو زکوٰۃ دینے سے انکار کیوں کیا؟ زکوٰۃ غیر مسلموں پر نہیں صرف مسلمانوں پر فرض ہے۔ لہٰذا حضرت ابوبکر رضؓ کسی غیر مسلم سے زکوٰۃ وصول کرنے کے مجاز نہیں تھے۔

اصل بات

اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ مرتد نہیں مفسد تھے۔

مرتد ہوتے تو اسلام سے ترک تعلق کر کے اپنے آبائی دین کو اختیار کرتے! مفسد تھے اس لئے انہوں نے یہ کہا۔ کہ ہم نماز پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے!

مرتد کو مسلمان اس لئے گوارا کر لیتے۔ کہ وہ مرتد ہو کر اسلامی معاشرہ سے خارج ہو جاتا۔ اور مفسد کو اس لئے نہیں گوارا کر سکے۔ کہ وہ اسلامی معاشرہ میں رہتے ہوئے اسلام کے نظام، اسلام کی تعلیم، اسلام کے اصول میں خلل انداز ہو رہے تھے۔ ایک مرتد کسی طرح بھی مسلمانوں کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک مفسد ان کی زندگی کا نظام ہو سکتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضؓ نے مرتدین کے خلاف نہیں۔ درحقیقت مفسدین کے خلاف جہاد کیا۔ اور اس طرح اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔

اور دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جنہوں نے ترک اسلام کا اعلان تلوار کی جھنکار کے ساتھ کیا تھا یعنی اگر یہ لوگ صرف دین اسلام ترک کر دیتے۔ اسلام اور مسلمانوں کے درپے آزار نہ ہوتے۔ تو کوئی وجہ نہیں تھی۔ کہ خلافت اسلامیہ ان سے حرب و پیکار کے لئے تیار ہوتی لیکن ان کا ارتداد فتنہ و فساد کا علمبردار تھا۔ یہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ مرتد بنانا چاہتے تھے

یہ اسلام کے رسوخ اور اثر کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ یہ توحید کے دشمن بن گئے
چاہتے تھے۔ کہ کفر و شرک کی سلطانی پھر سے قائم ہو جائے۔ انہوں نے ترک اسلام کا
وقت منتخب کیا تھا۔ آنحضرتؐ کے وصال سے مسلمان مضطرب و پریشان تھے ان کی
کہ اس اضطراب سے فائدہ اٹھائیں ترک اسلام ہی پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ خدانخواستہ
استیصال کی سعی و کوشش کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوشش بغاوت تھی۔ فساد تھی، شرارت تھی
کا جواب تلوار ہی سے دیا جا سکتا تھا اور دیا گیا۔ اور یہ جواب ہمیشہ اور ہر دور میں دیا جائے

بہر حال قرآن کا نقطۂ نظر سامنے آگیا ——————— اور اس وقت
گفتگو یہی تھا!

مرتد کی توبہ

مرتد کے بارے میں فقہا کا اور بعض علمائے سلف کا مسلک یہ ہے کہ وہ
میں قتل کر دیا جائے گا، یہاں تک کہ اگر توبہ کرلے تو بھی اس کی زندگی نہیں بچ سکتی
زانی توبہ کے باوجود سنگسار کر دیا جائے گا۔ ایک قاتل توبہ کے باوجود قصاص سے نہیں بچ
اس لئے کہ بعض جرائم ایسے ہوتے ہیں۔ جو توبہ سے ۔ اور ا ہوتے ہیں۔ اور جن کا مجرم کیفرِ
پہنچنے پر مجبور ہے۔ مرتد کے بارے میں علمائے اسلام کا ایک بڑا گروہ اس کا قائل
کہ اسے قتل کر دینا چاہیئے۔ یہ لوگ کافروں اور مشرکوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ
برتتے ہیں۔ لیکن مرتد کے بارے میں ان کا رویہ سخت ہو جاتا ہے۔ توبہ کے بعد
مغفور ہو سکتا ہے۔ لیکن عند الناس تو اسے سزا ملے گی۔ جن بزرگوں کا یہ مسلک ہے
اخلاص اور دیانت محکِ شک و شبہ سے بالا ہے۔ جو عقلی اور نقلی دلیلیں وہ دیتے ہیں
بھی وزنی ہیں۔ لیکن قرآن کریم اور اسوۂ رسول کو کھنگالنے کے بعد ذاتی طور پر مجھے
اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قتل مرتد نہیں ہاں قتل مفسد ضرور
یعنی اگر کوئی شخص صرف اسلام سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ تو اسلام کو اس کی کوئی

اسلام اس سے بے نیاز ہے۔ وہ جس مذہب پر چاہے عمل کرے۔ اسلام کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن اگر وہ اسلام ترک کرنے کے بعد مفسدہ پردازی پر اتر آتا ہے (جیسا کہ اکثر ہوا) تو بلا شبہ وہ سزا اور تعزیر کا مستحق ہے۔ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں۔ اس کی دلیل بھی رکھتا ہوں۔

وقد روی عن ابن عباس فی المرتد الذی لحق بمکة وکتب الی قومه سلوا رسول الله صلی الله علیه وسلم هل لی من توبته؟ فانزل الله وکیف یهدی الله قوماً کفروا بعد ایمانهم الی قوله تعالی الا الذین تابوا من بعد ذلک واصلحوا فکتبوا بها الیه فرجع فاسلم فحکم له بالتوبة بما ظهر من قوله فوجب استعمال ذلک والحکم له بما یظهر منه دون ما فی قلبه[1]

ابن عباس سے روایت ہے۔ کہ ایک مرتد مکہ میں آگیا۔ اس نے اپنے لوگوں کو لکھا۔ کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرو کہ میری توبہ قبول ہو جائے گی؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ ان لوگوں کو کیونکر ہدایت دے سکتا ہے۔ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہوں؟ سوائے ان لوگوں کے جو تائب ہو جائیں۔ اور اپنی زندگی میں اصلاح کریں۔ چنانچہ ان لوگوں نے اسے یہ لکھ دیا۔ وہ واپس آگیا اور اسلام قبول کر لیا۔ آپ ﷺ نے اسے توبہ کی ہدایت فرمائی بنا بر قول کے سلسلہ میں۔ کیونکہ کفر ظاہر کے بعد توبہ واجب ہو گئی تھی اور حکم شریعت بھی ہے کہ حکم ظاہر پر لگایا جائے گا۔ نہ کہ مکنونات قلب پر۔

بنیادی بات

اس سلسلہ میں اصل اور بنیادی چیز یہ ہے۔ کہ اسلام حریت فکر و خیال کا حامی ہے صرف تبدیل مذہب اس کے نزدیک کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ اگر کوئی شخص راہ یاب ہونے کے بعد گمراہی کو ترجیح دیتا ہے۔ تو وہ اس کا مجاز ہے۔ اگر کچھ بگڑے گا تو اس کا۔ اسلام

[1] احکام القرآن ج ۲ صہ ۲۸۱

کمایا اسلام کے خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چنانچہ دورِ اول میں جن مرتدین کو سزائے قتل دی گئی۔ ان کا کیس منظر دراصل تلاش و تفحّص کے بعد تلاش کر لیا جا سکتا ہے۔ جو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ارتداد نے جب بغاوت، سازش، افساد اور تخریب کی صورت اختیار کر لی۔ تو اس کا جواب تلوار سے دینا ناگزیر ہو گیا۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ افساد اور تخریب کا جواب رواداری اور شفقت سے نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ہو سکتا ہے۔ اور اسلام اس کی تعلیم دیتا ہے۔ کہ تشدد میں بے انصافی نہ ہونے پائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ نہ ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ اگر کوئی ایک طمانچہ مارے تو دوسرا گال پیش کر دے۔ کوئی تیری جیب پر ہاتھ ڈالے تو اسے اپنا لبادہ بخش دے۔

غیر مذہب کی عورتیں

کیا اسلام اُن سے نکاح کی اجازت دیتا ہے؟

ایک بہت ہی اہم سوال یہ ہے کہ کیا اسلام غیر مذہب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دیتا ہے؟ اور اگر یہ بات جائز ہے، تو کیا جس طرح مسلمان مرد، غیر مذہب کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں، کیا مسلمان عورتیں بھی، اپنے خیار بلوغ سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلم مردوں سے شادی رچا سکتی ہیں؟ اگر جواب انکار میں ہے اور یقیناً انکار میں ہے تو کیا یہ بات ناانصافی پر مبنی نہیں ہے، حالانکہ اسلام نہ صرف "عدل" کا بلکہ احسان تک کا حکم دیتا ہے۔ ان اللّٰہ یامرکم بالعدل والاحسان اور کیا مسلمان کے لئے غیر مسلم عورت سے شادی کی اباحت اور مسلمان عورت سے غیر مسلم مرد کی حرمت، غیر مسلموں پر ایک کھلا ہوا طعن نہیں ہے؟ کیا ان کی توہین نہیں ہے؟ کیا یہ طرز عمل، عدل اور مساوات انسانی کے منافی نہیں ہے؟ اگر ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ ہے تو کیا اسلام کے لئے یہ بات جائز ہو سکتی ہے جو انسانی مجد و وقار کا علمبردار ہے۔ جس کے دربار میں تمام انسانوں سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں یکساں سلوک کا دعوئے کیا

جاتا ہے؟

بلاشبہ ان سوالات کو اور ان سوالات سے پیدا شدہ تفریعات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر یہ بات ثابت ہوجائے کہ وہ اسلام جو دین و مذہب کے بارے میں تو لا اکراہ فی الدین کا چارٹر انسانیت کو عطا فرماتا ہو اور جو لکم دینکم ولی دین کا اصول پیش کرکے انسان کے حق آزادی فکر و رائے کو بغیر کسی ذہنی تحفظ (MENTAL RESERVATION) کے تسلیم کرتا ہو۔ اور جو بار بار اپنے پیغمبر ص کو تسکین و تسلی دیتا ہو۔ کہ لوگوں کے مسلمان نہ ہونے سے تم دل برداشتہ نہ ہو۔ تمہارا کام تو صرف یہ ہے کہ لوگوں تک ہمارا پیام پہنچا دو اور بس نتائج کی تمہیں کوئی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کس نے سنا اور کس نے سنی کی ان سنی کردی؟ اور یہ بھی ہمارا کام ہے کہ کسے چھوڑ دیں اور کسے سزا دیں؟ تم نہ کسی پر داروغہ بنا کر بھیجے گئے ہو لست علیھم بمصیطر نہ کسی کی ہدایت اور سنگاری کی تم پر ذمہ داری ہے لیس علیک ھداھم وہی اسلام حیات عائلی اور تدبیر منزل میں اتنا تنگ نظر ہو کر غیر مسلم عورتوں کا نکاح مسلمان مردوں سے تو جائز قرار دے اور مسلم عورتوں کو غیر مسلم مردوں کے حبالۂ نکاح میں جانے کی اجازت نہ دے۔ تو یہ بات نہ اس کے شایانِ شان ہے نہ مناسب اور مستحسن!

ہم ان سوالات و شبہات پر آئندہ صفحات میں حسب موقع گفتگو کرنے کی کوشش کریں گے!

کتابیات سے نکاح

اسلام نے کتابیات سے مسلمان کا نکاح جائز ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے۔

والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم	اور وہ عفت مآب عورتیں جو اہل کتاب ہیں (ان سے تم نکاح کرسکتے ہو)

اس کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ جصاص فرماتے ہیں۔

واتفق جماعة من الصحابة على اباحة اهل الكتاب الذميات

صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت اس پر متفق ہے کہ ذمیہ اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

حدثنا جعفر بن محمد قال حدثنا جعفر بن محمد بن اليمان قال حدثنا ابو عبيد قال حدثنا عبد الرحمن بن مهدی عن سفيان عن حماد قال سئلت سعيد بن جبير عن نكاح اليهودية والنصرانية فقال لا باس

حدیث بیان کی جعفر بن محمد نے انہوں نے جعفر بن محمد بن الیمان سے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی سفیان سے۔ اور وہ حماد سے روایت کرتے ہیں۔ کہ میں نے سعید بن جبیر سے یہودی اور نصرانی عورت سے نکاح کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا اس میں کوئی جرم نہیں ہے۔

وروی ان عثمان بن عفان تزوج نائلة بنت الفرافصة الكلبية وهی نصرانية وتزوجها علی نسائه وروی عن طلحة بن عبيد الله انه تزوج يهودية من اهل الشام وتروی اباحة ذلك عن عامة التابعين منهم الحسن وابراهيم والشعبی [1]

روایت ہے کہ عثمان ابن عفان (خلیفہ سوم) نے ایک خاتون نائلہ بنت فرافصہ سے اپنی مسلمان بیوی کے ہوتے ہوئے نکاح کیا تھا۔ حالانکہ وہ مذہباً عیسائی تھیں۔ اور طلحہ بن عبیداللہ سے مروی ہے۔ کہ انہوں نے شام کی ایک یہودی عورت سے شادی کر لی تھی۔ اہل کتاب عورتوں سے شادی کا جواز عام تابعین مثلاً حسن۔ ابراہیم اور شعبی وغیرہ سے مروی ہے۔

---

[1] احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۹۵

"محصنات" کی تعریف علامہ جصاص یہ کرتے ہیں۔

احصان الیھودیۃ والنصرانیۃ ان تغتسل من الجنابۃ وان تحصن فرجھا[1]	یہودی اور نصرانی عورت کی عفت یہ ہے کہ غسل جنابت کرتی ہو اور اپنی آبرو کی حفاظت کرتی ہو۔

کتابیہ لونڈی سے نکاح

اس باب میں تو سرے سے کوئی اختلاف ہی نہیں ہے کہ اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی یعنی اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ شرط جو کچھ ہے۔ وہ یہ کہ ان کا شمار "محصنات" میں ہو سکتا ہو۔ یعنی وہ غسل جنابت کی عادی ہوں اور اپنے ناموس کی حفاظت کرتی ہوں۔ آوارہ اور بدقماش اور بد اطوار نہ ہوں۔ اس طرح کی تمام —— اہل کتاب —— عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ لیکن ایک ایسی عورت سے جو اگرچہ کتابیہ ہو۔ لیکن "حرائر" میں شامل نہ ہو۔ یعنی آزاد نہ ہو بلکہ کسی کی کنیز ہو نکاح جائز ہے یا نہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اور اس کا شافی جواب قرآنی اور مذہبی نقطہ نظر سے یہ ہے کہ کتابیہ باندی کے ساتھ بھی نکاح جائز ہے۔ چنانچہ والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم کی آیت کریمہ پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابوبکر جصاص نے اپنی بے نظیر کتاب میں کافی طویل اور دلچسپ بحث کی ہے۔ اس کے چند ضروری اجزا ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

اختلف اھل العلم فیہ فروی عن الحسن ومجاھد وسعید بن عبد العزیز وابی بکر بن عبد اللّٰہ بن ابی مریم کراھۃ ذلک	اہل کتاب کنیز سے نکاح کے بارے میں اہل علم باہم مختلف الرائے ہیں۔ چنانچہ حسن، مجاہد، سعید بن عبد العزیز اور ابوبکر بن عبد اللّٰہ بن ابی مریم کے نزدیک

[1] احکام القرآن ج ۲ صہ ۳۹۶

وهو قول الثوري وقال ابو ميسرة في آخرين يجوز نكاحها وهو قول ابي حنيفة وابي يوسف ومحمد وزفر وروى عن ابي يوسف انه كرهه اذا كان مولاها كافرا والنكاح جائز ويشبه ان يكون ذهب الى ان ولدها يكون عبدا لمولاها وهو مسلم باسلام الاب [1]

یہ جائز تو ہے۔ لیکن کراہت سے خالی نہیں ثوری کا بھی یہی قول ہے۔ اور متاخرین میں ابو میسرہ جواز نکاح کے حامی ہیں۔ امام ابو حنیفہ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز امام ابو یوسف۔ امام محمد اور امام زفر کا فتوی بھی یہی ہے۔ امام ابو یوسف ایسی حالت میں کتابیہ لونڈی سے نکاح مکروہ سمجھتے ہیں۔ جب اس کا مالک کافر ہو۔ کیونکہ اس کے بطن سے جو لڑکا ہوگا۔ وہ بھی اس کے مالک کا غلام ہوگا۔ حالانکہ وہ اپنے باپ کے مسلمان ہونے کے باعث مذہباً مسلمان ہوگا۔

گویا مذکورہ ائمہ کو جواز نکاح میں تو اختلاف نہیں۔ بعض اسے مکروہ ضرور سمجھتے ہیں۔ اور اس کراہت کی وجہ امام ابو یوسف نے بتادی ہے کہ اس کتابیہ کنیز کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوگا۔ وہ اگرچہ مذہباً مسلمان ہوگا۔ لیکن ماں کی وجہ سے اپنے کافر آقا کا غلام بننا پڑے گا۔ بہر حال کراہت دوسری چیز ہے اور اباحت (جواز) دوسری چیز۔ ہمیں تو اباحت سے بحث ہے۔ آگے چل کر جواز کی دلیل دیتے ہوئے علامہ جصاص فرماتے ہیں:

ولما يختص منها بالدلالة على هذه المسألة قوله عز وجل والمحصنات من الذين اوتوا الكتاب من قبلكم [2]

(اس مسئلہ پر یعنی کتابیہ عورت سے جواز نکاح کے مسئلہ پر سب سے بڑی دلیل قول خداوندی ہے کہ عفیفہ اہل کتاب عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے)

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۱۹۸

پھر آگے چل کر علامہ موصوف نے "احصان" کے معنی اور مفہوم پر بحث و گفتگو کرتے ہوئے وضاحت اور تصریح کے ساتھ فرمایا ہے۔

وثبت ان اسم المحصنات یقع علی الکتابیات من الحرائر والاماء واطلق اللہ نکاح الکتابیات المحصنات بقولہ والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم کان عاما فی الحرائر والاماء منھن[1]

یہ بات ثابت ہے کہ محصنات کا اطلاق کتابیات پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ آزاد ہوں یا کنیز۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عفیفہ کتابیات سے نکاح کی اجازت مطلق طور پر دی ہے ——— یا کدامن اہل کتاب عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے) یہ اجازت عام ہے۔ آزاد اور باندی ہر اہل کتاب عورت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس آیت اور آیت سے مستنبط شدہ حکم نے یہ بات بھی بہت اچھی طرح واضح کر دی کہ:

۱۔ نہ صرف آزاد اہل کتاب عورت سے نکاح جائز ہے۔ بلکہ اس اہل کتاب عورت سے بھی نکاح جائز ہے۔ جو آزاد نہ ہو۔ بلکہ لونڈی ہو۔

۲۔ عفت کو اسلام "حرائر" یعنی آزاد عورتوں کی اجارہ داری نہیں سمجھتا بلکہ وہ کتابیہ باندیوں کو بھی صاحب ناموس و عفت سمجھتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے عورت کا درجہ کتنا اونچا کر دیا تھا۔

۳۔ اس خطرہ کے باوجود کہ کتابیہ باندی کے بطن سے مسلمان شوہر کا جو لڑکا پیدا ہو گا۔ وہ رواجاً اپنی ماں کے کافر آقا کا غلام ہو گا۔ اسلام کتابیہ باندی سے نکاح کی ممانعت نہیں کرتا۔

---

[1] احکام القرآن ج ۲ صفحہ ۱۹۸

پھر کوئی ہے جو سوچے اور غور کرے؟

مسلمان عورت غیر مسلم مرد سے نکاح نہیں سکتی!

اب ہم اس مسئلہ کے دوسرے نازک ترین سوال کو چھیڑتے ہیں!

کوئی شبہ نہیں بظاہر یہ بڑی زیادتی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان مردوں کو تو اجازت ہو کہ وہ غیر مسلم عورتوں سے نکاح کرلیں لیکن غیر مسلم مردوں کو یہ اجازت نہ ہو کہ وہ مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکیں کیا اس سے بڑھکر بھی کوئی مذہبی تنگ نظری ہو سکتی ہے؟

لیکن سنجیدگی سے اگر غور کیا جائے۔ تو محسوس ہوگا اس حکم کا اصل محرک عورت کا وہ انتہائی احترام ہے۔ جو اسلام ہر حالت میں پیش نظر رکھتا ہے۔ اسلام جب نمودار ہوا تو معاشرہ میں عورت کی حیثیت کیا تھی؟

۱۔ بحیثیت بیٹی کے، بہن کے، بیوی کے، ماں کے، املاک وجائداد کے ترکہ اور میراث میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اسلام نے اسے یہ حق بڑی فیاضی سے عطا کیا

۲۔ شوہر کتنی ہی زیادتی کرے لیکن عورت سر تسلیم خم کر دینے پر مجبور تھی لیکن اسلام نے عورت کو

الف :۔ مہر دلایا

ب :۔ طلاق کا حق تسلیم کیا

ج :۔ خلع کی اجازت دی۔

یہ وہ حقوق ہیں۔ جو آج بھی بہت سی متمدن اور مہذب حکومتوں نے تسلیم نہیں کئے ہیں ——— کم از کم پورے طور پر تسلیم نہیں کئے ہیں۔

۳۔ شادی کے بعد عورت اپنے نام یعنی اپنی انفرادیت اور اپنی ملکیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ وہ میکہ سے ایک کروڑ روپیہ بھی لائے، وہ شوہر کا ہے۔ اس کا نام نہیں پکارا جاتا۔ وہ "مسز فلاں" بن جاتی ہے۔ وہ بنک میں اپنے نام کا حساب نہیں رکھ

سکتی۔ خرید و فروخت نہیں کر سکتی۔ یہ سارے کام شوہر کرے گا ——— انگلستان تک میں ابھی چند سال پہلے تک یہی صورت تھی ——— لیکن اسلام عورت کی انفرادیت کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ اسے ملکیت کا حق دیتا ہے۔ مسلمان شوہر اپنی بیوی کی جائداد اور املاک سے ایک حبہ بھی بغیر اس کی رضا کارانہ اجازت کے نہیں لے سکتا۔ مسلمان شوہر اپنی بیوی کی طرف سے اس کی اجازت کے بغیر کوئی معاہدہ نہیں کر سکتا جتنی کہ وہ وقتاً فوقتاً جو کچھ اپنی بیوی کو دے۔ وہ طلاق کے بعد بھی واپس نہیں لے سکتا۔ مسلمان شوہر کی بیوی حسب ضرورت شوہر کی جیب سے "چوری" بھی کر سکتی ہے [۱] حالانکہ اسلام میں چوری کی سزا قطع ید ہے۔

۴۔ دوسرے مذاہب میں عورت کو "صاحب الرائے" نہیں مانتے۔ حالانکہ اسلام مانتا ہے۔

۵۔ کافر عورت اگر اپنے مسلمان بیٹے کو جہاد پر جانے سے روکے تو اس پر جہاد واجب نہیں۔ نماز سے روکے تو اجازت ہے کہ اس کے سامنے نہ پڑھے۔ چھپ کر پڑھ لے [۲]

۶۔ ایک مسلمان اپنی غیر مسلم بیوی کو کسی حالت میں بھی مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ مسلمان شوہر کی بیوی رہ کر چرچ اور کلیسا میں جا سکتی ہے۔ اپنے تمام شعائر، رسوم اور اعتقادات و عبادات پر عمل کر سکتی ہے۔ چنانچہ تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک مسلمان اپنی اپاہج ماں کو پیٹھ پر لاد کر کلیسا لے جایا کرتا تھا ایک مسلمان نے اپنی عیسائی ماں کے لئے گھر کے احاطہ میں گرجا بنایا تھا [۳]

---

[۱] ملاحظہ ہو ہندہ زوجہ ابوسفیان کا رسول اللہ سے اس سلسلہ میں سوال اور آپ کا جواب معتبرہ مستند کتب سیرت میں۔ [۲] اپنے موقع سے یہ چیزیں آئندہ ابواب میں آئیں گی ۱۲ [۳] تمام متداول کتب تاریخ میں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

،۔ مسلمان شوہر کی بیوی اس کی زندگی اور موت ہر دور میں مخصوص حقوق و مراعات رکھتی ہے۔ غیر مسلم کلچر میں عورت کے حق کا سوال ہی نہ تھا۔

اب غور کیجئے ایک کتابیہ عورت یا لونڈی مسلمان شوہر کی بیوی بن کر ان تمام حقوق سے دفعتہً بہرہ ور ہو جائے گی۔ اور اگر ایک مسلمان عورت کو غیر مسلم مرد سے شادی کی اجازت ہوتی۔ تو جن حقوق سے وہ آج تک بہرہ ور ہوتی آئی تھی۔ ان سے دفعتہً محروم ہو جائے گی۔ اور لاشے محض بن کر رہ جائے گی یا ایک مسلمان عورت پر یہ کتنا بڑا ظلم ہوتا اگر اسے غیر مسلم مرد سے شادی کی اجازت دے دی جاتی۔ اور ایک غیر مسلم عورت پر یہ کتنا بڑا احسان ہے۔ کہ اسے مسلمان مرد سے شادی کی اجازت دے دی گئی۔ دراصل اس حکم پر اسلام اور غیر مسلم کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ عورت کے مجد و وقار پر اس کا کتنا گہرا اثر پڑتا ہے ؛

قابل غور بات

یوں تو کسی معاملہ میں بھی یہ جائز اور مستحسن نہیں ہے کہ حقائق کو میلان اور جذبات کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن ادیان و مذاہب پر نکتہ چینی کے وقت تو ہر حال میں حقائق کو ذاتی میلان و رجحان پر غالب رہنا چاہیئے۔ جو لوگ نکاح غیر مسلم کے جواز اور نکاح غیر مسلم کی حرمت پر معترض ہوتے ہیں۔ انہیں قومی اور مذہبی عصبیت سے بالا ہو کر صورت مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو اسلام کے یہ معترضین اس پر معترض ہونے کے بجائے اس کے شکر گذار ہوتے۔ کہ اس نے عورت کی عافیت، سربلندی اور بہبود کے لئے کیسے کیسے وسیلے اور ذریعہ پیدا کئے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے۔ ایک مسلمان عورت ایک غیر مسلم کی بیوی بن کر آج سے چودہ سو سال پہلے بے شک تمام حقوق سے محروم ہو جاتی ہوگی۔ لیکن اب اس بیسویں صدی میں اس روشن خیالی کے دور میں اس آزاد مشربی اور دینی بے پروائی کے زمانہ میں تو ایسا

نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ ہم نے کئی عالی خاندان مسلمان لڑکیوں کو دیکھا ہے کہ انہوں نے کسی وجہ سے غیر مسلم مردوں سے شادی کی۔ یہ شادی سول میرج کے ماتحت ہوئی۔ ان کے شوہر ہندو تھے۔ عالی خاندان اور ذی الا دودمان تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن ان عورتوں کو جو مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے گھر میں بیوی کی حیثیت سے جانے کے بعد زبان سے علانیہ دیپک اقرار کئے بغیر ہندو بننا پڑا۔ اور پھر بھی انہیں وہ منزلت، وقعت اور اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ جو ایک بیوی کا حق ہے۔ وہ ہر طرح کی سعادت مندی، اطاعت گذاری اور رواداری کے باوجود اپنے ہندو شوہر کے خاندان کا جزو نہ بن سکیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ہاں نہ پہلے کبھی ایسا ہوا۔ نہ اب ایسا نظر آتا ہے۔ لہٰذا اسلام کا یہ حکم جتنا آج سے چودہ سو برس پہلے حکیمانہ تھا اتنا ہی آج بھی ہے۔

آیاتِ قرآنی کی روشنی میں

کفّار و مشرکین سے جہاد و قتال

دنیا کا کوئی مذہب بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کہ حالات خواہ کیسے ہی ہوں جبر و جور، ظلم و عدوان، حرب و پیکار، سفاکی اور درندگی کا فریق مخالف کی طرف سے خواہ کتنا ہی سنگدلانہ مظاہرہ ہو رہا ہو۔ لیکن وہ جنگ سے پہلو بچائے گا۔ سر نے طمانچہ کے لئے دوسرا گال برابر پیش کرتا رہے گا۔

مذہبی لڑائیاں

بہت سی مذہبی جنگیں دنیا میں برپا کی گئیں۔ ان لڑائیوں میں وہ سب کچھ ہوا جو سیاسی جنگوں میں ہوتا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ خون ریزی، شقاوت اور سفاکی کے لحاظ سے جو مذہبی جنگیں دنیا کی متمدن قوموں ——— یہودیوں، عیسائیوں

ہندوؤں وغیرہ ——— نے لڑیں وہ سیاسی لڑائیوں سے کہیں زیادہ ہوش ربا اور لرزہ خیز تھیں تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا بلکہ صرف بیان حقیقت؛

روستہ الکبریٰ، قسطنطنیہ عظمیٰ، اسپین اور دوسرے مقامات پر بت پرستی کو ختم کرنے، یہودیوں کا استیصال کرنے، عیسائیت کو رواج دینے، حکومت کو عیسائی بنانے اور پھر خود مختلف العقائد عیسائی فرقوں میں ایک دوسرے کو زک دینے، ایک دوسرے کا زور توڑنے اور صرف اپنے فرقہ کو سربلند کرنے کے لئے جس بے دردی سے انسانوں نے انسانوں کا خون مذہبی پرچم لہرا لہرا کر بہایا۔ اُسے نہ چشم فلک بھول سکتی ہے نہ تاریخ کے اوراق؛

بدھ اور جین مت

ہندوستان میں ہم نے دیکھا ایک مذہب نے دوسرے مذہب کو ختم کرنے کے لئے، ایک مذہب کے پیرووں نے دوسرے پیروان مذہب کی گردنیں کاٹنے میں کتنی سنگدلی کا مظاہرہ کیا ہے؟ حالانکہ یہ مذاہب غیر ملکی نہ تھے۔ دیسی تھے۔ ان کے داعی، ان کے پیرو سب اسی سرزمین پر پیدا ہوئے اور یہیں مرے، کھپے۔ ہندوستان کے دوسرے ادیان و مذاہب کو چھوڑیئے۔ صرف بدھ مذہب اور جین مذہب کی تاریخ پر . . . . ایک سرسری نظر ڈالئے۔ بدھ اور مہابیر نے عوام کو برہمنیت سے نجات دینے کے لئے اپنے عوامی مذہب کی بنیاد ڈالی تھی۔ سب سے زیادہ فروغ بدھ مذہب کو حاصل ہوا۔ وہ اپنی سادگی، عوامیت اور عام فہمی کی بدولت آگ کی طرح پھیلا، اور ہندوستان کے بعید ترین گوشوں میں بھی پھلا پھولا۔ اس مذہب میں برہمنیت کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا چھوت چھات بھی نہیں تھی۔ مذہبی ارکان وعبادات کی بجا آوری کے لئے کوئی پابندی نہیں تھی۔ بلکہ ارکان وعبادات کی فہرست بھی زیادہ سے زیادہ مختصر کر دی گئی تھی۔ یہ مت صرف ہندوستان

میں نہیں، ہندوستان سے باہر بھی پھیلا۔

عبرت انگیز

افغانستان، ایران، عراق ——— بعض مورخین کے نزدیک شام و حجاز تک ——— سب ہی نے بدھ مذہب قبول کر لیا۔ چین و جاپان بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے۔ لیکن ہندوستان کی برہمنیت اس کے استیصال کی درپردہ کوشش کرتی رہی۔ اور جب کھلی جنگ برپا کرنے کا وقت آیا۔ تو سوامی شنکر اچاریہ نے ایک طوفان کی طرح اٹھ کر خطۂ ہند سے اس مذہب کو جلاوطن کر دیا۔ نوبت یہ پہنچی کہ چین سے راستہ کی دشواریاں اور صعوبتیں سہتے ہوئے فاہیان اور دوسرے زائر ہندوستان پہنچتے تھے۔ اور اپنے مذہب کے وطن کی زیارت کر کے آہ سرد بھرتے ہوئے واپس چلے جاتے تھے۔

آج سارا برما بدھ ہے۔ سیلون کی آبادی بدھ مت کی پیرو ہے۔ بھوٹان اور تبت کا علاقہ بدھوں پر مشتمل ہے۔ کشمیر کے بلند و بالا مقام لداخ میں بدھوں کی کثرت ہے۔ جاپان سارا کا سارا ملک اسی مذہب کا پرستار ہے۔ چین کی بہت بڑی اکثریت ——— چند کروڑ مسلمانوں، چند لاکھ عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے قطع نظر ——— آج بھی بدھ مت پر ہی عامل ہے۔ تھائی لینڈ کے بارے میں بھی سب جانتے ہیں کہ بدھ ہے ——— انڈونیشیا یعنی جاوا، سماترا، بورنیو، ملایا وغیرہ میں اگر اسلام نہ پھیل جاتا اور یہاں کے بدھ مسلمان نہ ہو گئے ہوتے۔ تو آج ان مقامات پر بھی بدھ مت کا ہی چراغ جل رہا ہوتا ——— لیکن خود ہندوستان میں؟

صرف آثار قدیمہ

لنکا اور برما وغیرہ کے بدھ زیادہ تر ان ہندوستانیوں کی اولاد ہیں، جو برہمنیت کا وار نہ سہہ سکے اور لٹ پٹ کر کوئی دوسری پناہ گاہ تلاش کرنے پر مجبور ہوئے ———
——— بہرحال متعدد ممالک جن کی آبادی کروڑہا کروڑ ہے۔ آج بھی بدھ مذہب کو ماننے

ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ایجنٹا، ایلورا، بدھ گیا کا مندر اور چند دوسرے آثار قدیمہ کے سوا کیا ہے؟ ——— جس دیس سے یہ مذہب اٹھا تھا۔ آج وہاں اس کی آبادی کا عالم یہ بھی نہیں کہ مرکزی اسمبلی یا صوبائی کونسل یا ڈسٹرکٹ بورڈ یا میونسپلٹی میں وہ اپنا کوئی نمائندہ بھیج سکے ——— تاریخ کا یہ کتنا بڑا عبرت انگیز باب ہے؟

اسلام کی تعلیم

اب اسلام کو دیکھئے۔ اسلام کے پیروؤں نے جنگ سے پیشتر اور دوران جنگ میں صلح کے ٹوٹنے سے پہلے، صلح ٹوٹنے کی حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ یہ داستان آپ کو آئندہ اوراق میں ملے گی۔ فی الحال ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں۔ کہ اس باب میں دنیا کی آخری مذہبی کتاب ——— قرآن ——— کے احکام و ہدایات کیا ہیں؟ ——— اور اسے اسلام کا بدترین دشمن بھی مانے گا کہ مسلمانوں کے نزدیک قرآن سے بڑھ کر محترم مقدس اور واجب التعمیل کوئی دوسری کتاب نہیں۔ بنابریں اس باب میں قرآن کے احکام و ہدایات آخری اور قطعی ہیں۔ ان میں نہ آج تک ترمیم و تنسیخ ہوئی نہ آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔ خود رسول آخر الزمان ﷺ تک کو یہ حق نہیں تھا۔ کہ وہ قرآن میں کوئی تبدیلی کر سکیں!

مسلمانوں کا آغاز اور انجام

مسلمانوں کو آغاز و انجام کی دو مختلف کیفیتوں سے گزرنا پڑا۔

پہلی صورت آغاز کی تھی۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی۔ اور کفار مکہ نے بڑی شقاوت اور بے رحمی سے نہ صرف اسے رد کر دیا بلکہ اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ اور جور و ظلم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ انہیں اس سلسلہ میں کسی ننگ انسانیت حرکت سے باک نہیں تھا۔ وہ ہر پست سے پست حرکت اسلام کو ختم کرنے کے لئے بے تکلفی سے کر بیٹھتے تھے۔ اور مسلمانوں کی یہ حالت تھی۔ کہ وہ بے بس تھے، مجبور تھے

مظلوم تھے۔ نہ اُن کے پاس روپیہ تھا کہ لوگوں کو اور اُن کے ضمیر و ایمان کو خرید سکتے۔ نہ فوج تھی کہ مخالفوں اور دشمنوں سے کھلم کھلا جنگ کر سکتے۔ نہ وجاہت تھی۔ کہ لوگ اُن کے خلاف کچھ کرتے ہوئے ڈرتے اور سوچتے۔

پھر وہ دور آیا کہ مسلمان حاکم اور کشور کشا کی حیثیت سے مکّہ میں داخل ہوئے۔ اور نہ صرف مکّہ پر بلکہ سارے حجاز پر ان کی حکومت ہوگئی۔ اب ہر شخص کی گردن اُن کی تلوار کی نوک پر تھی۔ اور یہ وہی لوگ تو تھے جنہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں کوئی ظلم ایسا نہیں تھا۔ جس کا مظاہرہ نہ کیا ہو؟

اب ہم بتائیں گے کہ دورِ محکومی و مجبوری اور عہدِ اقتدار و اختیار میں قرآن نے مسلمانوں کی کس طرح رہنمائی کی؟

دورِ مظلومی و مجبوری

مکّہ کا دورِ مجبوری و مظلومی اتنا صعب و سخت تھا کہ مسلمان جنگ و پیکار کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔

بے شک وہ ظلم سہتے تھے اور بلاشبہ وہ مجبور تھے۔ کہ ظلم سہیں لیکن قرآن نے پھر بھی انہیں بتا دیا تھا کہ اگر ان میں حوصلہ ہو تو وہ لڑ سکتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا!

ولمن انتصر من بعد ظلمه فاولئك ما عليهم من سبيل ۔ انما السبيل على الذين يظلمون الناس و يبغون في الارض بغير الحق اولئك لهم عذاب اليم ٥

جو شخص ظلم کے بعد انتقام لیتا ہے۔ اس پر کوئی الزام نہیں۔ الزام ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کریں۔ اور ملک میں غیر حق کو پھیلانے کے درپے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے عذاب الیم ہے۔

خوب غور کر لیجئے۔ ان آیات میں کہیں بھی اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے

کہ مسلمان جبر و جور کو ہر حالت میں سہتے رہیں۔ اس کی اجازت دی گئی ہے کہ جب پانی
سے اونچا ہو جائے تو ہتھیار اٹھائیں اور دشمن کا مقابلہ کریں ——
جوابی طور پر پہل کرنے اور آغاز کرنے کی اجازت نہیں دی گئی —— اور
پابندی آخر تک قائم رہی۔ مدنی دورِ حکومت میں بھی اس کے اندر کوئی لچک نہیں پیدا

قرآن اور جہاد

جہاد کے بارے میں قرآن کے اندر جو سب سے پہلی آیتیں ہیں۔ وہ سورہ
حسب ذیل آیات کریمہ ہیں۔

اذن للذين يقاتلون بانهم
ظلموا و ان الله على نصرهم لقدير ه
الذين اخرجوا من ديارهم بغير حق
الا ان يقولوا ربنا الله ولولا دفع الله
الناس بعضهم ببعض لهدمت
صوامع وبيع وصلوات و مساجد
يذكر فيها اسم الله كثيرا ه ولينصرن
الله من ينصره ان الله لقوى
عزيز ه الذين ان مكناهم فى الارض
اقاموا الصلوة واتوا الزكوة وامروا
بالمعروف ونهوا عن المنكر ولله
عاقبة الامور ه

لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت د
گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے۔ اس و
کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور بلاشبہ اللہ
ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت ر
اور جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکا
محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں
رب اللہ ہے۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ
تعالیٰ لوگوں کا ایک دوسرے سے ز
گھٹاتا رہتا۔ تو نصاریٰ کے خلوت خ
اور عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں
نام بکثرت لیا جاتا ہے۔ سب منہدم ہو
اور بے شک اللہ تعالیٰ اس کی مدد
جو کہ اللہ کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ
قوت والا اور غلبہ والا ہے۔ یہ لوگ ا

اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں۔ تو یہ
لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اور
نیک کاموں کے کرنے کو کہیں۔ اور برے کاموں
سے منع کریں۔ اور سب کاموں کا انجام تو خدا
ہی جانتا ہے۔

آیات بالا سے کیا ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ کفار و مشرکین سے "مقاتلہ" صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن پر ظلم کیا گیا ہو۔

۲۔ جو اپنے وطن سے صرف اس لئے نکلنے پر مجبور ہوئے ہوں کہ وہ خدا کا ذکر کرتے ہیں۔

۳۔ جن پر کفار نے ظلم نہیں کیا جن کے دین و مذہب اور طریق و مسلک سے تعرض نہیں کیا جنہیں اختیاری یا جبری جلا وطنی پر مجبور ہونا نہیں پڑا۔ انہیں مخاطب نہیں فرمایا گیا ہے۔ خطاب صرف انہی سے ہے جن کے لئے دنیا کے کسی اصول کے لحاظ سے بھی جنگ کے سوا دوسرا چارۂ کار نہیں رہ گیا۔

چند قابل غور امور

اب اس کے ساتھ چند اور باتوں پر بھی غور فرمائیے۔

ان آیات سے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کی کیسی زبردست تعلیم ملتی ہے۔ چنانچہ جہاں "مسجد" کا ذکر فرمایا وہاں

۱۔ گرجاؤں (صوامع)

۲۔ اہل کتاب کی عبادت گاہوں (بیع)

۳۔ عام عبادت گاہوں (صلوات)

کا بھی احترام اور تقدس کے ساتھ ذکر فرمایا اور غایت درجہ کی رواداری دکھائی

کہ "مسجد" یعنی مسلمانوں کی عبادت کا ذکر سب سے آخر میں فرمایا ——— حالانکہ مسجد کو بڑی آسانی سے مقدم اور دوسری عبادت گاہوں کو مؤخر کیا جاسکتا تھا۔ کیا اس سے بڑھ کر رواداری کی کوئی مثال کہیں مل سکتی ہے؟

اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ یہ آیات مدنی ہیں یعنی مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تھیں۔ اب مسلمان بے بس اور مجبور و مظلوم نہیں تھے۔ کہ دم نہ مار سکیں اب ان کے پاس قوت تھی۔ شوکت تھی۔ دبدبہ تھا اور وہ کفار و مشرکین کو نہ صرف کرارا جواب دے سکتے تھے۔ بلکہ اُن کی دستدرازیوں اور شقاوتوں کا پورا پورا بدلہ بھی لے سکتے تھے

مفسرین کا نقطہ نظر

ہم نے "صلوات" کو عام عبادت گاہ سے تعبیر کیا تھا۔ اس جگہ اگر مفسرین کا عام نقطہ نظر بھی سامنے آجائے تو اچھا ہے۔

صوامع جمع صومعة وهی موضع يتعبد فيه الرهبان ويتفردون فيه لاجل العبادة	صوامع ——— صومعہ کی جمع ہے صومعہ وہ مقام ہے۔ جہاں راہب عبادت کرتے ہیں۔ اور عبادت کی غرض سے خلوت گزیں ہوجاتے ہیں۔

اب "بیع" کو لیجئے۔

كنائس للنصارىٰ اى التى يبنونها فى البلدان ليجتمعوا فيها لاجل العبادة۔	کنیسے یعنی عیسائیوں کی عبادت گاہیں جو شہروں میں تعمیر ہوتی ہیں۔ تاکہ وہاں مجتمع ہوکر عیسائی عبادت کرسکیں۔

صومعہ اور کنیسہ کا فرق:

والصوامع لهم ايضاً الا انهم يبنونها فى المواضع الخالية	صومعہ بھی عیسائیوں کی عبادت گاہ ہے جو سنسان مقام پر بنائی جاتی ہے

کالجبال والصحاریٰ — جیسے پہاڑ اور صحرا

صلوات کی تشریح

وصلوات کنائس للیھود — صلوات یعنی یہودیوں کی عبادت گاہیں

اس تقسیم کے ان لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اصل بات یہی ہے کہ صوامع اور بیع سے مراد اہل کتاب یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہیں ہیں۔ اور صلوات کا لفظ عام ہے۔ اور اس کے معنی بھی عام ہیں یعنی عام عبادت گاہیں جہاں خدا کا ذکر کیا جاتا ہو چاہے وہ عیسائیوں کی ہوں یا یہودیوں کی یا کسی اور کی۔ چنانچہ صاوی نے اس کے جو معنے بتائے ہیں یہ ہیں:

ھی کلمۃ معربۃ اصلھا بالعبرانیۃ ومعناھا المصلّٰی — یہ ایک عبرانی لفظ ہے۔ جو معرّب کر لیا گیا ہے۔ اس کے معنی عبادت گاہ کے ہیں؛

غرض اس نازک معنوی فرق سے ہمارے اصل دعوے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ —— اصل یہ ہے کہ عبادت گاہیں خواہ مسلمانوں کی ہوں، یا غیر مسلموں کی مقدس اور محترم ہیں؛

چند اور آیات

اب سورہ انفال کی حسب ذیل آیات کریمہ پر غور فرمایئے

وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للّٰہ فان انتھوا فان اللّٰہ بما یعملون بصیرہ وان تولوا فاعلموا ان اللّٰہ مولاکم نعم المولیٰ ونعم النصیرہ

اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ اُن میں فتنہ ختم ہو جائے۔ اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔ پھر اگر یہ باز آ جائیں تو اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے۔ اور اگر روگردانی کریں تو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا رفیق ہے۔ وہ بہت اچھا رفیق ہے اور بہت اچھا مددگار ہے۔

ان آیات کریمہ سے امور ذیل پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ جو لوگ مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہوں۔ ان سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن جنگ اور پیکار کی حالت میں بھی اعتداء یعنی زیادتی کی اجازت نہیں۔ صاف الفاظ میں فرمایا

ان اللہ لا یحب المعتدین — خدا تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۲۔ برسرِ جنگ کفار و مشرکین کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جا سکتا ہے۔ جو وہ مسلمانوں سے روا رکھتے چلے آ رہے تھے بس اس سے زیادہ کچھ نہیں!

پھر بھی تاکید اور صراحت کے ساتھ فرما دیا۔

والفتنۃ اشد من القتل — فتنہ و فساد قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے

۳۔ یہ بات بھی صاف فرما دی کہ مسجد حرام کے جوار میں قتل و خونریزی جائز نہیں سوا اس صورت کے کہ خود کفار مجبور کر دیں

کذٰلک جزاء الکافرین — کہ یہی کافروں کی جزا ہے

۴۔ اور اگر جنگ و پیکار سے باز آ جائیں۔ اپنی کمزوری دیکھ کر جنگ کا ارادہ ترک کر دیں۔ تو

فان اللہ غفور الرحیم — اللہ تعالیٰ رحم کرنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔

موقع کے لحاظ سے ان الفاظ کی بلاغت اور معنویت پر غور کیجئے۔ اس سے بڑھ کر رحم و کرم کا کوئی درجہ ہو ہی نہیں سکتا۔

۵۔ یہ بات بھی صراحت اور وضاحت کے ساتھ فرما دی کہ مسلمان کامیابی اور فتحمندی کے عالم میں زیادہ سے زیادہ مقہور و مجبور کافروں کے ساتھ وہی برتاؤ کر سکتے ہیں۔ جس کے وہ شکار ہو چکے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اور اگر اس سے بھی باز آ جائیں۔ اور

بالکل معاف کر دیں تو سبحان اللہ
۶۔ آخری بات پر غور کیجئے۔ تاکید کی جاتی ہے۔

واتقوا اللّٰہ
خدا سے ڈرو

اور معاً اس کے بعد اور زیادہ زور کے ساتھ فرمایا جاتا ہے۔

واعلموا ان اللّٰہ مع المتقین
جان لو خدا صرف انہی لوگوں کے ساتھ ہے
جو اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔

سورۂ بقر کی چند آیتیں

اس سلسلہ جنگ و پیکار سے متعلق سورۂ بقر کی آیات ذیل خاص طور پر غور طلب ہیں۔

وقاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین
یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللّٰہ لا یحب
المعتدین ۰ واقتلوھم حیث ثقفتموھم
واخرجوھم من حیث اخرجوکم
والفتنۃ اشد من القتل ولا تقاتلوھم
عند المسجد الحرام حتی یقاتلوکم
فیہ فان قاتلوکم فاقتلوھم کذلک
جزاء الکافرین ۰ فان انتھوا فان
اللّٰہ غفور رحیم ۰ وقاتلوھم حتی
لا تکون فتنۃ ویکون الدین للّٰہ فان
انتھوا فلا عدوان الا علی الظالمین ۰
الشھر الحرام بالشھر الحرام والحرمات
قصاص ۰ فمن اعتدیٰ علیکم

اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے
ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں۔ اور حد سے
مت نکلو۔ یقینی اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں
کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ
اور ان کو نکال باہر کرو۔ جہاں سے انہوں نے
تم کو نکلنے پر مجبور کیا ہے۔ اور شرارت قتل سے
بھی سخت تر ہے۔ اور ان کے ساتھ مسجد حرام کے
جوار میں قتال مت کرو۔ جب تک کہ وہ لوگ
وہاں تم سے خود نہ لڑیں۔ ہاں اگر وہ خود ہی لڑنے
کا سامان کرنے لگیں۔ تو تم ان کو مارو۔ ایسے
کافروں کی ایسی ہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ لوگ
باز آ جائیں۔ تو سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی۔
بجز بے انصافی کرنے والوں کے۔ حرمت والا

فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم واتقوا اللہ ان اللہ مع المتقین ○

مہینہ ہے۔ بعوض حرمت والے مہینہ کے۔ اور یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں سو جو تم پر زیادتی کرے۔ تو تم بھی اس پر زیادتی کر و جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اور یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

مسلمانوں پر کفار سے جنگ و پیکار کے سلسلہ میں بہت سی پابندیاں ہیں۔ اور ان پابندیوں کو بجا لانا ان کا فرض ہے

سب سے بڑی پابندی یہ ہے کہ وہ احتیاطی طور پر یا پیش بندی کے طور پر یا کفار و مشرکین کی طرف سے جنگ کا آغاز ہوئے بغیر اسلحہ لے کر میدان میں نہیں اتر سکتے۔ انہیں خواہ کتنا ہی نقصان ہو۔ نقصان ہی نہیں کتنے ہی خطرات سے وہ دوچار ہوں۔ لیکن اگر صلح کر چکے ہیں۔ تو اندیشہ ہائے دور و دراز کی آڑ لے کر جیسا کہ موجودہ زمانہ میں بھی بڑی بے تکلفی سے ہوتا ہے۔ وہ کفار سے جنگ نہیں چھیڑ سکتے۔ جب تک صلح قائم ہے۔ وہ صلح کو باقی رکھنے پر مجبور ہیں۔ پھر جنگ کی حالت میں بھی وہ کسی قسم کی زیادتی نہیں کر سکتے ہیں۔ نہ تقویٰ کی راہ سے منحرف ہو سکتے ہیں۔ نہ انصاف سے روگردانی کر سکتے ہیں۔

پھر آج جو کفار کو یہ آسانی ہے کہ جب چاہیں میدان سے بھاگ کھڑے ہوں۔ مسلمان اس سہولت سے محروم ہیں۔ ان پر ایک پابندی یہ بھی ہے۔ کہ وہ اس وقت تک جنگ جاری رکھنے پر مجبور ہیں۔

حتی لا تکون فتنۃ

جب تک فتنہ و فساد کا قلع قمع نہ ہو جائے تم جنگ کرتے رہو۔

ترغیب جہاد

قرآن کریم میں جہاد کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ اور بڑے موثر اور جذب انگیز لہجہ میں دی گئی ہے۔ چنانچہ سورہ نساء میں جو مدنی سورت ہے۔ ارشاد ہوا۔

وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیًا واجعل لنا من لدنک نصیرا ہ

اور تمہارے پاس کیا عذر ہے۔ کہ تم جہاد نہ کرو۔ اللہ کی راہ میں اور کمزوروں کی خاطر سے جن میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں۔ اور کچھ بچے ہیں۔ جو دعا کر رہے ہیں۔ کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے والے سب ظالم ہیں۔ اور ہمارے لئے غیب سے کسی دوست کو کھڑا کیجئے۔ اور ہمارے لئے غیب سے کسی حامی کو بھیجئے۔

ان آیات کریمہ سے جہاں جہاد کی تبلیغ نکلتی ہے۔ وہاں یہ بات بھی صاف اور واضح طور پر نظر آجاتی ہے۔ کہ جہاد کا مقصد قتل و خون ریزی، توسیع مملکت، حصول مفاد اور جنگ زرگری نہیں ہے۔ بلکہ یا تو فقط دفاع ہے یا تمرد اور طغیان کی سرکوبی۔ اسلام کا خدا بدترین نافرمانیوں کے باوجود بھی کفار و مشرکین کی جان و مال کو محترم سمجھتا ہے۔ انہیں وہ تمام حقوق دیتا ہے۔ جو ایک بلند مرتبت انسانی معاشرہ میں کسی انسان کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ وہ ہرگز اسے گوارا نہیں کرتا کہ کفار یا مشرکین سے اس لئے جنگ کی جائے کہ وہ خدا کو ایک نہیں مانتے۔ وہ اسلام کو اپنا دین نہیں سمجھتے۔ یا قرآن کے احکام و ہدایات پر عمل نہیں کرتے۔ وہ "نصیحت" کرتا ہے۔ "تذکیر" سے کام لیتا ہے۔ "موعظت" کو اختیار کرتا ہے۔ لیکن تلوار کو اس لئے بے نیام نہیں کرتا کہ اس سے لوگوں کے دین و مذہب بدلنے کا کام لیا جائے۔

صلح کی تاکید

ہمارے اس دعوے کی تائید سورہ نساء کی دوسری آیات کریمہ سے ہوتی ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیہم سبیلا

پھر اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں یعنی تم سے نہ لڑیں۔ اور تم سے سلامت روی رکھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی۔

ان آیات کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر

۱۔ کفار جنگ کا سلسلہ بند کر دیں۔

۲۔ صلح کی درخواست کریں۔

۳۔ قتل و خون ریزی کا سلسلہ روک دیں۔

تو پھر ان سے جنگ نہیں کی جا سکتی۔ الفاظ قرآنی پر غور فرمائیے

فما جعل اللہ لکم علیہم سبیلا

کفار کی التجائے صلح کے بعد مسلمانوں کو ان پر دراز دستی کی خدا کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔

"خدا" کا حکم مسلمانوں کے لئے سمع و طاعت کے معنی رکھتا ہے۔ اسی سورہ نساء میں جہاں فتنہ جو اور بدکردار کافروں سے جہاد و قتال کی تاکید فرمائی ہے۔ جہاں انہیں زیر کرنے کی ہدایت کی ہے۔ جہاں ان کا زور توڑنے کی ترغیب دی ہے۔ جہاں ان کی سرکوبی کرنے کی اجازت دی ہے۔ جہاں انہیں جدھر وہ ملیں قتل کر دینے کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے:۔

ستجدون آخرین یریدون ان یامنوکم ویامنوا قومہم کلما ردوا الی الفتنۃ ارکسوا فیہا

بعض ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے۔ کہ وہ یہ چاہتے ہیں۔ کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں۔ اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں جب

فان لم یعتزلوکم ویلقوا الیکم السلم ویکفوا ایدیہم فخذوہم واقتلوہم حیث ثقفتموہم واولٰئکم جعلنا لکم علیہم سلطاناً مبیناہ

کبھی ان کو شرارت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں جا گرتے ہیں۔ سو اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش نہ ہوں۔ اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں تو تم ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دی ہے۔

وہاں اسی سورہ نساء میں صلح کی تجویز منظور کر لینے کا حکم بھی دیا ہے۔ جو شدت حکم قتال میں پائی جا رہی ہے۔ اس سے زیادہ شدت صلح قبول کر لینے کے حکم میں پائی جا رہی ہے جس طرح ان کی سرکوبی ضروری قرار دی تھی۔ اسی طرح سپر انگندگی کے بعد دعوت صلح قبول کر لینے کی تاکید بھی کی جا رہی ہے۔ اگرچہ یہ التجائے صلح دل سے نہ ہو، صرف حالات کو سازگار کر لینے، صرف مسلمانوں کو دھوکہ دینے ہی کی نیت سے کیوں نہ کی جا رہی ہو ——— کسی حالت میں بھی صلح کی التجا ٹھکرائی نہیں جا سکتی۔ وہ صرف اسی لئے ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لہا وتوکل علی اللّٰہ انہ ہو السمیع العلیم ۝ وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللّٰہ ہو الذی ایدک بنصرہ وبالمؤمنین والّف بین قلوبہم

اگر وہ صلح کے لئے جھکیں۔ تو تم بھی جھک جاؤ۔ اللہ پر توکل کرو۔ وہ سمیع و علیم ہے۔ اور اگر تمہیں وہ دھوکہ دینا چاہیں۔ تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔

علامہ جصاص فرماتے ہیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ وان (الخ)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں

والجنوح والمیل ومنه یقال جنحت السفینة اذا مالت والسلم المسالمة ومعنی الآیة انهم ان مالوا الی المسالمة وهی طلب السلامة من الحرب فسالمهم واقبل ذلک منهم[1]

"جنح" کا لفظ آیا ہے۔ "جنوح" کے معنی ہیں کسی طرف مائل ہونے کے۔ چنانچہ جب کشتی کسی جانب مائل ہو جاتی ہے۔ تو کہتے ہیں "جنحت السفینة"۔ اور سلم کے معنی ہیں مسالمہ یعنی سلامتی۔ آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر وہ مسالمت یعنی جنگ سے طلب سلامتی کی طرف مائل ہوں۔ تو مسالمت کر لو۔ اور ان کی پیش کش منظور کر لو۔

یہ اتنی واضح ہدایت ہے کہ اس کے بعد کسی مزید تشریح و تفصیل کی ضرورت نہیں۔

چند اہم نکتے

ان آیات سے باوّل نظر یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ قرآن اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ کفار صلح کی التجا کریں۔ اور اسے ٹھکرا دیا جائے۔ ضروری ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے۔ لیکن اگر امعان نظر سے آیات قرآنی کے الفاظ و مفہوم پر غور کیا جائے۔ تو چند اہم نکتے نظر کے سامنے آتے ہیں۔

ا۔ صلح کی التجا قبول کر لینے کی تاکید کے ساتھ توکل علی اللہ کی ہدایت بھی ہے۔ کہ دشمن جب صلح کی درخواست کرتا ہے۔ تو فاتح اور زور آور حریف بجا طور پر سمجھتا ہے۔ کہ اب یہ کمزور ہو چکا ہے۔ اب اس میں دم نہیں رہا۔ نہ اب یہ لڑ سکتا ہے۔ نہ مزاحمت کر سکتا ہے۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ اس سے صلح کی جائے۔ اسے، اس کی قوت کو، اس کے جذبۂ جنگ کو ہمیشہ کے لئے کچل دیا جائے۔ یعنی صلح جنگ کے میدان میں نہ ہو۔ اس کے شہر میں ہو۔ صلحنامہ پر فریق کی حیثیت سے دونوں فریق غور نہ کریں۔ ایک حاکم بن کر

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۸۵

بن کر صلحنامہ کا مسودہ تیار کرے۔ دوسرا محکوم بن کر صلحنامہ پر دستخط کرے ——————

ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔ آج بھی کہ دنیا عروج کی معراج حاصل کر چکی ہے یہی دستور چلا آتا ہے پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنوں کے سر معاہدہ ورسیلز تھوپا گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان، آسٹریا، جرمنی، اٹلی اور دوسرے محوری ممالک سے جس طرح صلح کی گئی سب کے سامنے ہے۔ گویا اصل اصول یہ قرار پایا گیا کہ ہارے ہوئے فریق کو جب تک ختم نہ کر دو صلح کا نام نہ لو۔ اور اسلام یہ کہتا ہے کہ ہارا ہوا فریق جس وقت اعتراف شکست کرے۔ اس سے ہاتھ ملا لو۔ اس کے دوست بن جاؤ۔ تاکہ دلوں میں کسی قسم کی نفرت عداوت اور تلخی باقی نہ رہ جائے۔ موجودہ ترقی یافتہ دنیا یہ کہتی ہے کہ ہارے ہوئے فریق سے صلح کرنے کے بعد بھی اس کے جنگی جہازوں کو ضبط کر لو۔ اس کے کارخانوں کو ڈھا دو۔ بانیان جنگ سے صلحنامہ پر دستخط بھی کراؤ اور انہیں جلاوطنی اور پھانسی کی سزا بھی دو۔ ان کے مال و منال پر قبضہ کر لو۔ ان کی سرزمین پر اپنی فوجیں رکھو۔ ان کے ہوائی اڈوں کو استعمال کرو۔ ان کی تجارت کو غارت کر دو۔ ان کے بازاروں میں اپنا مال تجارت کھپا دو ان کے سکہ کی قیمت کم کر دو۔ اپنے سکہ کی قیمت میں اضافہ کر لو۔ ان کے مردوں سے بیگار لو۔ ان کی عورتوں سے حرامکاری کرو۔ ان کے مزدوروں کو غلام سمجھو۔ اور اسلام یہ کہتا ہے کہ صلح کے بعد جب تم میں اور حریف میں دشمنی ختم ہو گئی۔ تو پھر دوستی کا پیمان باندھنا چاہیئے۔ اور پیمان دوستی کے بعد تم کسی قسم کا ناجائز دباؤ اس پر نہیں ڈال سکتے ——————

اسلام اور دنیا کا یہ فرق جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے قائم تھا۔ آج بھی قائم ہے اور قرآن یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ قیامت تک قائم رہے گا۔

خدع اور فریب کے ارادہ سے اگر دشمن التجائے صلح کر رہا ہو۔ تو بھی اسے رد نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ دشمن اگرچہ اپنی دانست میں مسلمانوں کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ لیکن

خدا کو تو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ وہ تو سمیع و علیم ہے۔ وہ تو سب کچھ جانتا اور س
کچھ سنتا ہے۔ پھر یہ بھی فرما دیا۔ کہ "فان حسبک اللّٰہ" خدا تمہارے لئے کافی
دشمن اگر دھوکہ دے گا۔ اگر خدا پر تمہارا بھروسہ ہے اور تم اسے کافی سمجھتے ہو۔ پروا نہ
اگر وہ دھوکہ دے گا۔ تو پھر اس سے جنگ کی جا سکتی ہے۔ جس خدا کی مدد سے تم
سرخرو اور کامیاب ہو۔ وہی خدا دوسرے معرکہ میں نہیں تنہا نہ چھوڑے گا اس کی نـ
اور اعانت تمہارے ساتھ ہوگی؛

نکث عہد

اگر انعقاد صلح کے باوجود کفار عہد نامہ پر قائم نہ رہیں عہد نامہ توڑ دیں۔ اور پھر
طغیان و سرکشی پر آمادہ ہو جائیں۔ تو مسلمان کیا کریں؟
سورہ توبہ میں اس صورت مسئلہ کے بارے میں ارشاد ہوا

وان نکثوا ایمانھم من بعد
عھدھم و طعنوا فی دینکم فقاتلوا
ائمۃ الکفر انھم لا ایمان لھم لعلھم
ینتھون ○ الا تقاتلون قوما نکثوا
ایمانھم و ھموا باخراج الرسول وھم
بدءوکم اول مرۃ اتخشونھم فاللّٰہ
احق ان تخشوہ ان کنتم مومنین ○

اور اگر وہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی
قسموں کو توڑ ڈالیں۔ اور تمہارے دین پر طعن
کریں۔ تو تم لوگ اس قصد سے کہ یہ باز آ جائیں
ان پیشوایان کفر سے لڑو۔ ان کے عہد کچھ نہیں
تم ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے۔ جنہوں
اپنی قسموں کو توڑا۔ اور رسول کے جلاوطن کرنے
کی تجویز کی۔ اور انہوں نے تم سے خود پہل
نکالی۔ کیا ان سے ڈرتے ہو۔ سو اللہ تعالیٰ اس
بات کا زیادہ مستحق ہے۔ کہ تم اس سے ڈرو
تم ایمان رکھتے ہو۔

یعنی نکث عہد کے بعد مسلمانوں کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ پہلی

پر عمل کرنے کے پابند نہیں رہتے۔ پھر وہ حق رکھتے ہیں کہ تلوار میان سے باہر نکالیں اور ان بدعہدوں پر ٹوٹ پڑیں۔ پھر انہیں اس کی رخصت ہے کہ وہ جنگ برپا کریں اور اس وقت تک اس کا سلسلہ جاری رکھیں۔ جب تک بدعہد کفار کا زور ٹوٹ نہ جائے جب تک ان کی سرکشی ختم نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ انھوں نے بدعہدی کر کے نکث عہد کر کے خود ہی جنگ کو دعوت دی ہے۔ جب وہ خود ہی جنگ کے داعی ہوئے۔ تو پھر اب انہیں نتائج بھگتنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے سے

از مکافات عمل غافل مشو

گندم از گندم بروید جو ز جو

اپنے اعمال کی جزا ہر شخص کو ملنی ہی چاہیئے۔ کونین کھا کر کوئی یہ توقع نہیں کر سکتا۔ کہ اس کا منہ میٹھا ہوگا۔ یا تو وہ کونین نہ کھاتا۔ یا اگر اسے کام و دہن کے استعمال میں لایا تھا تو اب اس کا ذائقہ برداشت ہی کرنا پڑے گا۔

ایک اہم نکتہ

موجودہ زمانہ میں بھی یہ سوال خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ جنگ ختم کرنے کے لئے کون سی تدبیر عمل میں لائی جائے۔

اور عام طور پر دو ہی صورتیں دنیا میں برتی جا رہی ہیں۔

۱۔ صرف جنگجو سپاہیوں کا بلکہ غیر جنگجو اور امن پسند آدمیوں کا قتل عام کیا جاتا ہے۔ عہد جدید میں آتش ریز بموں کی ایجاد میدان جنگ سے زیادہ شہری آبادی کو ہی ہے۔ برلن۔ لندن۔ پیرس۔ اسٹالن گراڈ سب ہی اس کا ذائقہ چکھ چکے ہیں۔

۲۔ قتل عام کے بعد قتل خواص کی باری آتی ہے۔ اور قتل خواص میں ان تمام لوگوں کو عبرت انگیز سزا دی جاتی ہے جنہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ جنگ میں حصہ لیا تھا۔ لیکن اسلام اس طریقہ کو پسند نہیں کرتا۔

وہ قتل عام کو تو بالکل جائز قرار نہیں دیتا۔

نہ وہ زور اس پر دیتا ہے کہ "ائمہ کفر" کو قتل کیا جائے۔ یعنی ان لوگوں کی جان لی جائے جنہوں نے صلح کے بعد جنگ کی آگ پھر بھڑکائی۔ جنہوں نے عوام کو غلط طریق سے جنگ کے لئے اکسایا جنہوں نے لوگوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھایا۔ اور لڑائی چھیڑ کر ایک بہت بڑی مصیبت کھڑی کر دی۔

جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی اور دوسرے بڑے بڑے شہر تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ کیونکہ ٹرومین کے الفاظ میں جنگ اس کے بغیر ختم کی ہی نہیں جا سکتی تھی"! اس طرح اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ وہ اصولی طور پر طے کر چکا ہے۔ کہ غیر مصافی آبادی کو نہ چھیڑا جائے۔ لہٰذا غیر جنگجو آبادی کے قتل و نہب کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ رہے شریک جنگ لوگ تو ان سے بھی صرف اس وقت تک جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے۔ جب تک برسر پیکار ہوں۔ اگر یہ ہتھیار پھینک دیں یا صلح کی استدعا کریں۔ تو پھر ان کا قتل بھی ناجائز ہو جاتا ہے۔ پھر ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے اور گرفتاری کے بعد بھی حالات معمول پر آنے کے بعد یا تو انہیں فدیہ لے کر چھوڑنا پڑے گا۔ ورنہ ویسے ہی بطور "احسان" آزاد کرنا پڑے گا۔ قرآن کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس نے انہی دونوں چیزوں کی تعلیم دی ہے!

ایک اور حکم

یہود مدینہ کی دراندازیوں، مفسدہ پردازیوں، عہد شکنیوں اور سازشوں کی تاریخ داستان ہمارے موضوع سے فی الحال خارج ہے لیکن تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی اس حقیقت سے ناواقف نہیں کہ یہود کے ساتھ آنحضرتؐ نے زیادہ سے زیادہ رواداری کا برتاؤ کیا۔ ان کی لغزشیں معاف کیں۔ ان کی خطائوں سے درگذر کیا۔

بے ہودگیوں، بدتمیزیوں، فتنہ پسندیوں اور شر انگیزیوں کو نظر انداز فرمایا۔ بار بار انہیں مہلت دی۔ معافی عطا فرمائی۔ زیادہ سے زیادہ ان کے ساتھ رعایت کی۔ معاہدات کا مظاہرہ فرمایا لیکن وہ نہ صرف اپنی روش پر قائم رہے۔ بلکہ ان کی شرارتوں میں یوماً فیوماً اضافہ ہی ہوتا رہا۔ وہ مشرکین مکہ کے سرپرست اور دوست بن گئے۔ انہوں نے مشرکین سے ساز باز کر کے مسلمانوں کو، اسلام کو، داعیٔ اسلام علیہ التحیۃ والسلام کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے حضور رسالتمآب کی جان تک لینے کا ارادہ کر لیا۔ غرض ہر طرح سے ثابت کر دیا کہ وہ کسی رحم، رعایت اور مروت کے مستحق نہیں ہیں۔

تب اسلام کے خدا نے ان سے جہاد کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ملاحظہ ہوں سورہ توبہ کی آیات ذیل:

قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون

اہل کتاب، جو کہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں، جن کو خدا نے اور اس کے رسولؐ نے حرام بتایا ہے۔ اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں۔

قرآن نے ان "اہل کتاب" یعنی یہودیوں کے جرائم کی جو فہرست بیان کی ہے۔ وہ یہ ہے:

۱۔ یہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے۔
۲۔ یوم آخرت پر اعتقاد نہیں رکھتے۔
۳۔ خدا کی اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں قرار دیتے۔
۴۔ دین حق کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

عملاً ان سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن کب تک؟
صرف اس وقت تک جب تک یہ درماندہ ہو کر جزیہ ادا کرنے پر رضامند نہ ہو جائیں

جزیہ کے بعد

جزیہ دینے کے بعد یہ ذمی ہو جائیں گے۔ پھر حضرت علیؓ کے الفاظ میں ان کا مال ہمارے مال کی طرح اور ان کی جان ہماری جان کی طرح ہو جائے گی۔ پھر ان پر کوئی زیادتی نہیں کی جا سکتی۔ ان کے کسی مذہبی معاملہ میں رکاوٹ نہیں ڈالی جا سکتی۔ ان کے ساتھ جنگ نہیں کی جا سکتی۔ غرض انہیں وہ تمام شہری حقوق حاصل ہو جائیں گے جو ایک مسلمان کو اسلامی مملکت میں حاصل ہو سکتے ہیں۔

اور یہ جزیہ بجائے خود کیا ہے؟
ایک بہت ہی حقیر اور معمولی رقم (تفصیل اپنے موقعہ پر آئے گی) وہ بھی اس صورت میں کہ ادا کرنے کی استطاعت ہو۔ اگر استطاعت نہ ہو تو معاف۔ اور اگر بے استطاعتی بہت زیادہ بڑھ گئی ہو تو پھر مسلمانوں کے بیت المال سے ایک ذمی بھی بقدر کفاف رقم لینے کا اتنا ہی مستحق ہے جتنا ایک مسلمان۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے جب ایک ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اس کا روزینہ بیت المال سے مقرر فرما دیا۔ اور فرمایا یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ خوشحالی کے زمانہ میں ہم ان سے رقم لیں۔ اور بدحالی کے زمانہ میں بے یار و مددگار چھوڑ دیں۔

آیات بالا اگرچہ ایک خاص موقعہ اور وقت پر نازل ہوئیں لیکن قرآن چونکہ وقتی چیز نہیں دائمی ہے۔ اسی طرح اس کے احکام و ہدایات بھی وقتی نہیں دائمی ہیں۔ لہذا احکام بھی اپنے شروط کے ساتھ ہر جگہ واجب التعمیل ہیں!

مشرکین سے حکم جہاد

اہل کتاب کے بارے میں آیات بالا سے کافی امور پر روشنی پڑ چکی۔ اب مشرکین

حکم جہاد پر کچھ گفتگو کریں گے۔

شروع میں مسلمانوں کو جن لوگوں سے تکلیفیں پہنچیں۔ اور جن سے جنگ و پیکار کی نوبت آئی۔ وہ دو ہی فریق تھے۔

۱۔ قریش مکہ

۲۔ یہود مدینہ

قریش مکہ کو یہ کد تھی کہ ایک نیا دین جو ان کے آباؤ اجداد کے دین سے قطعاً مختلف ہے۔ کیوں ابھر رہا ہے۔ اس کے ابھرنے کے معنے تھے ان کی چودھراہٹ اور سرداری کا خاتمہ!

تقریباً یہی کیفیت یہود مدینہ کی تھی۔

یہود مدینہ، مشرکین مدینہ پر اپنے مال و دولت کے باعث چھائے ہوئے تھے۔ وہ ان کی عورتوں کو، اولاد کو، اور دوسری قیمتی چیزوں کو رہن رکھ لیتے تھے چند روپے ٹکے دے کر۔ یہود سے وہاں کے لوگ اتنے مرعوب تھے کہ جیسے ہندوستان کی بڑی بڑی درگاہوں پہ نذر نیاز کے لئے، دعا اور منت کے لئے ہزاروں کی تعداد میں غیر مسلم آتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں منتیں مانتے ہیں۔ اسی طرح مدینہ کے لوگ یہود کی روحانی عظمت سے مرعوب و متاثر تھے۔ بے اولاد یہاں تک منت کر لیتے تھے۔ کہ اگر اولاد ہوئی تو پہلی اولاد کو یہودی بنا دیں گے!

لیکن اسلام کے نمودار ہونے کے بعد یہود کا یہ دبدبہ ختم ہو گیا۔ اسلام ایک عوامی مذہب تھا۔ اس کے ہاں نہ نذر نیاز کی ضرورت تھی نہ گنڈے تعویذ کی نہ چڑھاوے کی۔ وہ چند صاف، سادہ اور سیدھی سادی تعلیمات کا مجموعہ تھا۔ اور یہ تعلیم لوگوں میں عام ہو رہی تھی۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ دین پھیل رہا تھا۔ پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

بجا طور پر یہود اس دین سے خائف تھے۔ وہ جانتے تھے اگر یہ دین پھیل گیا تو وہ

کہیں کے نہ رہیں گے۔ ان کی ساہوکاری ختم ہو جائے گی۔ ان کی روحانی عظمت کا آفتاب ڈوب جائے گا۔ ان کی دھاک اور ساکھ کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ وہ بھی عام لوگوں کی طرح ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ مشرکین قریش سے زیادہ اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

اسلام کو دونوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور اس نے خاص حالات اور خاص شرائط کے ساتھ دونوں سے مقاتلہ کی اجازت دی۔ لیکن اس تاکید کے ساتھ

ان اللّٰہ مع المتقین — بے شک خدائے بزرگ و برتر متقی لوگوں کے ساتھ ہے۔

اور متقی کی علامت یہ ہے۔ کہ وہ کسی حالت میں بھی جادۂ انصاف سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ کسی حالت میں بھی خدا کے عائد کئے ہوئے آداب و شروط کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کسی حالت میں بھی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا۔ جو ایک "متقی" کی شان کے خلاف ہو۔

گویا ان مختصر الفاظ میں مسلمانوں کو یہ تاکید کر دی گئی کہ اگرچہ مشرکین کی پیش قدمی کے باعث مقاتلہ کی اجازت ہے لیکن ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جا سکتی۔ ان کے ساتھ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی ناجائز بات کے ماننے پر انہیں مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ جس مذہب اور جس مسلک پر وہ عامل ہیں۔ اس سے انہیں روگرداں کرنے کی کوشش نہیں کی جا سکتی۔ ان سے کوئی ایسا محصول نہیں لیا جا سکتا جو خلاف شرع ہو۔ ان سے کوئی ایسی خدمت نہیں لی جا سکتی جس سے ان کے جذبات مجروح ہوتے ہوں۔ ان سے کوئی ایسا کام نہیں لیا جا سکتا۔ جو عدل و راستی اور تقوے کے خلاف ہو۔ اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ متقی نہیں اور جو متقی نہیں۔ خدا اس کے ساتھ نہیں!

قرآن کی صلح پسندی

قرآن کریم کا جتنا جتنا امعان نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح تر ہوتی چلی جائے گی۔ کہ وہ صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ صرف

بدرجۂ مجبوری جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ اور جنگ کی اجازت کے ساتھ ساتھ وہ ایسے قیود و شرائط عاید کر دیتا ہے کہ جنگ کا دائرہ مختصر تر ہو جائے۔ جنگ کی لپیٹ میں کم سے کم لوگ آئیں۔ کوئی ایسی بات مسلمانوں کی طرف سے روا نہ ہو جو عدل اور تقویٰ کے خلاف ہو۔ اور پھر جب کفّار کی طرف سے صلح کی استدعا کی جائے۔ تو وہ فوراً قبول کر لی جائے۔

صرف یہی نہیں وہ غیر مسلموں کے ساتھ بشرطیکہ وہ مسلمانوں سے برسرِ پیکار نہ ہوں عام اخلاق و مدارات کی اجازت بھی دیتا ہے۔ چنانچہ سورۂ ممتحنہ میں ارشاد ہوا ہے۔

لا ینھاکم اللّٰہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللّٰہ یحب المقسطین ۝ انما ینھاکم اللّٰہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولٰئک ھم الظالمون ۝

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا۔ جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے۔ اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں۔ (خواہ بالفعل یا بالعزم) اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور (اگر نکالا بھی نہ ہو لیکن) تمہارے نکالنے میں نکالنے والوں کی مدد کی ہو) اور جو شخص ایسوں سے دوستی کرے گا سو وہ گنہگار ہوگا!

ان آیاتِ کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ کفار میں سے جو لوگ

۱۔ مسلمانوں سے مقاتلہ نہ کرتے ہوں۔

۲۔ مسلمانوں کے اخراج وطن (جلاوطنی) کا سبب نہ بنے ہوں۔

ان کے ساتھ آشتی اور رواداری کا برتاؤ کیا جاسکتا ہے۔ شدت صرف انہی غیر مسلموں کے ساتھ ہے، جو ان جرائم کے مرتکب ہو چکے ہوں۔

یہ اتنی شاندار رواداری ہے جس کی نظیر نہ کسی دوسری مذہبی کتاب میں نہ انسانوں کے بنائے ہوئے کسی دستور اساسی میں نہ عہد ماضی میں نہ حال کے ترقی یافتہ اور وسعت پذیر دور ارتقا میں مل سکتی ہے۔

اسلام کو بدنام کرنے والے نہ جانے کیوں اسلام کو متہم کرتے وقت ان حقائق کو نظرانداز کردیتے ہیں؟

استدراک:

دشمنوں سے لڑنے کا حکم

گذشتہ ابواب میں جو گفتگو جہاد و قتال کے بارے میں ہم نے کی ہے۔ وہ موضوع کے متعلقات پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ پھر بھی وقاتلوا فی سبیل اللہ کی آیۂ کریمہ پر وہ خیالات بھی ہم قارئین کی خدمت میں پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ جن کا سر سید احمد خاں نے اپنی تفسیر القرآن "الھدیٰ و الفرقان" میں اظہار کیا ہے۔ سر سید کے تفسیری انداز فکر سے جائز وجوہ پر بہت سے علماء کو اختلاف ہے لیکن مندرجہ ذیل افکار ہمارے خیال میں ایسے نہیں ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکے۔

"وقاتلوا فی سبیل اللہ، اس آیت میں اور جو آیتیں اس کے بعد ہیں اُن میں کافروں یا دشمنوں سے لڑنے کا حکم ہے۔ گر صاف بیان کیا گیا ہے کہ جو تم سے لڑیں، ان سے لڑو اور زیادتی مت کرو۔

اکثر لوگ مذہب اسلام پر یہ طعنہ دیتے ہیں کہ اس میں تحمل اور بردباری اور عاجزی اور مذہب کے سبب سے جو تکلیفیں کافروں کی طرف سے پہنچیں اُن کی صبر سے برداشت نہیں ہے۔ اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور نیکی اور اخلاق اور خدا کی راہ میں تکالیف برداشت کرنے کے برخلاف ہیں۔

مگر یہ ایک بڑی غلطی اور ناسمجھی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآن مجید میں جو احکام لڑائی کے نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے۔ ان کو مسلمانوں نے جو بادشاہوں یا خلیفوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ دینداری کے بہانے سے اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لئے نہایت بد اخلاقی اور ناانصافی سے بڑھنا اور وحشی درندوں سے بھی بدتر کام کئے۔ اور علمائے کرام نے ان کی تائید کے لئے ایسے مسئلے بیان کئے۔ جو اسلام کی روحانی نیکی کے خلاف تھے۔ مگر ان کے ایسا کرنے سے جو برائی یا عیب قرار دیا جائے وہ انہی پر محدود ہے جنہوں نے ایسا کیا نہ اسلام پر۔ ہر ایک منصف مزاج کا اور ہر ایک معترض اور نکتہ چین کا یہ فرض ہے کہ اُن ظالموں کے کردار کو انہی پر محدود رکھے نہ یہ کہ ان کے کردار سے مذہب اسلام پر نکتہ چینی کرے۔

مذہب اسلام میں اگرچہ جابجا عفو و تحمل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور لوگوں کو اس پر رغبت دلائی گئی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ بدلہ لینے کی بھی بغیر زیادتی کے اجازت دی ہے کیا یہ قانون دنیا کے پیدا کرنے والے کے قانون قدرت کے منافی نہیں ہے؟ اور کیا اس قانون سے زیادہ عمدہ اور سچا کوئی قانون ہو سکتا ہے؟ انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے۔ تو بہت سی ایسی باتیں اور ایسے اصول بیان کرتا ہے۔ جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اور سننے اور پڑھنے والے خیال کرتے ہیں۔ کہ یہی اصول اخلاق کے اور یہی اصول اعلیٰ درجہ کی نیکی کے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ ہوا کی آواز سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتے۔ اور جو کہ وہ اصول فطرت انسانی کے بلکہ قانون قدرت کے برخلاف

ہوتے ہیں۔ کبھی اُن پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔ ایسا قانون بنانے سے جس پر کبھی عملدرآمد نہ ہو سکے کوئی نتیجہ اور فائدہ مترتب نہیں ہوتا۔ بلکہ دل میں اُس قانون کی حقارت بیٹھتی ہے کہ وہ قانونِ قدرت کے برخلاف ہے۔

کوئی کتاب دنیا میں انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بردبار اور متحمل کرنے والی اور اخلاق کو ایسی چمک سے دکھلانے والی جس سے آنکھوں میں چکاچوند آجائے نہیں ہے۔ گو اس کے مقولے ایسے نہیں ہیں کہ سب سے پہلے اُسی میں بیان کئے گئے ہوں۔ بلکہ بہت سے ایسے ہیں جو اُس سے پہلے لوگوں نے بھی جن کے پیرو صاحب بت پرست اور کافر گنے جاتے ہیں بیان کئے ہیں مگر ہم کو دیکھنا چاہیئے۔ کہ ان کا لوگوں میں کیا اثر ہوا تھا۔ انجیل میں لکھا ہے کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دے۔ بلاشبہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے؟ اگر دنیا اس پر عمل کرے تو دنیا کا کیا حال ہو؟ اسی طرح آباد ہے اور اسی طرح لوگوں کی جان و مال امن میں رہیں۔ نہایت دلچسپ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جب سب کے سب ایسے ہی ہو جائیں تو دنیا سے شر اٹھ جائے۔ مگر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہے؟ یا کبھی ایسا ہو گا؟ یہ سب ناشدنی باتیں ہیں۔ جو خیال میں شدنی قرار دے کر انسان جھوٹی اور خیالی خوشی حاصل کرتا ہے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ تو اپنے کل کے کھانے کی فکر مت کر۔ خدا کل کی روزی پہنچانے کی فکر کرنے والا ہے۔ دل کو یہ مقولہ نہایت ہی پیارا اور اس پیارے خدا پر اعتماد کرنے والا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کبھی کسی نے اس پر عمل کیا ہے؟ یا آئندہ کبھی اس پر عمل ہو گا؟ اگر ہم اس ناشدنی امر کو ایک لمحہ کے لئے شدنی تصور کر کے تمام دنیا کے لوگوں کو اسی مقولہ پر عمل کرتا ہوا سمجھ لیں تو دنیا کا کیا حال ہو گا؟ پس اس قسم کی تعلیم باتیں انسان کو دھوکہ دینے والی ہیں۔ اور قانونِ قدرت کے برخلاف ہونے سے خود بھی سچائی کو مشتبہ کرتی ہیں۔

عیسائی مذہب جس کی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق میں لگائی گئی تھی۔ وہ پھولا
پھلا اور سرسبز و شاداب ہوا۔ اس کو چھوڑ دو کہ وہ کس سبب سے بڑھا اور سرسبز ہوا۔ مگر دیکھو
کہ اس نے کیا پھل پیدا کیا۔ ایک بھی نصیحت اس کی کام نہ آئی اور خود مذہب نے جو خونریزی
اور بے رحمی اور ناانصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بدخصلت دکھائی وہ تمام دنیا
میں بے مثل ہوگی اور جس نیکی میں اس کی جڑ لگائی گئی تھی۔ اس نے کچھ پھل نہیں دیا کیونکہ
قانون قدرت کے برخلاف لگائی گئی تھی جو خوبی کیا روحانی اور کیا اخلاقی اور کیا تمدنی اب
ہم جن عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں کیا یہ پھل اسی درخت کا ہے۔ جس کی جڑ ایسی نیکی
میں لگائی گئی تھی جو خلاف قانون قدرت تھی۔ حاشا و کلا۔ بلکہ یہ اس کا پھل ہے کہ
اس درخت کو وہاں سے اکھاڑ کر دوسری زمین پر لگایا ہے جو قانون قدرت کی زمین ہے
اور جس قدر کہ پہلی زمین کی مٹی اس کی جڑ میں لگی ہوئی ہے۔ اسی قدر اس میں نقصان ہے۔
اس سے بھی زیادہ رحیم مذہب کا حال سنو جس نے ایک چھوٹے سے چھوٹے جانور
کی جان کو بھی مارنا سخت گناہ قرار دیا ہے۔ خون کا بہانا آدمی کا ہو یا درندے یا ایک پشہ کا۔
خدا کی صنعت کو ضایع کرنا سمجھا ہے۔ مگر تاریخ اور زمانہ موجود ہے۔ اس اصول نے جو
قانون قدرت کے مخالف تھا کیا نتیجہ دیا۔ قتل و خونریزی ویسی ہی رہی اور ویسی ہی ہے۔
جیسی کہ قانون قدرت سے ہونی چاہیے۔ وہی جو ایک پشہ کا مارنا گناہ عظیم سمجھتے تھے
ہزاروں آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتے تھے اور قتل کرتے ہیں۔ پس کوئی قانون جو ظاہر
میں کیسا ہی چمکیلا اور خوش آیند ہو جبکہ قانون قدرت کے برخلاف ہے محض نکما اور
بے اثر ہے۔ اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے۔ کہ اس کے تمام قانون، قانون قدرت کے
مطابق اور عملدرآمد کے لایق ہیں۔ رحم کی جگہ جہاں تک کہ قانون قدرت اجازت دیتا
ہے رحم ہے۔ معافی کی جگہ اسی اصول پر معافی ہے۔ بدلے کی جگہ اسی کے مطابق بدلہ ہے
لڑائی کی جگہ اسی کے اصول پر لڑائی ہے۔ ملاپ کی جگہ اسی کی بنا پر ملاپ ہے۔ اور یہی

بڑی دلیل اس کی سچائی کی اور قانون قدرت کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی ہے۔
اسلام فساد، دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا جس نے ان کو امن دیا ہو۔
مسلمان ہو یا کافر اس کی اطاعت اور احسانمندی کی ہدایت کرتا ہے۔ کافروں کے ساتھ
جو عہد و اقرار ہوئے ہوں ان کو نہایت ایمانداری سے پورا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ خود
کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خونریزی کی اجازت نہیں دیتا۔
کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اس میں بالجبر اسلام پھیلایا جائے حملہ کر کے مغلوب و
مجبور کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں
چاہتا۔ صرف دو صورتوں میں اس نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ ایک اس حالت
میں جبکہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کے معدوم کرنے کی غرض سے نہ کسی ملکی
اغراض سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں۔ خواہ
مسلمان مسلمانوں میں خواہ مسلمان و کافروں میں، وہ دنیاوی بات ہے۔ مذہب سے
کچھ تعلق نہیں ہے۔ دوسرے جبکہ اس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان
ہیں ان کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو۔ مگر اس
حالت میں بھی اسلام نے کیا عمدہ طریقہ ایمانداری کا بتایا ہے۔ کہ جو لوگ اس ملک میں
جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں یا امن کا علانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو۔ گو صرف بوجہ اسلام
ان پر ظلم ہوتا ہو۔ تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت
کر کے یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ ہاں جو لوگ خود مختار ہیں۔ اور اس ملک میں
امن لئے ہوئے یا بطور رعیت کے نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں۔ ان کو
ان مظلوم مسلمانوں کے بچانے کو جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہے یا ان کے لئے
امن اور ان کے لئے اور اپنے فرض مذہبی کی آزادی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت
دی ہے۔ لیکن جس وقت کوئی ملکی یا دنیوی غرض اس لڑائی کا باعث ہو اس کو مذہب

اسلام کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا۔

یہی بات ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے یہی لڑائی ہے جس کے کرنے کی ترغیب دی ہے یہی لڑائی ہے جس کا نام جہاد رکھا ہے یہی لڑائی ہے جس کے مقتولوں کو روحانی ثواب کا وعدہ دیا ہے یہی لڑائی ہے جس کے لڑنے والوں کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی لڑائی ناانصافی اور زیادتی ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اسلام کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہ ہوتا بلکہ دوسرا گال پھیر دینا خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا؟

لڑائی شروع ہونے کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے۔ اس میں بجز اس کے کہ دشمنوں کو قتل کرو۔ لڑائی میں بہادری کرو۔ دل کو مضبوط رکھو میدان میں ثابت قدم رہو۔ فتح کر دیا مارے جاؤ اور کچھ نہیں کہا جاتا۔ وہی قرآن نے بھی کہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اس موقعہ و محل کو جس کی نسبت قرآن میں لڑنے والوں کے دلوں کو مضبوط کرنے کی آیتیں نازل ہوئی ہیں چھوڑ کر ان آیتوں کو عموماً خونخواری اور خونریزی پر منسوب کرے۔ جیسا کہ اکثر نادان عیسائیوں نے کیا ہے۔ تو یہ خود اس کا قصور ہوگا نہ کہ اسلام کا۔

لڑائی میں بھی جو رحم قانون قدرت کے موافق منظور ہے اسلام نے اس میں بھی فروگذاشت نہیں کیا۔ عورتوں کو، بچوں کو، بوڑھوں کو جو لڑائی میں شریک نہ ہوتے ہوں ان کو قتل کرنے کی ممانعت کی۔ عین لڑائی میں اور صف جنگ میں جو مغلوب ہو جانے اُس کے قتل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ صلح کو، معاہدہ امن کو قبول کرنے کی رغبت دلائی باغ کو کھیتوں کو جلانے کی ممانعت کی۔ قیدیوں کو احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ نہایت منصفانہ طریقہ جو لڑائی کے قیدیوں کو عورت ہوں یا مرد غلام اور لونڈی بنانے

کا تھا اُس کو صدور صدم کیا۔ اس سے زیادہ لڑائی کی حالت میں انصاف اور رحم کیا ہو سکتا ہے ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے اس دین سے کسی کی بھی پوری تعمیل نہیں کی بلکہ برخلاف اس کے بے انتہا ظلم و ستم کئے۔ مگر جبکہ وہ اسلام کے حکم کے برخلاف تھے تو اسلام کو اُس سے داغ نہیں لگ سکتا وہ بھی تو مسلمانوں ہی میں سے تھے جنہوں نے حضرت عمرؓ، عثمانؓ علیؓ، حسینؓ کو ذبح کر ڈالا تھا۔ کعبہ کو جلایا تھا پس اُن کے کردار سے اسلام کو کیا تعلق ہے؟

مشرکین مکہ نے ان لوگوں پر جو مسلمان ہو گئے تھے صرف اسلام کی عداوت سے اور خود رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم پر بہت سے ظلم کئے تھے اور تکلیفیں پہنچائی تھیں قتل کے درپے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ مسلمانوں نے حبشہ میں جا کر پناہ لی اور آخر کار آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمان مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے آئے۔ پھر انہوں نے وہاں بھی تعاقب کرنا چاہا۔ اور مکہ میں حج کے آنے سے روکا۔ لڑائی پر آمادہ ہوئے تب اسلام نے بھی اُن سے لڑنے کا حکم دیا پس جس قدر احکام قتل مشرکین کے ہیں۔ وہ سب انہی لڑائیوں سے متعلق ہیں۔ وہ بھی اسی وقت تک کہ فتنہ و فساد رفع ہو جائے۔ جیسے کہ خود خدا نے فرمایا ہے "وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله" امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ مشرکین کا فتنہ یہ تھا کہ وہ مکہ میں مسلمانوں کو مارتے تھے۔ اور ایذا دیتے تھے تنگ ہو کر مسلمان حبشہ کو چلے گئے۔ پھر بھی وہ برابر ایذا اور تکلیف دیتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمان مدینہ کو ہجرت کر گئے۔ اور مشرکین کی غرض ایذاؤں اور تکلیفوں سے یہ تھی۔ کہ مسلمان اپنا اسلام چھوڑ کر پھر کافر ہو جائیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ کافروں سے لڑو جب تک کہ ان پر غالب ہو جاؤ۔ تاکہ وہ تم کو تمہارے دین سے پھیرنے کے لئے ایذا نہ دے سکیں۔ اور تم شرک میں نہ پڑو۔

"یکون الدین للہ" کا فقرہ بھی انہی آیتوں کے ساتھ ہے، جو مشرکین عرب کے حملے کے دفعہ کرنے کو لڑنے کی بابت نازل ہوئی ہیں۔ اس کے یہ معنی سمجھنے کہ اتنا لڑنا چاہیئے کہ اسلام کے سوا کوئی دین نہ رہے۔ یہ تو محض نادانی کی بات ہے، جو سلف سے آج تک نہ کبھی ہوئی۔ اور نہ ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ اس کے معنے صاف صاف یہ ہیں کہ اس قدر لڑنا چاہیئے کہ اللہ کے دین کے بجالانے میں جو کافر حرج ڈالتے ہیں، وہ دور ہیں۔ اور اللہ کے لئے دین ہو جائے کہ مسلمان خدا کے لئے اس کو بے ایذا کے بجا لا سکیں[1]۔

---

[1] المدخل والعشرقان۔ ج ۱ صفحہ ۲۰۴ تا ۲۵۸

معاہدات کا احترام

احکام و تعلیمات قرآنی کی روشنی میں

جس مذہب نے محکوم غیر مسلموں کے لئے "جزیہ" کا اصول مقرر کیا ہو۔ اور برسر جنگ غیر مسلموں سے عہد و پیمان کے ایفاء پر زور دیا ہو اور مرتدین کے ساتھ بھی کوئی سختی روا نہ رکھتا ہو۔ اس کے بارے میں کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اپنی اشاعت میں اس نے تلوار سے مدد لی ہو گی لہٰذا اس بہت فرسودہ اور بے انتہا پامال موضوع گفتگو سے صرف نظر کر کے ہم معاہدات سے متعلق قرآن کے احکام و تعلیمات زیر بحث لائیں گے

عام تعلیم

عہد و عقد کے ایفا کے بارے میں قرآن کریم کی واضح اور عام تعلیم یہ ہے

یاایہا الذین آمنوا اوفوا بالعقود — مسلمانو! معاہدوں کو پورا کرو

نیز فرمایا

واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا — پاس عہد کرو۔ اس لئے کہ عہد کی بازپرس ہوگی۔

جس مذہب میں عہد و عقد کی اتنی اہمیت ہو کہ وہ اپنی کتاب تشریع میں اس کے ایفا کا ذکر کرے۔ اور اس پر زور دے۔ وہ کسی قیمت پر اسے گوارا کر ہی نہیں سکتا۔ کہ مسلمان آپس میں تو پاس عہد کریں لیکن غیر مسلموں سے جب معاملہ پڑے تو بدعہدی پر اتر آئیں جس مذہب کی بنیادی تعلیم تقویٰ ہو۔ وہ اپنے پیروؤں کی اس معاملہ میں ہرگز حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ کہ وہ غیر مذہب والوں کے ساتھ نکث عہد کے مرتکب ہوں جس مذہب کا خدا "رب المسلمین" نہ ہو۔ بلکہ "رب العالمین" ہو۔ وہ اسے کیونکر گوارا کر سکتا ہے۔ کہ اس کے ماننے والے معاملات و معاہدات میں اس کے بندوں کے درمیان مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کریں۔ سچائی بہرحال سچائی ہے۔ خواہ اس کا تعلق مسلم سے ہو یا غیر مسلم سے۔ حسن معاملت بہرحال اچھی چیز ہے۔ اور بدمعاملگی بہرحال بری چیز ہے۔ خواہ فریقین میں کوئی مسلمان ہو اور کوئی غیر مسلم؛

مشرکوں کا ذکر

قرآن یوں تو مسلمانوں کے سوا یعنی ان لوگوں کے سوا جو اسے مانتے ہیں۔ کسی کو بھی راہ یاب نہیں سمجھتا لیکن وہ اہل کتاب اور مشرکین کی تفریق بھی قائم کرتا ہے۔ مثلاً اہل کتاب کے ہاتھ کا ذبیحہ مسلمان کے لئے جائز ہے۔ کتابیہ عورت کے ساتھ نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس مشرکین کے ہاتھ کا نہ ذبیحہ جائز ہے نہ مشرکہ کے ساتھ نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اور اس تفریق کی وجہ بھی ظاہر و باہر ہے۔ اہل کتاب بہرحال خدا کو مانتا ہے۔ صرف نبوت کے بارے میں کفر و ریب کا اظہار کرتا ہے۔ اور مشرک نہ خدا کو مانتا ہے نہ رسول کو۔ مجرم دونوں ہیں۔ لیکن ایک کا جرم جرم ہے۔ دوسرے کا جرم جرم عظیم ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کے نزدیک بدترین گروہ وہ ہے۔ جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک

ٹھہراتا ہے۔ اور ایک خدا کے بجائے بہت سے معبودوں کے سامنے سرِ عبودیت جھکاتا ہے لیکن ان مشرکین کے بارے میں بھی قرآن اعلانِ برأت کے بعد مسلمانوں سے (ملاحظہ ہو سورۂ براۃ) کہتا ہے۔

الا الذین عاهدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئًا ولم یظاهروا علیکم احدًا فاتموا الیهم عهدهم الی مدتهم ان الله یحب المتقین ۝

مگر ان مشرکوں میں سے جن سے تم نے عہد کیا تھا۔ پھر انہوں نے اپنا عہد پورا کرنے میں تم سے کوئی کمی نہیں کی۔ اور نہ تمہارے مقابلہ میں کسی (تمہارے دشمن) کی مدد کی۔ تو جو مدت مقرر ہو چکی تھی۔ اس تک ان کا عہد پورا کرو بے شک اللہ پرہیزگاری کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

یعنی اس اعلانِ برأت کے باوجود

۱۔ مسلمان مشرکین سے نقضِ عہد نہیں کر سکتے۔

۲۔ معاہدہ میں کسی قسم کا ردّوبدل نہیں کر سکتے۔

۳۔ کسی معاہد مشرک کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔

۴۔ عہدنامہ کو وقت مقررہ تک ماننے اور برتنے پر مجبور ہیں۔

اور پھر آخر میں تاکید کے ساتھ فرمایا جاتا ہے ان الله یحب المتقین یعنی یاد رکھو اللہ تعالیٰ متقین کو دوست رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہوا۔ کہ مشرکین جیسے مبغوضین کے ساتھ بھی معاہدات کا احترام کرنا تقویٰ ہے۔

پھر اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر ارشاد ہوا۔

الا الذین عاهدتم عند المسجد الحرام فما استقاموا لکم فاستقیموا لهم

بجز ان مشرک لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا۔ وہ جب تک

ان اللہ یحب المقسطین ٥ — اپنے معاہدہ پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

ان آیات کا مفہوم بھی وہی ہے۔ لیکن یہاں تقویٰ سے قطع نظر قسط کا یعنی عدل و انصاف کا بھی ذکر فرمایا۔ آخری الفاظ ہیں " ان اللہ یحب المقسطین " یعنی یاد رکھو خدا انصاف پسندوں کو محبوب رکھتا ہے۔

اب متقین اور مقسطین دونوں ایک ہو گئے۔

یعنی مذہب کی اندھادھند حمایت اور مذہب کے نام پر دھاندلی "تقویٰ" نہ سمجھ لی جائے۔ "تقویٰ" بغیر "قسط" یعنی عدل و انصاف کے مکمل نہیں ہو سکتا ——

—— یہ احتیاطیں اور پیش بندیاں ہیں قرآن کریم کی، مشرکین کے بارے میں جن سے بڑھ کر مبغوض خدا کی نگاہ میں کوئی نہیں۔

اور پھر ایک سرسری نظر ان مشرکین کے پس منظر پر بھی ڈال لیجیے۔ ظاہر ہے وہ مشرکین ہیں جو مکہ کے باشندے ہیں۔ انہوں نے دعوت اسلام کے رد کرنے میں اور داعیٔ اسلام کو ایذا دینے میں کوئی ننگ انسانیت دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہ سنگ گراں بن کر تبلیغ اسلام کے راستے میں حائل ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اسلام کا پیام نہیں سنا۔ بلکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی جان عزیز تک کے گاہک ہو گئے۔ پھر جب مسلمان ان کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت پر مجبور ہوئے تو یہی تھے جنہوں نے بہا جر مسلمانوں کو بھی طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ ان کے گھر بار اور اثاثہ پر جبری قبضہ کر لیا ان کی دولت و املاک کو اپنے تصرف میں لے آئے۔ ان کی بیویوں، بچوں اور اہل خاندان کو روک لیا۔ اور پھر جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے تو یہی تھے جو بار بار ان پر یورش کرتے تھے، حملے کرتے تھے۔ لڑائیاں لڑتے تھے، معاہدے کرتے تھے اور توڑ دیتے

تھے۔ جو مسلمان ان کے قبضہ میں آ جاتا تھا۔ اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیتے تھے۔ لیکن اب مشرکین کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اب اسلام غالب تھا اور شرک مغلوب جاء

الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا ۝

کر میں عسکر اسلام فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ آج یہ سارے مشرکین اس کے رحم پر تھے۔ ماضی کو پیش نظر رکھ کر آج ہر تعدّی ان پر جائز تھی۔ ہر ظلم ان پر روا تھا۔ ہر زیادتی کے یہ سزاوار تھے۔ خدا اور اس کا رسول ان سے برأت کا اظہار کر چکا تھا۔

براءة من الله ورسوله الى	یہ اعلان بیزاری ہے۔ اللہ اور اس کے
الذين عاهدتم من المشركين	رسول کی جانب سے ان مشرکوں کے لئے
	جن سے تم نے عہد کیا ہے

اور یہ ہر اعتبار سے اس قابل بھی تھے۔ کہ ان سے برأت کا اظہار کیا جاتا۔ یہ اب بے یار و مددگار تھے۔ اب نہ ان کے پاس قوت تھی نہ طاقت نہ تلوار، نہ خنجر۔ ان کی گردنوں کو دنیا کے عام رسم و رواج کے مطابق بڑی آسانی سے کاٹا جا سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے یہ نہیں کیا۔ اس نے صرف ان سے برأت کا اظہار کیا۔ اور اظہار برأت کے ساتھ ساتھ یہ تاکید کر دی کہ ان سے جو معاہدے کئے جا چکے ہیں، جو پیمان باندھے جا چکے ہیں۔ ان کا پورا پورا احترام کیا جائے۔ ایسے نازک ترین، ہیجان انگیز اور اشتعال انگیز موقعہ پر عدل و قسط کا دامن تھامے رہنا صرف ایک نبی کا اور صرف ایک آسمانی کتاب ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

مومن اور کافر کی دیت

غیر ارادی طور پر اگر کوئی آدمی کسی آدمی کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔ تو اسے سزائے قتل نہیں دی جا سکتی۔ ہاں سزا ضرور ملتی ہے۔ تاوان ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ قدیم زمانہ میں دوسرے مذاہب اور موجودہ عہد میں دوسری قوموں اور ملتوں کے ہاں ایسے مواقع پر حاکم اور محکوم کا امتیاز موجود ہے۔ لیکن اسلام نے اس امتیاز کو بھی پسند نہیں فرمایا

اس نے سورہ نساء میں معاہد فرد کی دیت یہ مقرر کی ہے۔

وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق فدیة مسلمة الی اھلہ وتحریر رقبة مؤمنة

اگر وہ مقتول ایسی قوم (غیر مسلم) سے ہو جس کے اور تمہارے مابین معاہدہ ہو۔ تو اس کے ورثاء کو دیت ادا کی جائے گی۔ اور ایک مومن غلام کا آزاد کرنا۔

اور بالکل یہی دیت ایک مسلمان کی بھی ہے۔ یعنی اگر کوئی مسلمان کسی کے ہاتھوں غیر ارادی طور پر ہلاک ہو جائے۔ تو اس کی دیت قرآن نے یہ رکھی ہے۔

ومن قتل مومنا خطأ فتحریر رقبة مؤمنة ودیة مسلمة الی اھلہ الا ان یصدقوا

جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن غلام کو آزاد کرے۔ اور اس کے ورثا کو دیت دے۔ بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔

اس طرح ایک کافر (معاہد) اور ایک مسلمان میں مساوات قائم ہو گئی۔ دونوں میں کسی قسم کا فرق و امتیاز نہ رہا۔ بلکہ اور زیادہ تلاش و تفحص سے کام لیجئے تو معلوم ہوگا۔ کہ کافر کا پلہ مسلمان پر بھاری رہا اور مسلمان اس سے فروتر ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

فان کان من قوم عدو لکم وھو مومن فتحریر رقبة مؤمنة

اور اگر وہ مقتول دشمن قوم کا ہو اور وہ مومن ہو تو ایک مومن غلام آزاد کرے۔

ان الفاظ سے کیا نتیجہ مستنبط ہوتا ہے

یہ کہ دشمنوں کے ملک میں رہنے والے مسلمان کی دیت (خون بہا) مسلمان ملک میں رہنے والے غیر مسلم سے کم قرار پائی یعنی پہلی صورت میں خون بہا (ضروری) اور لازمی تھا۔ اب خون بہا صرف "تحریر رقبة" یعنی غلام کا آزاد کرنا رہ گیا۔

اس بات کو اگر ایک مثال کی صورت میں پیش کیا جائے۔ تو صورت مسئلہ اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

یعنی اگر خدانخواستہ ہندوستان "دشمن ملک" قرار دیا جائے تو ایک ہندوستانی مسلمان کی دیت پاکستانی غیر مسلم سے کم ہوگی۔

غیر مسلموں سے رواداری، وسعت قلب اور شفقت کی اس سے بڑی کوئی مثال مل سکتی ہے؟

حسب پیرہ بالا

اور آگے چلئے

قرآن ایک اور بات کہتا ہے۔ اور یہ بات بھی دنیا کو چونکا دینے والی ہے۔ یعنی تمام حقوق پر ہر قسم کے حقوق پر بالا فائق اور ممتاز جو چیز ہے۔ وہ ہے غیر مسلم سے کیا ہوا عہد!

ارشاد فرمایا:۔

وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علی قوم بینکم وبینھم میثاق ۔

اور اگر کفار کے مقابلہ میں تمہارے دینی بھائی تم سے مدد طلب کریں تو لازمی ہے کہ ان کی مدد کرو بشرطیکہ ان کفار سے تمہارا معاہدہ نہ ہو!

اس آیت کو پھر پڑھیئے۔ اس کے مفہوم پر غور فرمایئے۔ اس کی تفسیر و تشریح کا بار بار مطالعہ فرمایئے۔ جو نتیجہ اخذ کرنے پر آپ مجبور ہوں گے۔ وہ یہ ہے۔

اگر کسی برسرِ جنگ یعنی دشمن ملک میں مسلمان قیام پذیر ہیں۔ حالات کی نامساعدت یا مصالح کی بنا پر ہجرت کی قدرت نہیں رکھتے یا ہجرت نہ کرنے پر مجبور ہیں۔ اور دشمن ملک مسلمانوں کی محرومی، بے بسی اور کس مپرسی کے باعث ان پر طرح طرح کی زیادتیاں کر رہا ہے۔ ستم توڑ رہا ہے۔ زندگی اجیرن کئے ہوئے ہے۔ اور یہ مسلمان، بے سہارا اور بے بس مسلمان، پریشاں حال اور آشفتہ روزگار مسلمان کسی آزاد مسلمان ملک کی طرف امید اور حسرت سے دیکھتے ہیں۔ اس سے فریاد کرتے ہیں۔ اس سے استمداد کرتے ہیں۔ اس سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ آئے اور ہمیں اس ذلت کی زندگی سے نجات دے۔

سفاکی کا نشانہ تھیں۔ اسی ملک اور اسی دنیا میں اس نے پہلی بار نظام غلامی ختم کر کے اپنے غلاموں کو اتنا اونچا کر دیا۔ انہیں وہ مقام رفیع بخشا کہ ان میں اور آزاد مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ کھانے پینے میں، رہنے سہنے میں، حقوق میں، معاملات میں، ہر صورت میں انہیں تقریباً یکساں حقوق مرحمت فرما دیئے ———— صلی اللہ علیہ وسلم

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں غلاموں نے جو عروج حاصل کیا۔ اور جو مرتبے حاصل کئے۔ وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ حالانکہ یہ وہ دور تھا۔ کہ اسلام کے جادۂ صحیح سے مسلمان بڑی حد تک ہٹ چکے تھے؛

غلامانِ اسلام

ہمارے آزاد غلاموں میں بلال حبشی ہے۔ جس کی عظمت کے آگے عمر دم بخود تھے۔ سالم ہے جو راوی حدیث نبوی ہے۔ زید ہے جس نے رسول اللہ کی بہن سے شادی کی۔ اور جس کے بیٹے کے گھوڑے کی رکاب پکڑ کر خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضہ چلے۔ قنبر ہے جس نے علی مرتضیٰ رضہ کے سایہ عاطفت میں برتری اور عظمت حاصل کی۔

دور ملوکیت میں بھی جب غلامی پھر اپنی غیر اسلامی صورت میں واپس آگئی تھی۔ ہمارے غلاموں اور غلام زادوں میں جوہر ہے جس نے قاہرہ (مصر) کی تعمیر کی۔ جامع ازہر کی بنیاد ڈالی۔ قطب الدین ایبک ہے جس کی یادگار قطب مینار دلّی میں اب تک موجود ہے۔ ابن طولون ہے جس کی بنائی ہوئی جامع مسجد آج بھی عقیدت و عبادت کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ محمود غزنوی ہے جس کے حملے ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی ———— غرض یہ فہرست بہت طویل ہے۔ اور اگر اس سلسلہ پر ہم گفتگو کریں۔ تو اپنے اصل موضوع سے ہٹ جائیں گے؛

قصاص

قصاص کے بارے میں سورہ اسریٰ کی یہ آیت ملاحظہ ہو

ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لوليه سلطانا فلا يسرف في القتل انه كان منصورا ٥

جو کسی کو قتل کرے اس حالت میں کہ وہ مظلوم ہو۔ تو ہم نے اس کے ولی کو دعویٰ کا حق دیا ہے۔ پس قتل میں وہ زیادتی نہ کرے۔ وہ اس قابل ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔

انہ کان منصورا کی بلاغت اور معنویت بجائے خود ایک دفتر ہے۔

جہاد اور قتل

ضرورت کے وقت اسلام جہاد کا حکم دیتا ہے۔ اور بڑے اثر انگیز لہجے میں مسلمانوں کو اس طرف راغب کرتا ہے۔ سورۂ صف کی آیات ذیل ملاحظہ ہوں۔

يا ايها الذين امنوا هل ادلكم على تجارة تنجيكم من عذاب اليم ٥ تؤمنون بالله ورسوله وتجاهدون في سبيل الله باموالكم وانفسكم ذلكم خير لكم ان كنتم تعلمون ٥

اے مسلمانو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت نہ بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے نجات دے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ اپنے مال اور جان سے۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے بشرطیکہ تم سمجھو!

آگے چل کر اسی سورہ میں فرمایا

ان الله يحب الذين يقاتلون في سبيله صفا كانهم بنيان مرصوص

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کے راستے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بند ہو کر لڑتے ہیں۔

ان آیات میں جہاد کی ترغیب بھی ہے اور مجاہدین کے لئے یہ بشارت بھی کہ جو لوگ خدا کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر دشمنانِ خدا سے جنگ کرتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ سورۂ مائدہ میں معنویت کی پوری بلاغت کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاها فکانما احیا الناس جمیعا ۔

اگر کسی نے کسی شخص کو قتل کیا، حالانکہ وہ فسادی تھا نہ قاتل، تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ اور جس نے اُسے بچا لیا۔ اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔

ان آیات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جائز حدود کے علاوہ کسی حالت میں بھی کسی کی جان لینا جائز نہیں، بلکہ فساد فی الارض ہے۔ اور جو ایسا کرتا ہے۔ وہ صرف ایک آدمی کو نہیں مارتا۔ ساری انسانیت کی جان لینے کی کوشش کرتا ہے اور جو شخص اس فساد فی الارض کو روکتا ہے اور کسی مظلوم کی جان بچاتا ہے۔ وہ کسی ایک شخص کی جان نہیں بچاتا۔ دنیا کے تمام انسانوں کی جان بچاتا ہے ——— ایک شخص کی زندگی کو سارے انسانوں کی زندگی کے برابر اہمیت دے دینا، یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام انسانی زندگی کا کتنا احترام کرتا ہے۔

بہت بڑی رعایت

سورہ نساء میں آیات ذیل وارد ہوئی ہیں:-

فان تولوا فخذوهم واقتلوهم حیث ثقفتموهم ولا تتخذوا منهم ولیا ولا نصیرا ۔ الا الذین یصلون الی قوم بینکم وبینهم میثاق ۔

اگر وہ (مشرک) پھر جائیں، تو انہیں پکڑو۔ اور جہاں پاؤ۔ انہیں قتل کرو۔ اور ان میں سے کسی کو اپنا یار اور دوست نہ بناؤ۔ بجز اس کے کہ ان کا تعلق ایسی قوم سے ہو۔ جس کے اور تمہارے مابین معاہدہ ہو۔

یعنی برسرِ جنگ دشمن کے ساتھ کسی رعایت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جب اس سے جنگ ہو تو اسے ہرانے، شکست دینے، اس کا زور توڑنے، اس کی قوت کو صدمہ پہنچانے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے۔

وہ دشمن ہے ——— تمہارا بھی اور تمہارے دین کا بھی ———

لہٰذا اسے دوست بھی مت بناؤ۔ اس کی دوستی پر تکیہ بھی نہ کرو۔

لیکن اگر تمہاری جھپٹ سے بچنے کے لئے وہ بھاگ کر کسی ایسی قوم یا گروہ کے پاس پہنچ جائے جس سے تم جنگ نہ کرنے کا عہد کر چکے ہو۔ اب تم اس کا تعاقب نہیں کر سکتے۔ اب وہ تمہاری گرفت سے نکل گیا۔ اب وہ ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں اسے امن ہے۔ جہاں اسے کسی قسم کا گزند پہنچانے کا حق نہیں رکھتے۔ یہ حکم اسلام نے ۱۴ سو برس پہلے دیا تھا۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں۔ کہ دوست سے دشمن کو چھیننے کے لئے جنگ شروع کر دی جاتی ہے ؛

نقض عہد کا شاخسانہ

دشمن کسی دوسرے حرکت نہیں۔ وہ صلح کر لیتا ہے لیکن جنگ کو اور زیادہ کامیاب بنانے کے لئے بقول حالی ؎

صلح ہے اک مہلت سامان جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو خالی یاں تفنگ !

اگر ایسی صورت ہے اور تمہارے پاس اس کے شواہد موجود ہیں کہ دشمن نقض عہد پر تیار ہو چکا ہے۔ تو تم بھی اس کا عہد اس کے منہ پر مار سکتے ہو لیکن اطلاع دے کر !

بالکل معقول بات ہے۔ ہٹلر نے معاہدہ شکنی کر کے روس پر اس لئے حملہ کیا تھا۔ کہ سٹالن کے حملہ کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور سٹالن کی فوجیں اپنے دوست ایران کے حدود میں اسی لئے داخل ہو گئی تھیں۔ کہ کہیں یہاں ہٹلر نہ پہنچ جائے۔

لیکن نہیں، اسلام جنگ کی حالت میں صرف اندیشۂ دور دراز کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ عہد شکنی کی اجازت "برابری کو ملحوظ رکھ کر" دیتا ہے۔ وہ یک طرفہ کارروائی کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ اسے پابندی اور لازمی قرار دیتا ہے کہ دشمن کی امن شکن

اور عہد سوز سرگرمیوں کی اسے اطلاع ہے کہ فسخ معاہدہ کا اعلان کر کے تم جنگ کر سکتے ہو۔ یوں نہیں کہ خود ہی فیصلہ کر لیا کہ دشمن غالباً معاہدہ توڑنے والا ہے۔ اور چپکے چپکے تیاریاں کر کے اس پر حملہ کر دیا۔ یہ حرکت سیاست کی دنیا میں نہ صرف جائز بلکہ کار ثواب ہے لیکن اسلام کی مملکت میں یہ ایک جرم ہے۔ اور جرم کی اجازت اسلام کبھی نہیں دے سکتا۔ چنانچہ سورہ انفال میں وارد ہوا۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ

اگر تم کو کسی قوم سے خیانت (نقض عہد) کا خطرہ ہو۔ تو ان کا معاہدہ برابری سے ان پر لوٹا دو۔

سورۃ بقرکی ایک آیت

سورۃ بقر میں جہاں راہ خدا میں جہاد و قتال کی ترغیب دی ہے، ساتھ ہی ساتھ وہاں ظلم اور سفاکی کے مظاہرہ سے روکا بھی ہے۔ ارشاد ہوا

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ

ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے مقاتلہ کرتے ہیں، زیادتی نہ کرو۔ بلاشبہ خدا زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

جہاں ظلم اور تعدی سے روکا، وہاں صاف طور پر یہ بات بھی بتا دی، کہ خدا تعدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ظلم کا انسداد

سورہ شوریٰ کی آیات اور زیادہ واضح ہیں۔ یہاں تک کہ فرما دیا کہ ظلم و جور کا جواب اگر عفو و رحمت سے دیا جائے۔ تو کیا کہنا لیکن اگر جواب دینا ہی ہو۔ تو صرف اتنا جتنا ظلم ہوا ہے۔ اس سے زیادہ ذرا بھی نہیں۔

جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا

برائی کا بدلہ برائی ہے لیکن جس نے

فمن عفیٰ واصلح فاجرہ علی اللّٰہ انہ لایحب الظالمین ۰

معاف کر دیا۔ اور صلح کر لی۔ تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

معافی کی صورت میں یہ نوید بھی دے دی کہ اس کا اجر خدا کے ذمہ ہے ——— اور کون مسلمان ہو گا۔ جو اپنے کسی کام کا اجر خدا سے لینے کے بجائے یہیں حساب چکا لینے کو ترجیح دے۔ لیکن اگر کوئی ایسا کرے تو اسے ممانعت نہیں کی' اجازت دی ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ———

یعنی اگر ظلم کی سرحد میں قدم رکھا۔ تو پھر خدا کے عتاب کے مستوجب ٹھہرے! ——— چاہو معاف کر کے خدا سے اجر لے لو۔ چاہو یہیں بدلہ لے لو۔ لیکن ظلم سے دامن بچا کر۔

دشمن کا اقرار

قرآن نے جو حکم دیا مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی۔ اور اس کا اقرار سمجھ دار عیسائیوں نے بھی کیا۔

ایک مرتبہ کسی مفتی سے دریافت کیا گیا۔ کہ اگر گیارہ مسلمان کسی ایسے عیسائی کو بے گناہ قتل کر ڈالیں۔ جو بادشاہ کی رعیت ہو۔ اور جزیہ بھی ادا کرتا ہو تو کیا کیا جائے گا؟ مفتی نے جواب دیا اگر ایک ہزار اور ایک مسلمان بھی ہوں گے۔ تب بھی وہ سب کے سب قتل کئے جائیں گے [۱]

خلاصۂ کلام

غرض اسلام کا قرآن، غیر مسلموں کے ساتھ ایسی غیر معمولی رواداری برتتا ہے

---

[۱] ٹرکی ان یورپ مصنفہ بیگر صفحہ ۱۹۲

جس کا فرد دنیا کی کوئی مذہبی کتاب آج تک نہیں پیش کر سکی۔ نہ دنیا کی کوئی قوم اس طرح رواداری کی تعلیمات پر اثر کر سکی۔ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں جو شاندار مثال دنیا کے سامنے قائم کی ہے وہ پہلی اور آخری ہے۔ اور یہ تمام تر نتیجہ ہے قرآن کے مذہبی احکام رواداری کا۔ اور یہ مثال مسلمانوں نے اس حالت میں قائم کی۔ کہ اگرچہ دوسروں نے ان کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا لیکن انہوں نے اپنے ذہن و دماغ میں کبھی جوابی کارروائی کا خیال ہی نہیں کیا۔

حدیث رسولؐ

غیر مسلموں سے برتاؤ کے بارے میں ارشادات نبویؐ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم من کذب علی متعمداً
فلیتبوأ مقعدہ فی النار ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
جو مجھ پر عمداً جھوٹ بولے۔ اسے چاہیئے
کہ اپنی جگہ جہنم میں بنا لے ۔

الحدیث

"یاد رکھو! جو شخص غیر مسلم رعایا (معاہد) کے
حق میں ناانصافی کرے گا، یا عہد کو توڑے گا، یا
اس پر اس کی طاقت سے بڑھ کر ظلم کرے گا، یا
اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی شے لے
گا، تو میں قیامت کے روز اس کا دامن گیر
ہوں گا۔"

الحدیث

کچھ حدیث کے بارے میں

صفحات ماسبق میں ہم تفصیل و تشریح کے ساتھ یہ امر ذہن نشین کر چکے ہیں کہ قرآن کریم غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کرنے کی مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے؟ یہ ایک بہت بڑا اور مہتم بالشان مسئلہ متعصب، ناروادار اور غیر حقیقت پسند غیر مسلم مورخین کی بدولت بن گیا ہے۔ جو اپنا سارا زور قلم چند مسلمانوں کی ناروا داری کو پیش نظر رکھ کر اسلام اور داعی اسلام کے خلاف صرف کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ گر وہ خالی الذہن ہو کر تھوڑی دیر کے لئے کذب و افترا اور تعصب و ناروا داری سے صرف نظر کر کے ٹھنڈے دل سے قرآن کا مطالعہ کرتے تو ان کی بہت سی غلط فہمیاں ——— اگر انہیں غلط بیانی کے بجائے غلط فہمی کہا جا سکے ——— رفع ہو جاتیں۔ اور وہ قرآن کے آئینہ میں اسلام کے صحیح اور غیر مشکوک تعلیمات کا جلوہ دیکھ لیتے۔

یہ بڑی افسوسناک اور تکلیف دہ بات ہے۔ اگر ہٹلر، مسولینی، اسٹالن، ربن ٹراپ، گورنگ، ہملر، ہیس، فرانکو اور کاؤنٹ کیانو وغیرہ کے ننگ انسانیت افعال کو جناب

مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کا نتیجہ سمجھ لیا جائے۔ اگر مسیحی مذہب سے متعلق معلومات حاصل کرنا ہیں۔ تو یقیناً ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کے اقوال و افعال کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے بارے میں کوئی یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان کا مذہب کس قسم کی تعلیمات کا حامل ہے۔ غیر مسلموں کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ محارب و غیر محارب اور مستامن کے ساتھ وہ کس قسم کے سلوک کا حکم دیتا ہے۔ تو ہمیں عبدالملک بن مروان۔ حجاج بن یوسف اور نادر شاہ درانی وغیرہ نام نہاد مسلم ملوک و سلاطین کے بجائے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ کہ اسلام کا ماخذ یہی دونوں ہیں پھر ہمیں رسول اکرم صلعم، خلفائے راشدین اور ان مسلمان ملوک و سلاطین کے کارناموں پر ایک نظر ڈالنی پڑے گی جنہیں عامۃ المسلمین واقعات و حقائق کی بنیاد پر صحیح اسلامی تعلیمات کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ بغیر اس کے ہم کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے۔ تو مذہبی تعلیمات کی روشنی میں افراد و اشخاص کا کردار پرکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں حکم لگایا جا سکتا ہے۔ کہ وہ کہاں تک مذہب سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ افراد و اشخاص کے اعمال و افعال کو کسی مذہب کا معیار قرار دیا جائے۔ اور حکم لگا دیا جائے کہ چونکہ فلاں فلاں اشخاص نے اس طرح کے ننگ انسانیت افعال کا ارتکاب کیا۔ لہٰذا وہ مذہب ہی ننگ انسانیت ہے۔ بدقسمتی سے اکثر غیر مسلم مورخین کا یہی وطیرہ اسلام اور تعلیمات اسلام کے بارے میں رہا ہے۔ قدرتاً اس طرز عمل نے حالات کو بنانے اور سنوارنے کے بجائے انہیں اور زیادہ بگاڑ دیا۔

بہر حال تعلیمات قرآنی کا عطر ہم گذشتہ صفحات میں اپنے موضوع سے متعلق پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم حدیث نبوی پر بحث و گفتگو کریں گے ؛

حدیث کی اصطلاح

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یوں تو حدیث کے معنی بات کے ہیں، لیکن اصطلاحاً حدیث رسول اکرم ﷺ کے قول و فعل دونوں پر حاوی ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں جو حدیثیں ہم صحاح ستّہ اور معتبر کتب حدیث سے پیش کریں گے۔ ان میں ایک طرف رسول اکرم ﷺ کے اقوال بھی مندرج ہوں گے، اور دوسری طرف آپ کے افعال کا جلوہ بھی نظر آئے گا۔

البتہ چونکہ حدیثیں زیادہ تر اقوال سے بحث کرتی ہیں۔ اس لئے افعال کا تذکرہ نسبتاً کم ہوتا ہے، اور جہاں ہوتا ہے وہ بھی بطور استشہاد۔ اس لئے وہ عمل کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہوتا، صرف ایک مخصوص مسئلہ سے متعلق اس کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ اور یہی مقصود ہوتا ہے۔ لیکن ہم اس پر قناعت نہیں کریں گے، موجودہ عنوان کے ماتحت ہم استشہادی افعال نبوی حسب ضرورت پیش کریں گے، پھر آگے چل کر جہاں ہم عملی نمونوں سے بحث کریں گے۔ وہاں تفصیل کے ساتھ آنحضرت ﷺ، حضرات خلفائے راشدینؓ، ائمۂ کرامؒ، صوفیائے عظام، علمائے صالحین، ملوک و سلاطین اور دوسرے اصحاب ہمم کے کارناموں اور عملی نمونوں کو سامنے رکھ کر صحیح فیصلہ اور نتیجہ تک پہنچ سکیں گے۔

قرآن ہم تک رسول اللہ کے ذریعہ ہی سے پہنچا۔ یہ وحی کی صورت میں آنحضرت ﷺ پر نازل ہوتا تھا، اور آپ اپنی امت تک اسے پہنچاتے تھے۔ قرآن کی آیات کے بارے میں اگر صحابہ کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تھا۔ تو وہ آپ ہی سے دریافت کرتے تھے، اور آپ جو فرما دیتے تھے وہ حرف آخر ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خود قرآن نے آپ کی شان "وما ینطق عن الہوی" قرار دی ہے! صحابہ کرام آپ کا ارشاد سنتے تھے اور سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔

اسی طرح زندگی کے دوسرے معاملات و مسائل سے متعلق بھی جو کچھ دریافت

مسیح ؑ کی تعلیمات کا نتیجہ سمجھ لیا جائے۔ اگر مسیحی مذہب سے متعلق معلومات حاصل کرنی ہیں، تو یقیناً ہمیں حضرت عیسٰیؑ اور آپ کے حواریوں کے اقوال و افعال کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے بارے میں کوئی یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان کا مذہب کس قسم کی تعلیمات کا حامل ہے۔ غیر مسلموں کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے، محارب اور غیر محارب اور مستامن کے ساتھ وہ کس قسم کے سلوک کا حکم دیتا ہے، تو ہمیں عبدالملک بن مروان، حجاج بن یوسف اور نادر شاہ درانی وغیرہ نام نہاد مسلم ملوک و سلاطین کے بجائے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ کہ اسلام کا ماخذ یہی دونوں ہیں پھر ہمیں رسول اکرمؐ، خلفائے راشدین اور ان مسلمان ملوک و سلاطین کے کارناموں پر ایک نظر ڈالنی پڑے گی جنہیں عامۃ المسلمین واقعات و حقائق کی بنیاد پر صحیح اسلامی تعلیمات کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ بغیر اس کے ہم کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے، تو مذہبی تعلیمات کی روشنی میں افراد و اشخاص کا کردار پرکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں حکم لگایا جا سکتا ہے۔ کہ وہ کہاں تک مذہب سے مطابقت رکھتا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ افراد و اشخاص کے اعمال و افعال کو کسی مذہب کا معیار قرار دیا جائے۔ اور حکم لگا دیا جائے کہ چونکہ فلاں فلاں اشخاص نے اس طرح کے ننگ انسانیت افعال کا ارتکاب کیا۔ لہٰذا وہ مذہب ہی ننگ انسانیت ہے۔ بدقسمتی سے اکثر غیر مسلم مورخین کا یہی وطیرہ اسلام اور تعلیمات اسلام کے بارے میں رہا ہے۔ قدرتاً اس طرز عمل نے حالات کو بنانے اور سنوارنے کے بجائے اور زیادہ بگاڑ دیا۔

بہرحال تعلیمات قرآنی کا عطر ہم گذشتہ صفحات میں اپنے موضوع سے متعلق پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم حدیث نبوی پر بحث و گفتگو کریں گے ؎

حدیث کی اصطلاح

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یوں تو حدیث کے معنی بات کے ہیں۔ لیکن اصطلاحاً حدیث رسول اکرم ص کے قول و فعل دونوں پر حاوی ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں جو حدیثیں ہم صحاح ستہ اور معتبر کتب حدیث سے پیش کریں گے۔ ان میں ایک طرف رسول اکرم ص کے اقوال بھی مندرج ہوں گے۔ اور دوسری طرف آپ کے افعال کا جلوہ بھی نظر آئے گا۔

البتہ چونکہ حدیثیں زیادہ تر اقوال سے بحث کرتی ہیں۔ اس لیے افعال کا تذکرہ نسبتاً کم ہوتا ہے۔ اور جہاں ہوتا ہے وہ بھی بطور استشہاد۔ اس لیے وہ عمل کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہوتا۔ صرف ایک مخصوص مسئلہ سے متعلق اس کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ اور یہی مقصود ہوتا ہے۔ لیکن ہم اس پر قناعت نہیں کریں گے۔ موجودہ عنوان کے تحت ہم استشہادی افعال نبوی حسب ضرورت پیش کریں گے۔ پھر آگے چل کر جہاں ہم عملی نمونوں سے بحث کریں گے۔ وہاں تفصیل کے ساتھ آنحضرت ص، حضرات خلفائے راشدین، ائمہ کرام، صوفیائے عظام، علمائے صالحین، ملوک و سلاطین اور دوسرے اصحاب ہمم کے کارناموں اور عملی نمونوں کو سامنے رکھ کر صحیح فیصلہ اور نتیجہ تک پہنچ سکیں گے۔

قرآن ہم تک رسول اللہ کے ذریعہ ہی سے پہنچا۔ یہ وحی کی صورت میں آنحضرت پر نازل ہوتا تھا۔ اور آپ اپنی امت تک اسے پہنچاتے تھے۔ قرآن کی آیات کے بارے میں اگر صحابہ کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تھا۔ تو وہ آپ ہی سے دریافت کرتے تھے۔ اور آپ جو فرما دیتے تھے وہ حرف آخر ہوتا تھا۔ اس لیے کہ خود قرآن نے آپ کی شان "وما ینطق عن الہویٰ" قرار دی ہے۔ صحابہ کرام آپ کا ارشاد سنتے تھے اور سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔

اسی طرح زندگی کے دوسرے معاملات و مسائل سے متعلق بھی جو کچھ دریافت

کرتا ہوتا تھا۔ وہ سرورِ کائنات ہی سے دریافت کیا جاتا تھا۔ اور آپ کا ارشاد بے چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ حدیث درحقیقت اسی قسم کے ارشادات کا مجموعہ ہے۔

حدیث تاریخ ہے یا خبر؟

یہاں ایک اور بات صاف ہو جانی چاہیئے۔

بعض اصحاب فکر حدیث کو خبر متواتر نہیں مانتے۔ ہاں معتبر ترین اور مستند ترین تاریخ مانتے ہیں، وہ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ حدیث قرآن میں اضافہ کر سکتی ہے۔ یہ مانتے ہیں کہ اس کی تشریح کر سکتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی اگر ان حدیثوں کو پرکھا جائے تو بھی ان کے پایۂ استناد میں کوئی فرق نہیں آتا۔ دنیا کی کوئی تاریخ بھی اتنی جامع اور مکمل نہیں ہے جتنی حدیث۔ دنیا کا کوئی مورخ بھی اتنا ثقہ اور مستند نہیں ہے جتنے ثقہ راویانِ حدیث۔ دنیا کی کسی قوم نے بھی مورخوں، واقعہ نگاروں اور راویوں کے ثقہ اور عدول و صدوق اور غیر مجروح ہونے کا التزام نہیں کیا۔ جتنا فنِ حدیث کے پرکھنے والوں نے۔ انہوں نے ایک مستقل فن علم اسماء الرجال کی بنیاد ڈال دی۔ جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہ راویانِ حدیث کے بارے میں ہر ممکن ذرائع سے ضروری معلومات حاصل کئے جائیں۔

جانچ پڑتال

یعنی یہ کہ وہ کہاں تک سچ بولتے تھے؟ ان کے صدق میں کذب کی آمیزش تو نہیں ہوتی تھی۔ ان کی قوت حافظہ کیسی تھی؟ روایت حدیث کا کام کس عمر میں انہوں نے شروع کیا تھا؟ ان کی نشست و برخاست کس قسم کے لوگوں کے ساتھ رہتی تھی؟ ان کی طبیعت میں مبالغہ کا رنگ تو نہیں تھا؟ بیان واقعات میں وہ کہاں تک احتیاط کرتے تھے؟ تفقہ اور تدبر کا مادہ ان میں کہاں تک تھا؟ ان کے ذوق تحقیق و تفحص کا کیا عالم تھا؟ وہ سنی سنائی باتوں پر اعتبار کر لینے کے عادی تو

نہیں تھے؟ ان کا برتاؤ اپنے دوستوں، نوکروں، ساتھیوں اور عزیزوں کے ساتھ کیا تھا؟ ان کے کسی فعل میں خدع و فریب کا رنگ تو نہیں جھلکتا تھا؟ وہ کسی بات کی چھان پھٹک کے کہاں تک خوگر تھے؟ جو روایت وہ کر رہے ہیں، اس میں ان کی حیثیت "صاحب مذہب" کی تو نہیں؟ ——— صاحب مذہب کی اصطلاح بھی سمجھ لیجئے: صاحب مذہب وہ شخص کہلاتا ہے، جو کسی خاص مسلک پر عامل ہو، اور جو حدیث وہ روایت کر رہا ہو وہ خاص طور پر اس کے مسلک کی تائید میں نہ ہو۔

مثلاً ایک خارجی کی روایت حدیث دوسرے اعتبارات سے اگر کوئی قباحت نہ رکھتی ہوگی تسلیم کر لی جائے گی، لیکن اگر وہ کوئی ایسی حدیث روایت کرے، جو حضرت علی مرتضیٰ رضہ کی ذات گرامی کی منقصت کا پہلو رکھتی ہو، تو وہ ہرگز تسلیم نہیں کی جائے گی، خواہ وہ کتنا ہی عدول اور ثقہ کیوں نہ ہو؟

حدیث کی پرکھ

پھر حدیث کی روایت میں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے کہ اس حدیث کی روایت میں راوی منفرد ہے یا "طرق متعددہ" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے؟ اگر وہ منفرد ہے تو اس کی حدیث کا پایۂ استناد یا تو بالکل ساقط ہو جائے گا یا اس کے درجہ میں کمی آ جائے گی۔ اور اگر "طرق متعددہ" سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی دوسرے سلسلۂ رواۃ سے بھی یہی حدیث سامنے آتی ہے تو اسے تسلیم کر لیا جائے گا۔

اس کے علاوہ روایت حدیث کے قبول کرنے کے لئے اور بھی شرائط ہیں۔ اور ان کا اہتمام بھی لازمی طور پر پیش نہاد خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً وہ حدیث جو ہمارے سامنے ہے

عقل عامہ کے خلاف تو نہیں؟ ——— اگر ہے تو مسترد

قرآن کے خلاف تو نہیں؟ ——— اگر ہے تو اس کا پایۂ استناد ساقط

۳۔ اصولِ درایت کے خلاف تو نہیں؟ اس جگہ ہمیں درایت کو بھی سمجھ لینا چاہیے ایک چیز تو ہے روایت، یعنی ایک شخص نے کوئی بات دیکھی یا کسی معتبر آدمی سے سُنی اُس کی روایت کر دی ———— لیکن روایت کی کسوٹی ہے درایت۔ یعنی جو روایت ہمارے سامنے ہے وہ عقلی اعتبار سے کہاں تک قابلِ قبول ہے؟ واقعاتی اعتبار سے اسے کہاں تک مانا جا سکتا ہے؟ تحقیقی اعتبار سے اس کی کیا حیثیت کیا ہے؟

روایت اور درایت

مثلاً اگر یہ روایت ہمارے سامنے آتی ہے کہ ایک راوی بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ بچوں پر شفقت فرماتے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرتے تھے۔ تو ہم یہ روایت ضروری تحقیق کے بعد قبول کر لیں گے۔ لیکن وہی راوی جو انتہا ثقہ، عدل، صدوق اور محفوظ عن الجرح ہونے کے باوجود اگر یہ روایت کرتا ہے۔ کہ میں نے دیکھا یا فلاں سے سُنا کہ آں حضرتؐ (نعوذ باللہ) بچوں کے ساتھ سختی اور درشتی کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے۔ تو اس کے ثقہ، صدوق اور عادل ہونے کے باوجود یہ روایت ہم تسلیم نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہ بات بدیہیات کے خلاف ہے۔ ہر قسم کا سلسلۂ روایت اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ کہ آنحضرتؐ کا برتاؤ سب کے ساتھ عموماً اور بچوں کے ساتھ خصوصاً غایت درجہ شفقت و مرحمت کا نمونہ ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا یہ بات درایت کے خلاف ہے اور کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ یا راوی کذوب ہے یا اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔

۴۔ راوی حدیث اپنا پورا سلسلۂ روایت نام بنام بیان کرتا ہے یا نہیں؟ اگر بیان کرتا ہے۔ تو اس کی حدیث کسوٹی پر کسی جائے گی۔ اور نہیں بیان کرتا، یا کسی کڑی کو چھوڑ دیتا ہے۔ تو پھر اس پر غور بھی نہیں کیا جائے گا۔

۵۔ جرح یعنی تنقید کسی ایک راوی پر نہیں کی جاتی۔ پورے سلسلۂ رواۃ پر کی جائے گی۔ یعنی یہ نہیں دیکھا جائے گا۔ کہ اصل راوی صدوق و عدل ہے یہ دیکھا جائے

جائے گا۔ کہ اپنے بیان میں وہ جن راویوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ سب کے سب بلا استثناً صدق و عدل میں یا نہیں؟ اگر ہیں تو حدیث حدیث ہے ورنہ نہیں۔

میں علم حدیث پر کوئی مقالہ نہیں لکھ رہا ہوں لیکن چونکہ ایک نہایت اہم بالشان مسئلے سے متعلق احادیث نبوی سے استشہاد و استنباط کر رہا ہوں۔ اس لئے پس منظر کے طور پر ضروری تھا کہ میں فن حدیث کی اہمیت، اس کے متعلقات اور اس کے راویوں کی جرح و تعدیل پر مختصر لیکن جامع طور پر اصولی بحث کرتا۔

سطور بالا میں حدیث نبوی کا جو پس منظر میں نے پیش کیا ہے۔ وہ قارئین کرام کو یہ سمجھنے میں پوری پوری مدد دے گا کہ احادیث نبوی کا صحیح مقام اور ان کی صحیح حیثیت کیا ہے۔

اسماء الرجال

مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر کریمر مسلمانوں کے ایجاد کئے ہوئے فن اسماء الرجال کا دفتر دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھا تھا ——— "یہ معجزہ دنیا کی کسی قوم سے اب تک ظہور میں نہیں آیا۔ کہ اس نے اپنے رسول کے اقوال کی حیثیت و استناد کا پایہ مستحکم کرنے کے لئے چند نہیں، چند سو نہیں، چند ہزار نہیں، نصف لاکھ یعنی پچاس ہزار افراد کی تاریخ حیات پوری بے باکی، صداقت اور غیر جانبداری کے ساتھ مدون کرلی ہو" ——— واقعہ یہ ہے کہ یہ کارنامہ دنیا میں صرف مسلمانوں ہی نے انجام دیا۔ وہی اس کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی!

کتاب و سنت

اگر یہ فن عالم وجود میں نہ آیا ہوتا۔ تو کوئی شبہ نہیں، رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا مکمل نقشہ آج ہمارے سامنے نہ ہوتا۔ بعض لوگ جو حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ ایک اعتراض یہ کرتے ہیں۔ کہ حدیث اگر واقعی مذہبی حیثیت رکھتی تھی۔ تو پھر وہ قرآن کے

ساتھ ساتھ کیوں نہ چلی؟ لیکن یہ بات وہی لوگ کہتے ہیں۔ جو یا تو عمداً غلط بیانی کرتے ہیں یا خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ ورنہ تاریخ کا ایک معمولی طالب علم جانتا ہے۔ کہ آنحضرت ؐ کی وفات کے بعد جب خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبر کے ہاتھ پر بیعت ہوئی تھی۔ تو وہ کتاب و سنت ؐ پر تھی ——— اور سنت سو احادیث رسول کے اور کیا ہے ——— بہرحال اطناب کا یہ موقعہ نہیں۔ اس جگہ ایجاز ہی مناسب ہے ؛

جہاد کی حیثیت

ارشادات نبوی کی روشنی میں

گذشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ قرآن میں جہاد کے لئے جو حدود و شرائط تعین کئے گئے ہیں، وہ کیا ہیں؟ ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں اس سلسلہ میں حدیث ہمیں کیا بتاتی ہے؟

جہاد کی اہمیت

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے

والذی نفسی بیدہ لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل [1]

یعنی رسول اللہ نے فرمایا

---

[1] یہ حدیث بخاری و مسلم دونوں میں ہے

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں اس کو دوست رکھتا ہوں کہ اللہ کے راستے میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔"

اس حدیث میں جہاد کا ذکر جن الفاظ میں کیا گیا ہے اس سے جس آمادگی کا اظہار کیا گیا ہے، جو تمنا ظاہر کی گئی ہے، جس ولولہ کا اظہار ہوا ہے، ان سب سے راہِ اسلام میں جہاد کی اہمیت اور اس کی منزلت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

لیکن خاص طور پر توجہ طلب جو بات ہے وہ ہے "جہاد فی سبیل اللہ" یعنی جہاد وہ ہے جو اللہ کے راستے میں کیا جائے، اللہ کے لئے کیا جاتے ہوئے نفس، توسیع مملکت، جوع الارض، تجارتی اور کاروباری مفاد کے لئے نہیں، کشور کشائی اور جہانگیری کے لئے بھی نہیں، شہرت اور ناموری کے لئے بھی نہیں۔ جہاد صرف وہی مقبول ہے جو رضائے الٰہی کے لئے ہو، ورنہ وہ جہاد نہیں، جنگ ہے، قتال ہے اور اس کا تعلق رضائے الٰہی سے ذرا بھی نہیں۔

جہاد کی فضیلت

ایک اور حدیث جو حضرت ابو عبس رض سے مروی ہے بتاتی ہے کہ جہاد کی فضیلت کیا ہے؟

عن ابی عبس رض قال قال رسول اللہ ﷺ ما اغبرت قدما عبد فی سبیل اللہ فتمسہ النار [1]

ابو عبس رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس بندے کے قدم جہاد فی سبیل اللہ میں غبار آلود ہوتے ہیں، اسے (جہنم کی) آگ نہیں چھو سکتی۔

اس سے بڑھ کر جہاد کی اور فضیلت کیا ہو سکتی ہے کہ مجاہد پر آتش جہنم حرام

---

[1] صحیح بخاری

کر دی گئی ہو۔

نفاق کی موت

ایک اور حدیث میں، جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ یہ فرمایا گیا ہے۔ کہ وہ شخص جو جہاد کی آرزو سے بیگانہ ہو مسلمان نہیں منافق ہے۔

عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ من مات ولم یغز ولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبة من نفاق۔ لہ

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ جو شخص مرا اور جہاد نہ کیا۔ اور نہ کبھی اس کے دل میں جہاد کا خیال گذرا، اس کی موت نفاق پر ہوئی۔

گویا وہ شخص مسلمان نہیں منافق ہے، جو جہاد کے جذبہ سے محروم ہو۔ اس سے بڑھ کر جہاد کی تاکید و حمایت میں اور کیا کہا جا سکتا ہے اس حدیث نے یہ ثابت کر دیا۔ کہ جہاد اسلام کی روح ہے۔ اور جو شخص اسلام کا نام تو لیتا ہے۔ نماز بھی پڑھتا ہے۔ زکوٰۃ بھی دیتا ہے لیکن اسلام کی روح ـــــ جہاد ـــــ کا خیال دل میں نہیں لاتا۔ اس کے یہ سارے اعمال حقیقی نہیں، منافقانہ ہیں۔ اسلام کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں!

قرآن مجید نے اور زیادہ وضاحت کے ساتھ جہاد اور مجاہد کے بارے میں فرمایا ہے۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات ۞ بل احیاء و لٰکن لا تشعرون:

یعنی جو لوگ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے شہادت پاتے ہیں۔ وہ مرتے ہی نہیں، موت ان پر طاری ہی نہیں ہو سکتی، وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اگرچہ ہماری

لہ صحیح بخاری

چشم عریاں (NAKED EYE) انہیں نہ دیکھ سکے۔ اگرچہ ہم ان کی زندگی کو محسوس نہ کر سکیں۔

قرآن کے الفاظ پر غور فرمایئے۔ منع کیا جاتا ہے لا تقولوا کہ انہیں مردہ یعنی اموات نہ کہو۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر قرآن کریم میں وارد ہوا

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون۔ الآیۃ

مطلب یہ کہ جو لوگ خدا کے راستے میں شہید ہوں۔ اپنی جان دیں۔ انہیں یہ نہ سمجھو کہ وہ مر گئے نہیں وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ انہوں نے حیات دوام حاصل کر لی۔

یہاں لفظ "عند ربھم" پر غور کیجئے

یعنی اگرچہ بظاہر ان پر موت طاری ہو گئی۔ اس لئے کہ قوانین قدرت ہر حالت میں اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ لیکن اپنے رب کے نزدیک "وہ زندہ ہیں۔ اور وہ ان کی زندگی کو تر و تازہ رکھتا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں مذکورہ احادیث کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ جو شخص جہاد کے جذبے سے بے بہرہ ہے۔ وہ اپنے تئیں مسلمان کہلا سکتا ہے؟ ———— کلا ثم کلا!

نہیں ہرگز نہیں!

تطہیر نیت

لیکن خود جہاد کیا ہے؟ اس کے شرائط و حدود کیا ہیں؟ اس کی حیثیت اور اہمیت کیا ہے؟

ان سوالات کے جواب میں حدیث نبوی خاموش نہیں وہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ان تمام امور پر روشنی ڈالتی ہے اور ہمیں بتاتی ہے کہ جہاد کب کیا جا سکتا ہے؟

کن حالات میں کیا جا سکتا ہے؟ کن لوگوں سے کیا جا سکتا ہے؟

اسلام کے دشمنوں نے جہاد کو ایک بھیانک اور مہیب لفظ بنا لیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ جہاد بڑی خوفناک چیز ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو اس لئے عالم وجود میں آئی ہے کہ مسلمانوں کے سوا کسی غیر مسلم کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ ہر اس شخص کو جو اسلام کا قائل نہیں زندہ رہنے کے حق سے محروم کر دے۔ جہاد کی تلوار جب چلتی ہے تو بے تحاشہ چلتی ہے۔ وہ نہ معذور کے ساتھ مروت کرتی ہے۔ نہ عورتوں کو قابل رحم سمجھتی ہے۔ نہ بچوں پہ ترس کھاتی ہے۔ نہ بوڑھوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرتی ہے۔ نہ غیر جنگجو لوگوں کا لحاظ کرتی ہے۔ سب کو ایک ہی وار میں ختم کر دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ جہاد کا نام سنتے ہی بہت سے لوگ سہم جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں اگر مسلمانوں نے جہاد شروع کیا تو پھر کسی نامسلمان کی خیر نہیں!

لیکن یہ سارے اندیشے یکسر بے بنیاد ہیں ان میں حقیقت اور واقعیت کا شائبہ بھی نہیں۔ یہ باتیں صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اسلام کے دشمن ہیں اور اس کی اچھی باتوں کو برے رنگ میں پیش کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ورنہ اگر حقیقت کو حقیقت کی طرح دیکھا جائے۔ تعصب اور دل تنگی سے قطع نظر کر کے اسلام کی تعلیمات و ہدایات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاد درحقیقت دنیا کی سب سے زیادہ شریفانہ، مہذب اور مجبورانہ جنگ ہے۔ قرآن میں اور پھر احادیث نبوی میں تکرار و تسلسل کے ساتھ وضاحت اور تشریح کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ جب ہم جہاد پر آمادہ ہوں، جب ہم جہاد کے لئے میدان میں اتریں، جب ہم جہاد میں مصروف ہو جائیں، تو ہمارے فرائض اور واجبات کیا ہیں؟

جہاد کی سب سے پہلی شرط تطہیر نیت ہے ——————— جب تک نیت صاف نہیں جہاد مقبول نہیں!

چشم عریاں (NAKED EYE) انہیں نہ دیکھ سکے۔ اگرچہ ہم ان کی زندگی کو محسوس نہ کر سکیں۔

قرآن کے الفاظ پر غور فرمایئے۔ منع کیا جاتا ہے لا تقولوا کہ انہیں مردہ یعنی اموات نہ کہو۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پہ قرآن کریم میں وارد ہوا

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربهم یرزقون۔ الآیۃ

مطلب یہ کہ جو لوگ خدا کے راستے میں شہید ہوں۔ اپنی جان دیں۔ انہیں یہ نہ سمجھو کہ وہ مر گئے انہیں وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ انہوں نے حیات دوام حاصل کر لی۔

یہاں لفظ "عند ربهم" پر غور کیجئے

یعنی اگرچہ بظاہر ان پر موت طاری ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ ہمیں قدرت ہر حالت میں اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ لیکن اپنے رب کے "نزدیک" وہ زندہ ہیں۔ اور وہ ان کی زندگی کو ترو تازہ رکھتا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں مذکورہ احادیث کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ جو شخص جہاد کے جذبے سے بے بہرہ ہے۔ وہ اپنے تئیں مسلمان کہلا سکتا ہے؟ ——— کاتم کو

نہیں، ہرگز نہیں!

تطہیر نیت

لیکن خود جہاد کیا ہے؟ اس کے شرائط و حدود کیا ہیں؟ اس کی حیثیت اور اہمیت کیا ہے؟

ان سوالات کے جواب میں حدیث نبوی خاموش نہیں وہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ان تمام امور پر روشنی ڈالتی ہے اور ہمیں بتاتی ہے کہ جہاد کب کیا جا سکتا ہے

کن حالات میں کیا جا سکتا ہے؟ کن لوگوں سے کیا جا سکتا ہے؟

اسلام کے دشمنوں نے جہاد کو ایک بھیانک اور مہیب لفظ بنا لیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ جہاد بڑی خوفناک چیز ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو اس لئے عالم وجود میں آئی ہے کہ مسلمانوں کے سوا کسی غیر مسلم کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ ہر اس شخص کو جو اسلام کا قائل نہیں زندہ رہنے کے حق سے محروم کر دے۔ جہاد کی تلوار جب چلتی ہے تو بے تحاشہ چلتی ہے۔ وہ نہ معذور کے ساتھ مروت کرتی ہے۔ نہ عورتوں کو قابل رحم سمجھتی ہے۔ نہ بچوں پر ترس کھاتی ہے۔ نہ بوڑھوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرتی ہے۔ نہ غیر جنگجو لوگوں کا لحاظ کرتی ہے۔ سب کو ایک ہی وار میں ختم کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد کا نام سنتے ہی بہت سے لوگ سہم جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں اگر مسلمانوں نے جہاد شروع کیا تو پھر کسی نامسلمان کی خیر نہیں!

لیکن یہ سارے اندیشے یکسر بے بنیاد ہیں۔ ان میں حقیقت اور واقعیت کا شائبہ بھی نہیں۔ یہ باتیں صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں۔ جو اسلام کے دشمن ہیں اور اس کی اچھی باتوں کو برے رنگ میں پیش کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ورنہ اگر حقیقت کو حقیقت کی طرح دیکھا جائے۔ تعصب اور دھاندلی سے قطع نظر کر کے اسلام کی تعلیمات و ہدایات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاد درحقیقت دنیا کی سب سے زیادہ شریفانہ، مہذب اور مجاہدانہ جنگ ہے۔ قرآن میں اور پھر احادیث نبوی میں تکرار و تسلسل کے ساتھ وضاحت و تشریح کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ جب ہم جہاد پر آمادہ ہوں، جب ہم جہاد کے لئے میدان میں اتریں، جب ہم جہاد میں مصروف ہو جائیں، تو ہمارے فرائض اور واجبات کیا ہیں؛

جہاد کی سب سے پہلی شرط تطہیر نیت ہے ——————— جب تک نیت صاف نہیں جہاد مقبول نہیں!

چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی حدیث ہے۔

عن ابی موسیٰ رض قال جاء رجل الی النبیؐ فقال الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ [1]

ابو موسیٰ اشعری رض سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلعم کے پاس آیا اور عرض کیا۔ کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے مقاتلہ کرتا ہے۔ ایک شخص شہرت کے لئے قتال کرتا ہے۔ ایک شخص اپنے مرتبے کے لئے قتال کرتا ہے۔ ان میں سے کون فی سبیل اللہ لڑا؟ تو آپ نے فرمایا وہ جو اس لئے لڑا کہ خدا کا کلمہ بلند ہو۔ وہی راہ خدا کے لئے لڑا۔

اس حدیث نبوی میں سب کچھ آ گیا یعنی جو شخص اس لئے جہاد کرتا ہے کہ

۱۔ خوب مال غنیمت حاصل کرے گا

۲۔ ناموری اور شہرت کے منارہ پر پہنچ جائے گا۔

۳۔ سربلندی اور رفعت مقام کی نعمت حاصل کر لے گا۔

وہ جتنا چاہے لڑے لیکن وہ مجاہد نہیں۔

مجاہد وہ ہے جو اس لئے کفن سر سے باندھ کر میدان میں اترتا ہے کہ "لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا"؛ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

تطہیر نیت کے اس حکم اور مصلحت پر غور کیجئے تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جنگ اور جہاد میں کتنا فرق ہے؟ پہلی چیز صرف اس لئے رونما ہوتی ہے کہ مادی منافع اور دنیاوی وسائل کے ڈھیر لگا دے۔ اور دوسری چیز نفع و زیان سے

---

[1] بخاری نیز مسلم

ے بے نیاز ہے۔ وہ صرف اس لئے ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو ——— کتنا بڑا فرق ہے دونوں میں:

مجاہد پر پابندی

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ جنگ کا میدان مرحمت و شفقت کا ایوان نہیں ہوتا۔ یہاں تلواریں چمکتی ہیں۔ خنجر نکلتے ہیں، نیزے اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ صرف نمائش کے لئے نہیں زیب اور تخویف کے لئے بھی نہیں، فیصلہ کرنے کے لئے۔ اس لئے کہ ایک ہارے اور دوسرا جیتے۔ جب لڑائی شروع ہوتی ہے۔ تو یہ جذبۂ رحم مروت اور انسانیت کو کچل دیتا ہے خون بہتا ہے، بہایا جاتا ہے بغیر کسی اور رعایت کے، بغیر کسی مروت کے جو سامنے آیا وہ دونیم جس کا تعلق دشمن سے پایا گیا اس کا خون حلال۔

لیکن داعی اسلام کا اصول یہ نہیں ہے۔ لسان نبوت جنگ کے میدان میں بھی رحم و کرم کا پیغام سناتی ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی روایت کرتے ہیں

عن عبد اللہ بن عمرؓ قال نھی رسول اللہ ﷺ عن قتل النساء والصبیان[1]

یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت فرمائی ہے

یہ ممانعت اس زمانہ میں فرمائی جارہی ہے۔ جب عورتوں اور بچوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا تھا جو میدان جنگ کے دلاور مردوں کے ساتھ۔ جب جنگ کی ایک مرغوب مال غنیمت سے زیادہ خود عورتوں کا وجود تھا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے اور کتنی بے باکی سے لکھتا ہے ؎

مالھم بیضات الخدور ھناک لا النعم المراکم

یعنی

[1] بخاری … مسلم

"اس وقت اصل مقصود گوری گوری پردہ نشین عورتیں ہوتی ہیں۔ نہ کہ چراگاہ سے واپس آنے والے اونٹ۔"

"جنگ وجدال کا مقصد کلمۃ اللہ کی سربلندی نہیں۔ مال غنیمت بھی نہیں۔ صرف عورتیں ہیں۔ خوبصورت، نازک اندام، گندم گوں۔"

اس کے مقابلہ میں اسلام اس روش عام سے بالکل الگ، عورتوں کے احترام کی تاکید کرتا ہے۔

ایک اور ممانعت

جنگ کے دوران میں کفار کا ایک عام وطیرہ یہ تھا کہ وہ شور وشغب کے ساتھ جنگ کے میدان کی طرف بڑھتے تھے، مختلف قسم کی آوازیں، نعرے۔ مسلمانوں نے بھی اس چلتے ہوئے اصول کی پابندی میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ لیکن داعی اسلام نے اس کی بھی ممانعت کر دی۔ لڑائی کے میدان میں لڑائی کرنی چاہیئے۔ لڑائی کے ساتھ ساتھ اعصابی اور نفسیاتی جنگ کی دفعتاً کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ حضرت قیس بن عباد کی روایت ہے

عن قیس بن عباد قال کان اصحاب النبیؐ یکرھون الصوت عند القتال[1]

یعنی

حضرت قیس بن عباد روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام جنگ وخون ریزی کے وقت شور وغوغا ناپسند کرتے تھے۔

عورت کی عظمت

جنگ جب برپا ہوتی ہے تو تمام جنگی معاملات ومسائل وہی اصحاب طے کرتے

---

[1] ابوداؤد

ہیں۔ جو جنگی مناصب کے اعتبار سے بلند اور برتر حیثیت کے حامل ہوں۔ اصولاً اور عقلاً ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کہ بغیر اس کے صحیح معنی میں نظم قائم نہیں ہو سکتا۔

اسلام بھی اس اصول کا قائل ہے لیکن غیر مسلم محارب اگر شکست کھا جائے یا شکست قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ جنگ کے نتائج و عواقب بھگتنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ اور حالات کی نامساعدت کے باعث امن اور جان بخشی چاہتا ہو تو اسلام ہر مسلمان کی دی ہوئی امان کو نافذ قرار دے دیتا ہے۔ خواہ وہ کوئی فوجی منصب رکھتا ہو یا نہ ہو۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اسلامی سپہ دار اس امان کا احترام کرے گا۔ اور پھر اس محارب سے جنگ نہیں کرے گا۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضؓ ایک حدیث کی روایت کرتے ہیں۔

عن ابی هریرة رض ان النبی صلعم قال ان المرأة لتاخذ للقوم یعنی تجیر علی المسلمین۔

یعنی ایک عورت مسلمانوں کی طرف سے کسی غیر مسلم گروہ کو امان دے سکتی ہے۔

یہ حدیث نبوی جہاں اس حقیقت کی مظہر ہے۔ کہ عورت کا درجہ اسلام میں بہت بلند ہے۔ وہاں اس حقیقت کی بھی آئینہ دار ہے کہ جنگ و پیکار کو ختم کرنے اور صلح و سلام کی فضا قائم کرنے میں اسلام کتنا وسیع القلب اور روادار ہے۔ وہ بہانے ڈھونڈتا ہے کہ جنگ ختم ہو جائے اور صلح و سلام کی فضا پیدا ہو جائے۔ وہ ان ہستیوں کو بھی امن دینے اور کافروں کی جان و مال کو محفوظ کر دینے کا حق دیتا ہے جنہیں دنیا کی کسی قوم نے بھی یہ حق نہیں دیا۔ آج بھی دنیا کی مہذب سے مہذب اور ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ قوم ایک عام عورت کو یہ حق نہیں دیتی کہ اگر فریق ثانی اپنی کمزوری دیکھ کر طالب امان ہو۔ تو وہ اسے امان کا پروانہ عطا کر دے۔ اس سے بڑھ کر رواداری اور شفقت کا برتاؤ اور کیا ہو سکتا ہے؟

اماں شکنی

اسلام اس بات کا قائل نہیں ہے کہ جنگ کے دوران میں کسی قسم کی بدعہدی کی جائے۔ دھوکہ دیا جائے۔ فریب سے کام لیا جائے۔ مصلحت کی آڑ سے کر غلامانہ اور سفاکانہ طریقہ روا رکھا جائے۔ وہ ہر معاملہ میں تقویٰ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس راستہ سے کبھی اور کسی حالت میں منحرف ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔

چنانچہ وہ اسے بھی گوارا نہیں کرتا کہ ایک مرتبہ کسی حربی کافر کو امان دے کر بغیر کسی معقول اور جائز وجہ کے اُسے واپس لے لیا جائے۔ معقول وجوہ پر واپس لینے کی صورت میں بھی وہ پہلے سے اعلان کر دینے کی ہدایت کرتا ہے۔ اور اگر ایسی صورت نہ ہو۔ تو کسی قیمت پر بھی اسے روا نہیں رکھتا کہ امان دینے کے بعد امان شکنی کی جائے۔ اس فعل کو وہ حد درجہ مذموم اور ناقابل معافی تصور کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں ذیل کی حدیث خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

"عن عمرو بن الحمق قال سمعت رسول اللہ (ص) یقول من امن رجلا علی نفسہ فقتلہ أعطی لواء الغدر یوم القیامۃ" [1]

یعنی

رسول اللہ (ص) نے فرمایا۔ اگر کسی شخص نے کسی کو امان دی اور امان دینے کے بعد (بغیر کسی جائز وجہ کے بغیر) اسے قتل کر دیا۔ تو قیامت کے دن اس کے ہاتھ میں بدعہدی (غدر) کا جھنڈا دیا جائے گا۔

اس سے بڑھ کر ایک غیر مسلم کی حفاظت جان و مال کی اور کیا ضمانت ہو سکتی ہے؟ اور اس سے بڑھ کر وہ اور کون سی وعید ہو سکتی ہے۔ جس کے بعد ایک مسلمان اس مذموم فعل کے ارتکاب سے رکا اور بچا رہے؟

---

[1] ملاحظہ ہو شرح السنہ

ایک اور حدیث:

حضرت انس رض جیسے جلیل القدر صحابی سے مروی ہے

عن انس رض ان رسول اللہ صلعم قال لا تقتلوا شیخا فانیا ولا طفلا صغیرا ولا امراۃ[1]

یعنی

آں حضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ در حالت جنگ، شیخ فانی طفل صغیر اور عورت کو قتل نہ کرو۔

شفقت و رحمت کا یہ عالم تھا کہ ایک اور موقع پر ہرے بھرے درختوں اور سرسبز کھیتوں کے کاٹنے اور آگ لگانے سے بھی منع فرمایا۔ حالانکہ جنگ کی حالت میں یہ حرکتیں عام طور پر فوجیں بڑی بے پروائی سے کر گذرتی ہیں۔ یہ اصول اور تعامل اتنا قدیم اور معمول ہے کہ آج تک اس پر بڑی بے پروائی کے ساتھ عمل ہوتا ہے۔ اور اس فعل کے ارتکاب میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی۔

خون کی قیمت

اسلام کی نظر میں انسانی خون کی بڑی قیمت ہے۔ خواہ وہ مسلمان کا ہو یا غیر مسلم کا۔ وہ ہرگز اسے گوارا نہیں کرتا کہ کسی کا خون بغیر کسی معقول اور جائز سبب کے بہایا جائے۔

چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہوا

اول ما یحاسب بہ العبد الصلوۃ واول ما یقضی بین الناس یوم القیامۃ فی الدماء[2]

یعنی

قیامت کے دن بندے سے جس چیز کا سب سے پہلے حساب لیا جائے گا

---

[1] ابوداؤد [2] نسائی کیے از صحاح ستہ

وہ نماز ہے۔ اور لوگوں کے مابین جس چیز کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا۔ وہ خون کے معاملات ہیں"۔

انسانی خون کی اس قدر و قیمت کو صحیح طور پر محسوس کر لینے کے بعد کوئی مسلمان خواہ متعصب ہو یا غیر متعصب، کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتا۔ نہ جنگ کے میدان میں نہ امن کی حالت میں جو خون رائگاں کا سبب بنے۔

زبردست وعید

ایک اور حدیث میں قتل معاہد پر بہت بڑی وعید آئی ہے ——————

معاہد یعنی وہ غیر مسلم (کافر یا مشرک) جو مسلمانوں سے امن حاصل کر چکا ہو۔ وہ پھر اسے بغیر کسی معقول سبب اور وجہ کے قتل کر دیا جائے۔

چنانچہ فرمایا

من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة وان ريحها لتوجد من مسيرة اربعين عاما

یعنی

"رسول اللہ (ص) نے فرمایا جس (مسلمان) نے کسی غیر مسلم (معاہد) کو قتل کیا۔ وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا۔ حالانکہ یہ خوشبو چالیس سال کی مسافت سے محسوس ہونے لگتی ہے"

گویا ایک مسلمان صرف اس جرم میں کہ بغیر کسی خطا قصور کے اس نے کسی معاہد غیر مسلم کو قتل کر دیا۔ جنت سے محروم ہو جائے گا۔ اور جس مسلمان کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے۔ کہ وہ جنت سے محروم رہے گا۔ اس کا اسلام کب قابل قبول ہو سکتا ہے؟ اسے مسلمان کیسے کہا جا سکتا ہے؟

جس مذہب کی آسمانی کتاب نے، جس مذہب کے نبی ؐ نے اس طرح غیر مسلموں

ساتحفظ کیا ہو۔ کیا اس کے پیرو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے اور اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے کسی غیر مسلم کو قتل کر سکتے ہیں؟ اور اگر قتل کریں۔ تو کیا اسلامی حکومت انہیں معاف کر دے گی؟ اُن سے باز پرس نہیں کرے گی؟ —————— اس بارۂ خاص میں بھی ہمارے سامنے روشن مثالیں اور ہدایتیں موجود ہیں جنہیں ہم اس وقت تک نہیں نظر انداز کر سکتے۔ جب تک ایمان اور اسلام کا شائبہ بھی ہم میں موجود ہے۔

عملی مثال

حدیث کی کتابیں اور تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ کہ خود سرور کائنات (ص) نے ایک مسلمان کے قتل کا اس لئے حکم صادر فرمایا کہ اس نے ایک ذمّی کو قتل کر دیا تھا۔ یہ حکم دیا اور لسان نبوّت سے فرمایا

انا اکرم من وفی ذمتہ [1]

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں

انا احق من وفی بذمتہ —————— ! یعنی اس غیر مسلم کے ذمّہ کو پورا کرنے کا سب سے زیادہ حقدار میں ہوں۔

رسول کی فریاد

اس سلسلہ میں ایک اور حدیث بھی پیش نظر رہنی چاہیئے۔ یہ حدیث حضرت صفوان بن مسلم کی ہے

الا من ظلم معاھداً او انتقصہ او کلّفہ فوق طاقتہ او اخذ منہ شیئاً بغیر طیب نفس فانا حجیجہ یوم القیامۃ [2]

یعنی

[1] دارقطنی [2] سنن ابی داؤد۔ کتاب الخراج جلد دوم

خبردار جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ بار ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا۔ اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود دامنگیر ہوں گا۔

غور فرمائیے جس شخص کی طرف سے قیامت کے دن آنحضرت ص فریادی اور مستغیث بن کر بارگاہِ باری تعالیٰ میں کھڑے ہوں گے وہ ہوگا ایک ذمّی ——————— غیر مسلم!

اور جس شخص کے خلاف کھڑے ہوں گے وہ ہوگا ایک مسلمان ——————— ایسا مسلمان جس نے

۱۔ کسی غیر معاہد غیر مسلم پر ظلم کیا ہو

۲۔ یا اس کے حقوق میں کمی کرنے کا مجرم ہو

۳۔ یا اس کی قوت و طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالتا ہو۔

۴۔ یا اس کی خوش دلانہ مرضی (طیب نفس) کے بغیر اس سے کچھ حاصل کرے۔

جرم صرف قتل ہی نہیں ہے یہ سب باتیں جرم ہیں۔ اور ایسا سنگین و شدید جرم کہ رسول اللہ (ص) اس کے خلاف مستغیث بن کر کھڑے ہوں گے ———————

یہ ہے اسلام کی نظر میں ایک غیر مسلم کی حیثیت!

اقلیت کے تحفظات

کسی حکومت میں اس سے زیادہ وہ کون سے تحفظات ہیں جو کسی اقلیت یا محکوم کو دیئے جا سکتے ہیں؟ اس زمانہ میں بھی وہ کون سی حکومت ہے۔ جو اقلیت یا اپنی محکوم قوم کو اتنے موثر تحفظات عطا کرے؟

بھارت اور پاکستان ابھی حال میں انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں۔ یک صد سالہ دور سے زیادہ کے عہد غلامی کی تاریخ ہمارے سامنے ہے

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان (۱۸۵۸ء) سے لے کر ماؤنٹ بیٹن کے اعلان (۱۹۴۷ء) تک سارا دور ہمارے سامنے ہے۔ بتایا جائے کہ کسی محکوم کو یہ سہولتیں، یہ آسائشیں، کبھی کسی دور میں محدود یا معین وقت کے لئے بھی حاصل ہوئیں؟

"تاریخ و حقائق کا جواب صاف انکار ہے اور بس!

مجوسی عورت سے نکاح جائز ہے

مجوسیوں کے بارے میں علمائے کرام کا متفقہ فتویٰ ہے۔ کہ یہ اہل کتاب نہیں ہیں اور مسلمان مرد کو صرف کتابیہ عورت سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن خلافت راشدہ کے دور میں آنحضرت صلعم کی ایک مثال کے پیش نظر مجوسیوں کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو اہل کتاب کے ساتھ جاری تھا۔ یعنی ان سے جزیہ لیا گیا۔ جب ان سے جزیہ لیا گیا۔ اور ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کیا گیا۔ تو پھر ان کی عورتوں سے مسلمان مردوں کا نکاح بھی جائز ہوا۔ چنانچہ بعض ائمہ کا فتویٰ یہ ہے۔ کہ مجوسی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہے۔

وحکی عن الشافعی قول بجواز ذلک بناءً علی جواز ذبائحھم

امام شافعی کا قول مجوسی عورتوں سے جواز نکاح کی تائید میں ہے۔ جس کی بنیاد یہ ہے۔ کہ چونکہ ان کا ذبیحہ جائز ہے۔ لہٰذا ان کی عورتوں سے نکاح بھی ہو سکتا ہے[1]

اس قول کی روشنی میں سنت رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) اور اسوۂ خلفائے راشدین (رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین) کے پیش نظر سکھوں اور ہندوؤں کے

---

[1] مختصر الفتاوی المصریہ لابن تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ۴۲۶

بارے میں فقہائے ملت اجتہاد کر کے کوئی مناسب حال فیصلہ کر سکتے ہیں۔؟

عہدِ نبوی کے چند واقعات

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک، رعایت اور مروت کا برتاؤ

گذشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں، کہ آگے چل کر ایک مستقل عنوان کے تحت ہم عہدِ نبوی اور خلفائے راشدین وغیرہ کے روادارانہ برتاؤ کی تاریخ نسبتہً بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ موقعہ آئے ہم اپنے موجودہ عنوان "حدیث" کی تکمیل اس وقت تک نہیں کر سکیں گے۔ جب تک چند اہم لیکن مختصر واقعات بر سبیل تذکرہ نہ بیان کر دیں۔ ان واقعات سے اوپر پیش کی ہوئی حدیثوں کی عملی تطبیق کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ اور آسانی کے ساتھ یہ بات ذہن نشین ہو سکے گی۔ کہ خود رسول اکرم کی حیات طیبہ سے ہمیں اس باب خاص میں ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

جنگ کو دعوت نہ دو

ایک حدیث نبوی میں ہمیں یہ ہدایت ملتی ہے:-

"قال لا تمنوا لقاء العدو فاذا لقيتموهم فاصبروا"[1]

یعنی

آپ نے فرمایا۔ دشمن سے مقابلہ کی آرزو نہ کرو۔ لیکن جب سامنا ہو جائے تو صبر و ہمت سے کام لو کرو۔

یہ جو دنیا میں آج کل جنگ چھیڑنے کے بہانے ڈھونڈھے جاتے ہیں۔ اور اور جا کر ایسے حالات پیدا کئے جاتے ہیں۔ کہ جنگ ناگزیر ہو جائے۔ انہیں نہ اسلام جائز رکھتا ہے۔ نہ پسند کرتا ہے۔ وہ صاف الفاظ میں کہتا ہے۔ دشمن سے جنگ کرنے کی تمنا نہ کرو۔ یعنی خواہ مخواہ مسلح شہادی کے جوہر نہ دکھاؤ۔ البتہ اگر جنگ ناگزیر ہو جائے۔ دشمن خود جنگ کو تم پر مسلط کر دے۔ تو میدان جنگ سے پیٹھ نہ پھیرو۔ ہمت اور استقامت سے کام لو اور جنگ کو تمام تک پہنچا کر دم لو۔

اسلام کو جنگ جو "مذہب" کہا جاتا ہے۔ اسلام کے مجاہدوں کو بدنام کیا جاتا ہے۔ پیروان اسلام کے بارے میں یہ دعایت (پروپیگنڈہ) کی جاتی ہے۔ کہ وہ حرب و پیکار کے شائق رہتے ہیں۔ لیکن جس کسی نظر سے یہ ارشاد رسول گذرا ہو کیا وہ مسلمان ہو کر ایمان کا دعوٰی کر کے جنگ چھیڑنے کا ارادہ بغیر کسی معقول سبب کے کر سکتا ہے؟

آئیے اب اس روشنی میں عہد نبوی کا ایک نظارہ کریں!

خالد بن ولید کا "جرم"

حضرت خالد بن ولید سیف اللہ تھے۔ ان کے کارناموں سے کون واقف نہیں۔ خود جناب رسول اللہ (ص) کو حضرت خالد کے مجاہدانہ کارنامے بہت عزیز تھے آپ (ص) ان کے قبول اسلام کے واقعہ سے بہت مسرور ہوئے تھے۔ جن لوگوں کے لئے

---

[1] صحیح مسلم ج ۳ ص ۴۱۰

مسلمان ہونے کی آپؐ نے دعا فرمائی تھی۔ ان میں ایک حضرت خالدؓ بھی تھے۔ اور کوئی شبہ نہیں۔ قبول اسلام کے بعد حضرت خالدؓ کے وجود سے، اسلام کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔

انہیں خالد بن ولید کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث ملاحظہ فرمائیے

عن ابن عمر قال بعث النبی ﷺ خالد بن الولید الی بنی خذیمۃ فدعاهم الی الاسلام فلم یحسنوا ان یقولوا اسلمنا فجعلوا یقولون صبانا صبانا فجعل خالد یقتل ویاسر حتی قدمنا علی النبی ﷺ فذکرناہ فرفع یدیہ فقال انی ابرء الیک مما صنع خالد مرتین۔ [1]

یعنی

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے حضرت خالد بن ولید کو قبیلہ خذیمہ کی طرف روانہ کیا۔ وہاں پہنچ کر خالد نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں کہا کہ "اسلمنا" ہم نے اسلام قبول کیا۔ بلکہ وہ یہ کہنے لگے "صبانا، صبانا" یعنی ہم صابی ہو گئے۔ اب چونکہ اتمام حجت ہو چکی تھی۔ حضرت خالد نے مزاحمت کرنا اور لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ہم رسول اللہؐ کی خدمت میں واپس آئے۔ اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ یہ سنتے ہی حضورؐ نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ اور کہا اے خدا خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں ———— یہی بات آپ نے دو مرتبہ فرمائی"

کفار و مشرکین کی مسلسل اور پیہم دراندازیوں، سازشوں اور شرارتوں کے بعد یہ طے ہو چکا ہے کہ انہیں اب مکہ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ان کے لئے اب چارہ کار یہی ہے کہ یا تو جہاں چاہیں چلے جائیں۔ ورنہ اسلام قبول کر لیں اور یہ دونوں باتیں نامنظور ہیں تو پھر جنگ کریں!

حضرت خالدؓ بنو خذیمہ کی مہم پر بھیجے جاتے ہیں۔ آپ اسلام کی دعوت پیش کرتے ہیں

[1] صحیح بخاری

چند لوگ اسلمنا کے بجائے غلط فہمی سے اصبنا کہتے ہیں۔ حضرت خالد غلط فہمی سے کچھ کو تو قتل کر دیتے ہیں، کچھ کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ انہیں معاف نہیں کرتے۔ خدا کو گواہ کر کے کہتے ہیں۔ یا اللہ میں خالد کے اس فعل سے بری ہوں۔ اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ انہوں نے عمداً مارا ہے تب تو حضرت خالد بھی نہیں بچ سکتے تھے۔ لیکن غلط فہمی کے باوجود ان سے ایک سنگین جرم سرزد ہوا، اور اللہ کے رسول نے اس فعل سے اپنی برأت چاہی ———

کیا وسعت قلب اور رواداری کا یہ شاندار کارنامہ نہیں؟

گناہ اور کفارہ گناہ

خالد بن ولید کا واقعہ آپ کے گوش گزار ہو چکا۔ اب انہیں خالد کے صاحبزادے حضرت عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید کا ایک واقعہ سنئے:

"غزونا مع عبد الرحمن بن خالد بن الوليد فأتي باربعة اعلاج من العدو فامر بهم فقتلوا صبرا فبلغ ذلك ابا ايوب الانصاري فقال سمعت رسول الله ﷺ ينهى عن قتل الصبر فوالذي نفسي بيده لو كانت دجاجة ما صبرتها فبلغ ذلك عبد الرحمن بن خالد بن الوليد فاعتق اربعة رقاب۔"

یعنی

ہم عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید کے ساتھ ایک غزوہ میں گئے۔ تو چار کافر دشمنوں میں سے پکڑ لائے گئے۔ عبد الرحمٰن نے انہیں باندھ کر قتل کروا دیا۔ ابو ایوب انصاری کو خبر گئی تو انہوں نے کہا۔ آنحضرت ﷺ نے باندھ کر قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ خدا کی قسم اگر مرغی بھی ہوتی تو بھی میں باندھ کر اسے ہلاک نہ کرتا۔ عبد الرحمٰن کو یہ معلوم ہوا تو چار غلام اس کے کفارہ میں آزاد کئے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اسلام کوئی ایسی بات گوارا نہیں کرتا جس سے انسانیت کا وقار کم ہوتا ہو۔

اسلام کیسے پھیلا؟

لوگ کہتے ہیں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ یہ وہ لوگ کہتے ہیں جو اسلام سے، اس کی تاریخ سے، اسلام کے رسولؐ سے اور اس کی حیات طیبہ سے ناواقف محض ہیں۔ ورنہ اگر ان کی نظر اس حقیقت پر ہو۔ تو وہ دیکھیں گے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار نے ذرا بھی مدد نہیں کی۔ وہ صرف اپنی خوبیوں اور رسول اکرمؐ کے مکارم اخلاق کے باعث لوگوں کے دلوں تک پہنچا۔ اور انہوں نے اسے قبول کر لیا۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ کی حدیث ہے:۔

عن ابی هریرة قال بعث رسول الله ﷺ خیلا قبل نجد فجاءت برجل من بنی حنیفة یقال له ثمامة بن اثال سیّد اهل الیمامة فربطوه بساریة من سواری المسجد فخرج الیه رسول الله ﷺ فقال ماذا عندك فقال عندی یا محمد خیر ان تقتُل تقتُل ذا دمٍ وان تنعم تنعم علی شاکر وان کنت ترید المال فسل تعط منه ماشئت فترکه ﷺ حتی کان الغدُ فقال ما عندك یا ثمامة؟ فقال عندی ما قلت لك ان تنعم تنعم علی شاکر وان تقتل تقتل ذا دم وان کنت ترید المال فسل، تعط منه ماشئت، فترکه رسول الله ﷺ حتی کان بعد الغد فقال له ما عندك یا ثمامة؟ فقال عندی ما قلت لك ان تُنعم تُنعم علی شاکر وان تقتُل تقتُل ذا دم وان کنت ترید المال فسل تُعط منه ماشئت فقال رسول الله ﷺ اطلقوا ثمامة فانطلق الی نخل قریب من المسجد فاغتسل ثم دخل المسجد فقال اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله یا محمدؐ والله ما کان علی وجه الارض وجه ابغض الیّ من وجهك فقد اصبح وجهك احب الوجوه کلها الیّ والله ما کان من دین ابغض الی من دینك فاصبح

دینک احب الدین الیّ ووالله ما کان من بلد ابغض الی من بلدک فاصبح بلدک احبّ البلاد کلها الیّ وان خیلک اخذتنی وانا ارید العمرة فماذا تری؟ فبشره رسول الله وامره ان یعتمر فلما قدم مکة قال له قائل اَصَبَوْتَ. فقال لا ولکنی اسلمت مع رسول الله ص[1]

یعنی

حضرت ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر نجد کی طرف بھیجا۔ اہل لشکر تک بنو حنیفہ کا ایک شخص جس کا نام ثُمامہ بن اثال تھا۔ اور جو اہل یمامہ کا سردار تھا۔ پہنچا۔ لشکر والوں نے اسے مسجد کے ایک ستون سے باندھ لیا۔ پھر اسے لے کر رسول اللہ صؐ کے پاس آئے۔

آپؐ نے دریافت فرمایا تیرے پاس کیا ہے؟

وہ بولا

اے محمدؐ میرے پاس خیر ہے۔ اگر قتل کرو گے تو ایک خونی کو قتل کرو گے (یعنی جو قتل کا مستحق ہے) اور اگر انعام (معاف) کرو گے تو انعام کرو گے ایک شکر گذار پر۔ اور اگر تمہیں مال چاہیئے تو مانگو۔ جو کچھ بھی مانگو گے دیا جائے گا ————

آپؐ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے

یہاں تک کہ دوسرا دن ہوا

آپؐ نے پوچھا اے ثُمامہ تیرے پاس کیا ہے؟

اس نے کہا، وہی جو میں کہہ چکا ہوں۔ اگر انعام کرو گے تو ایک شکر گذار پر انعام کرو گے

---

[1] صحیح مسلم ——— صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث تقریباً انہی الفاظ اور انہی مفہوم کے ساتھ موجود ہے لیکن ذرا اختصار کے ساتھ!

گر قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے۔ اور اگر تم مال چاہتے ہو تو مانگو جو مانگو گے وہ ملے گا۔

رسول اللہ ؐ نے پھر اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا اور چلے گئے

یہاں تک کہ دوسرا دن نمودار ہوا

رسول اللہ ؐ نے اس سے پوچھا

اے ثمامہ تیرے پاس کیا ہے؟

وہ بولا

میرے پاس وہی ہے جو کہہ چکا ہوں یعنی اگر انعام کرو تو ایک شکر گذار پر انعام کرو گے اور اگر قتل کرو تو ایک خون والے کو قتل کرو گے۔ اور اگر تم مال چاہتے ہو تو مانگو۔ جو مانگو گے وہ ملے گا۔

رسول اللہ ؐ نے (اہل لشکر سے) کہا۔ ثمامہ کو یونہی بغیر کچھ معاوضہ لئے یا سزا دئے (چھوڑ دو!

رہائی کے بعد ثمامہ مسجد کے قریب ایک کھجور کے درخت کے پاس گیا یہاں پہنچ کر اس نے غسل کیا۔ پھر مسجد میں داخل ہوا اور کہا

میں گواہی دیتا ہوں۔ کہ اللہ ایک ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔

پھر اس نے (آنحضرت ؐ سے) کہا

اے محمد ؐ!

خدا کی قسم اس زمین پر کوئی چہرہ آپ کے چہرے سے زیادہ قابل نفرت نہ تھا۔ اب آپ کا چہرہ دنیا کے تمام چہروں سے زیادہ مجھے محبوب ہے۔

خدا کی قسم آپ کے دین سے زیادہ کوئی دین بھی میرے لئے قابل نفرت نہیں تھا

اور اب آپ کا دین دنیا کے تمام دینوں سے زیادہ میرے لئے محبوب ہے۔
خدا کی قسم آپ کے شہر سے زیادہ کوئی شہر بھی میرے لئے نفرت انگیز نہیں تھا
اور اب آپ کا شہر دنیا کے تمام شہروں سے زیادہ مجھے محبوب ہے۔
آپ کے لشکر نے مجھے اس حالت میں آلیا کہ میں عمرہ کا ارادہ کر رہا تھا۔ اب آپ کا
کیا حکم ہے؟

رسول اللہ ؐ نے اسے خوشخبری دی اور اجازت دی کہ وہ عمرہ کر لے۔
پھر جب وہ مکہ میں اپنے کافر و مشرک ساتھیوں کے پاس واپس آیا۔ تو ساتھی نے کہا
کیا تو صابی ہو گیا؟ ——— یعنی کیا تو بے دین ہو گیا؟

اس نے جواب دیا

نہیں ——— بلکہ میں رسول اللہ ؐ پر ایمان لے آیا مسلمان ہو گیا
——— یہ تھی اسلام کی وہ تلوار جس نے صرف ایک ثمامہ بن اثال ہی کو نہیں
اور بھی نہ جانے کتنوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا ——— جن میں سے
بعض کا ذکر آئندہ چل کر اپنے اپنے مقام پر آئے گا!

عجیب اسلام

پاس عہد ——— غیر مسلموں کے ساتھ ——— جس کا نظیر ابو رافع کے اسلام
میں ملتا ہے کہیں نہیں مل سکتا۔ اس جگہ ایک مختصر سے واقعہ کا ذکر مقصود ہے ———
یہ واقعہ صلح حدیبیہ کا ایک ضمیمہ ہے۔ واقعہ خود صاحب واقعہ بیان کرتا ہے
ابو رافع بیان کرتے ہیں

وعن ابی رافع قال بعثنی قریش الی رسول اللہ ؐ فلما رأیت رسول
اللہ ؐ القی فی قلبی الاسلام فقلت یا رسول اللہ انی واللہ لا ارجع
الیھم ابداً فقال انی لا اخیس بالعھد

رجع: فان کان فی نفسك الذی فی نفسك الآن فارجع قال فذهبت ثم اتیت النبی (ص) فاسلمت ؎۱

یعنی

ابورافع کہتے ہیں۔ قریش نے مجھے رسول اللہ ص کے پاس پیامبر بنا کر بھیجا۔ جب میں نے رسول اللہ ص کو دیکھا تو میرے دل میں اسلام داخل ہوگیا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! اب اسلام قبول کرنے کے بعد میں خدا کی قسم ان (کافروں) کے پاس واپس کبھی نہیں جاؤں گا۔

آپؐ نے فرمایا

میں عہد نہیں توڑ سکتا، تم واپس جاؤ، اگر وہاں جاکر بھی تمہارے دل میں وہی رہے جو اب ہے تو واپس آجانا۔

ابورافع کہتے ہیں۔

میں واپس گیا، پھر بعد میں (وہاں جاکر) واپس آیا۔ اور میں نے اسلام قبول کر لیا ——— یہ واقعہ کتنے متعدد اور متنوع پہلوؤں کا حامل ہے؟ ——— یہ واقعہ صرف اسی دین میں پیش آسکتا تھا جو سچا ہو، پاس عہد کی یہ مثال صرف وہی نبی پیش کر سکتا تھا جو حقیقی معنی میں سید الانبیاء ہو!

وہ عہد کیا تھا؟

اب یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ وہ عہد کیا تھا؟ جس کی پابندی پر آنحضرت ص کو اس درجہ اصرار تھا؟

حضرت براء بن عازب کی حدیث ہے

عن البراء بن عازب قال صالح النبیؐ المشرکین یوم الحدیبیة علی ثلثة اشیاء علی ان من اتاہ من المشرکین ردہ الیھم ومن اتاھم من

؎۱ ابوداؤد

المسلمین لم یردہ وعلی ان یدخلها من قابل ویقیم بها ثلثة ایام ولا یدخلها الا بجلبان السلاح والسیف والقوس ونحوہ فردہ الیهم[1]

یعنی

براء بن عازب کہتے ہیں رسول اللہ نے مشرکین سے حدیبیہ کے موقع پر جو صلح کی تھی۔ وہ تین امور پر مبنی تھی۔

۱۔ یہ کہ مشرکین میں سے جو شخص آنحضرتؐ کے پاس آئے۔ آپ اسے مشرکین کے پاس واپس کر دیں گے۔

۲۔ مشرکین کے پاس جو مسلمان آئے اسے وہ واپس نہیں لیں گے۔

۳۔ نیز یہ کہ آپؐ (اس سال بغیر حج کئے) واپس چلے جائیں۔ اور سال آئندہ مکہ میں داخل ہوں۔ اور صرف تین دن ٹھہریں۔ اور مکہ میں اس حالت میں داخل ہوں۔ کہ سلاح جنگ میان میں ہوں۔

یہ تھی وہ صلح جس کی پابندی پر آپؐ کو اس درجہ اصرار تھا

ابوجندل کا واقعہ

عین اس صلح کے وقت ایک صحابی حضرت ابوجندل مشرکین مکہ کے قبضہ سے نکل بھاگے۔ اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے آپؐ کے پاس آکر پناہ گزین ہونا چاہا۔ آپؐ ——— صلح کر چکے تھے اور اب اس کی پابندی ضروری تھی۔ چنانچہ فردہ الیهم[2] ——— یعنی آپ نے ابوجندل کو مشرکین کے حوالے کر دیا۔ اور ابوجندل سے مخاطب ہو کر فرمایا

اصبر واحتسب فانا لا نغدر[3] یعنی

اے ابوجندل صبر کرو۔ ہم بدعہدی نہیں کر سکتے

---

[1] صحیح بخاری نیز صحیح مسلم [2] فتح الباری

چند اور مثالیں

رسول اکرم صلعم کی یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ رواداری

مشرکین سے بھی زیادہ جو لوگ داعی اسلام ؐ اور دعوت اسلام کے اعلا عدو اور بدترین مخالف تھے، وہ تھے یہود اور نصاریٰ۔ کیونکہ ان دونوں نے مشرکین پر اپنی مالی، مادی اور ذہنی بالادستی جو قائم کر رکھی تھی۔ وہ اسلام کے فروغ کے بعد باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ لوگ دانائے دنیا تھے اور جانتے تھے کہ اسلام کا عروج ان کے زوال کا پیش خیمہ ہوگا۔ اور بعد میں واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کا یہ اندیشہ غلط اور بے بنیاد نہیں تھا۔ اسلام کا سورج جب چمکا۔ تو عیسائیت اور یہودیت کی روشنی ماند پڑ گئی۔ یہ دنیا کا سب سے پہلا عوامی مذہب تھا۔ جس میں کسی قسم کی پاپائیت نہیں تھی۔ کوئی مذہبی طبقہ نہیں تھا۔ نہ کوئی برہمن تھا نہ مذہبی مراسم کا انجام دینے والا ٹھیکیدار جس کے معمولات ہر شخص ادا کر سکتا تھا۔ جس نے خدا اور بندے کے درمیان ہر واسطہ کو ختم کر دیا تھا۔ جو عبد اور معبود کے درمیان تنہا رشتۂ اتصال تھا۔

اس کا اندیشہ کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اسلام اور داعی اسلام کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ سنگدلی، سفاکی، شرارت، سازش، فریب، عہد شکنی کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جس کے اختیار کرنے میں تامل کیا ہو۔

مسلمان جب تک بے بس تھے۔ ظاہر ہے نہ وہ انتقام لے سکتے تھے نہ مقابلہ کر سکتے تھے۔ دفاع اور مزاحمت تک اُن کے بس کی چیز نہیں تھی لیکن جب خدا نے انہیں سرو سامان مرحمت فرمایا۔ طاقت دی۔ قوت اور شوکت عطا فرمائی۔ جاہ و جلال کا مالک کیا۔ حکومت اور سلطانی کی نعمت دی۔ تو وقت تھا کہ ایک ایک چیز کا گن گن کر بدلہ لیتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کہ ان کے نبی اور رسول نے انہیں منع فرمایا تھا۔ یہ کافر اور مشرک سہمے ہوتے تھے۔ ڈر رہے تھے۔ کہ اب ان کی دراز دستیوں کا بدلہ لیا جائے گا۔ لیکن نبی اکرم نے انہیں بشارت دی کہ انتم الطلقا "تم آزاد ہو" کسی پچھلے جرم کی باز پرس نہیں کی کسی پچھلی خطا پر سزا نہیں دی۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے ہجرت کے بعد مسلمانوں کے مکانات وغیرہ پر جو ناجائز قبضہ کر لیا تھا۔ وہ بھی برقرار رہا۔ اور ان سے کہہ دیا گیا۔ کہ اگر یہ سب کچھ تم نے اس لئے چھوڑا تھا۔ کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرو۔ تو اب ان چیزوں کی واپسی کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ ——————— اور مسلمانوں نے ہمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی سراطاعت خم کر دیا۔ یہ تاریخ کا اتنا عام واقعہ ہے۔ کہ ہر پڑھا لکھا شخص اس سے واقف ہے۔

بنو قریظہ

یہ وہ یہود تھے۔ جنہیں نہ صرف یہ کہ اسلام اور داعی اسلام سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ یہ اس دعوت کے سخت مخالف تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کا ان کے ساتھ بھی نہایت ہی رواداری برتاؤ تھا۔ مدینہ جانے کے بعد آپؐ نے یہودیوں سے ایک معاہدہ کیا جسے میں ایک غیر مسلم مورخ کے الفاظ میں درج کرتا ہوں۔

یہودیوں کی مدد اور اعانت کی جائے گی۔ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، نہ ان کے خلاف کسی دشمن کو مدد دی جائے گی یہودی اپنے مذہب پر قائم رہیں گے۔ اور مسلمان اپنے مذہب پر۔ اور اگر کوئی اُن پر حملہ کرے گا۔ تو ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔" ؎۱

عہدنامۂ نجران

اسی طرح ۹ھ میں آنحضرت ؐ نے عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ فرمایا۔ وہ بھی رواداری، حسن سلوک اور وسعت قلب کی ناقابل فراموش تاریخ ہے۔

"پیغمبر نے بشپوں، پادریوں اور راہبوں کو یہ تحریر دی کہ ان کے گرجاؤں، عبادات اور خانقاہوں میں ہر ایک چھوٹی بڑی چیز جیسی تھی، ویسی ہی برقرار رہے۔ خدا اور اس کے رسول ؐ نے یہ عہد کیا۔ کہ نہ کوئی بشپ اپنے عہدے سے اور نہ کوئی راہب اپنی خانقاہ سے اور نہ کوئی پادری اپنے منصب سے خارج کیا جائے۔ اور نہ اُن کے اختیارات، حقوق اور معمول میں کسی قسم کا تغیر ہونے پائے اور جب تک وہ امن اور صلح اور سچائی کے ساتھ رہیں نہ ان پر جبر و تعدی کی جائے اور نہ وہ کسی پر جبر یا زیادتی کریں ؎۲

۴ھ کا ایک معاہدہ

۴ھ میں آنحضرت ؐ نے جو معاہدہ عیسائیوں سے فرمایا تھا۔ وہ لفظ و معنی ہر اعتبار سے حریت، رواداری اور مساوات کا اتنا بڑا اچارٹر ہے۔ جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔

سنہ ہجری کے چوتھے سال (۶۲۲ء) پیغمبر اسلام نے سینٹ کیتھرائن متصل

؎۱ لائف آف محمد مصنف میور (اعظم الکلام) ؎۲ لائف آف محمد مصنف میور

کوہ سینا کے راہبوں اور تمام عیسائیوں کو پوری آزادی اور وسیع حقوق عطا کیے۔ اور ساتھ ہی اس کے اس امر کا بھی اظہار کر دیا کہ اگر

"کوئی مسلمان ان احکام کی خلاف ورزی کرے گا۔ تو وہ خدا کے عہد کو توڑنے والا اس کے احکام کے خلاف کرنے والا اور اپنے دین کا ذلیل کرنے والا خیال کیا جائے گا۔ اس حکم کی رو سے خود پیغمبران کے ذمہ دار ہوئے۔ اور نیز اپنے پیرووں کو تاکید کی کہ وہ عیسائیوں کے گرجاؤں، راہبوں کے مکانوں اور نیز زیارت گاہوں کو ان کے دشمن سے بچائیں۔ اور تمام مضر اور تکلیف رساں چیزوں سے پورے طور پر ان کی حفاظت کریں۔ نہ ان پر بے جا ٹیکس لگایا جائے۔ نہ کوئی اپنی حدود سے خارج کیا جائے۔ نہ کوئی عیسائی اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا جائے۔ نہ کوئی راہب اپنی خانقاہ سے نکالا جائے اور نہ کوئی زائر اپنی زیارت سے روکا جائے۔ اور نہ مسلمانوں کے مکان اور مسجد بنانے کی غرض سے عیسائیوں کے گرجا مسمار کیے جائیں۔ ہر خلاف اس کے عیسائیوں سے اس امر کی توقع نہیں رکھی جاتی۔ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ان کے دشمنوں سے مقابلہ کریں۔ اس لئے کہ خراج گذار ملک کو جنگ و جدل سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلمانوں کی عیسائی بیویاں اپنے مذہب پر قائم رہتیں۔ اور اس بنا پر ان کو کسی قسم کی تکلیف و ایذا نہیں دی جاتی تھی۔ پیغمبر اسلام نے اس مشہور معاہدہ میں یہ بھی لکھا۔ کہ اگر عیسائیوں کو گرجاؤں، صومعوں کی تعمیر میں یا اپنے کسی مذہبی امر میں مدد کی ضرورت ہو۔ تو مسلمانوں کو ہر طرح ان کی اعانت کرنا چاہیئے مگر یہ خیال نہ کرو۔ کہ اس سے ان کے مذہب میں شرکت ہوتی ہے۔ بلکہ یہ صرف ان کے احتیاج کو رفع کرنا ہے۔ اور رسول خدا کے ان احکام کی پیروی کرنا ہے۔ جو خدا کے حکم سے ان کے حق میں تحریر

کئے گئے ہیں۔ جنگ کے وقت یا اس زمانہ میں جبکہ مسلمان اپنے دشمنوں سے برسرِ پیکار ہوں۔ کسی عیسائی سے اس لئے نفرت یا عداوت نہیں رکھنا چاہیئے کہ وہ مسلمانوں میں رہتا ہے۔ جو کوئی مسلمان کسی عیسائی سے ایسا سلوک کرے گا۔ تو وہ نامنصف اور رسول کا نافرمانبردار اور سرکش خیال کیا جائے گا"۔

یہ شرائط تھے اس سند کے جو پیغمبرِ اسلام ؐ نے عیسائیوں کو عطا کی تھی۔ یہ ایک نہایت وقیع اور عظیم الشان پروانۂ آزادی اور دنیا کی تاریخ میں اعلیٰ درجہ کی مساوات حقوق کی ایک شریفانہ اور قابل وقعت یادگار ہے[1]

ماضی اور حال کی تاریخ ہمیں اور بھی بہت سے فاتحوں اور کشور کشاؤں کے نام بتاتی ہے۔ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان فاتحوں کا برتاؤ اپنے محکوموں کے ساتھ کیا تھا؟ حاکم رعایا کو کس طرح کی آزادی دیتے تھے؟ ان باتوں کا اگر اسلام کی رواداری اور مسامحت سے موازنہ کیا جائے۔ تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہو گا!

دشمن کی گواہی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس برتاؤ کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کے قلوب میں غیر مسلم کے ساتھ رواداری راسخ ہو گئی۔

اس سلسلہ میں ذیل کی شہادت جو مسلمانوں کے عہدِ زوال سے تعلق رکھتی ہے۔ خاص طور پر اہم اور توجہ طلب ہے۔ اس سے معلوم ہو گا۔ کہ عہدِ انحطاط میں بھی مسلمانوں کا برتاؤ غیر مسلموں کے ساتھ کیسا مشفقانہ اور رحمدلانہ تھا۔

مسٹر البن کلیر اور مسٹر برونی لکھتے ہیں کہ

رومیلیا ایک شخص محمد آغا ساکن اداجک کے قبضے میں اس

---

[1] جنگ روس و روم (کامل) مصنفہ ایڈمنڈ اولی جلد اول صفحہ ۷۶ تا ۷۷ (اعظم الکلام)

قدر زمین ہے۔ جس میں بونے کے لئے تین سو کیل غلے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے پاس دو جوڑیاں بھینسوں کی بھی ہیں۔ اس کو علاوہ عشر اور ٹیکسوں کے تین سو کی پیاسٹر الاکیہ یعنی پراپرٹی ٹیکس کے ادا کرنے پڑتے ہیں۔"

"ایک دوسرا شخص غیر مسلم زماستاڑ ایک دیر کے قرب و جوار کا رہنے والا جو چند کھیتوں کا مالک ہے۔ اور جن کے بونے کے لئے پانچ سو کیل غلے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور جو آٹھ جوڑیاں بھینسوں کی رکھتا ہے۔ اس کو بھی سالانہ تین سو پیاسٹر ادا کرنا پڑتے ہیں۔

اس طرح پر اس عیسائی کی ابتدا ہی بہت سے فوائد کے ساتھ ہوئی لیکن محمد آغا کے چھ بیٹے ہیں۔ جن میں سے پانچ فوجی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اور سب سے بڑا بیٹا دس ہزار پیاسٹر ادا کر کے مستثنےٰ ہوا ہے۔ اب وہ مجبور ہے۔ کہ بجائے بیٹوں کے مزدوروں سے اجرت پر کام لے جن کو تین ہزار پیاسٹر (تقریباً اٹھائیس پونڈ) سالانہ دینا پڑتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں زماستار کے چاروں بیٹے کام کرتے ہیں۔ یا اکدیر کے بےشمار قہوہ خانوں میں سے کسی جگہ شراب پئے پڑے رہتے ہیں۔ اور ہر ایک کاروبار کی آزادی کے لئے پچیس پیاسٹر سالانہ ادا کر دیتے ہیں۔

اگر ہم اس مسئلہ استثنائے غیر مسلم کو حسابی اصول سے جانچ پڑتال کریں۔ تو تناسب باہمی حیرت انگیز ہوگا۔

اگر اس موقع پر بیس برس کی عمر کے بعد اور بیس سال اوسط زندگی فرض کریں اور زندگی کا یہی بیس برس کا حصہ بیس سے چالیس تک ایک تا ب و تواں اور قوت و تحمل کا زمانہ ہوتا ہے۔ جس میں انسان ہر طرح کی متواتر اور

بانداز مشقت و محنت برداشت کر سکتا ہے۔ تو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ایک
ترک کو مجبوراً بیس سال کی عمر سے فوج میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اور غیر مسلم کو
بیس برس کی عمر سے پچیس پیاسٹر بدل عسکری ادا کرنا شروع کرتا ہے۔ اس طرح
مسلمان اپنی جوانی کے دس سال یا اپنی نہایت مفید زندگی کا نصف حصہ اپنے
ملک کی نذر کرتا ہے۔ اور حالانکہ ایک غیر مسلم نہایت چھوٹی چھوٹی قسطوں میں
پانچ سو پیاسٹر ادا کر کے ان بیس سال کے لئے آزادی حاصل کر لیتا ہے۔

اس مسئلہ پر نظر ڈالنے کا ایک اور طریق بھی ہے۔ چونکہ جوان سالی کا نصف
زمانہ گورنمنٹ لے لیتی ہے۔ اس لئے ایک سال میں سے خود اس کے قبضۂ قدرت
میں صرف ایک سو بیالیس دن (نصف سال) رہ جاتے ہیں۔ اور حالانکہ
بلگیرین صرف چار شلنگ چھ پنس ادا کر کے سال کے پورے تین سو پینسٹھ دن
کا مالک ہے۔ لہذا اسی اصول تناسب سے ایک عیسائی کی پیداوار بھی
ایک ترک سے زیادہ ہونا چاہئیے لیکن صورت واقعہ اس کے خلاف ہے۔
اگر دونوں کے پیداوار غلّہ وغیرہ میں کچھ فرق نظر آتا ہے۔ تو اضافے کا پہلو
مسلمان کی جانب ہے۔ اس عجیب و غریب نتیجہ کی وجہ ایک تو بلگیریوں کی جبلی
سستی و کاہلی ہے۔ اور دوسری وجہ مذہبی تہواروں کی یونانی فہرست کی تہ
میں مستتر ہے۔ کیونکہ بلگیرین اس نصف سال سے جو ان کو گورنمنٹ عثمانیہ کی بدولت
مل جاتا ہے یہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ کہ وہ ان ایک سو تہتر دنوں کو گریگ چرچ
کے تہواروں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ گویا ایک ترک جس زمانے میں کوچ کرتا
اور لڑتا ہے۔ تو اس وقت ایک غیر مسلم ناچتا اور شراب پیتا ہے۔ اور کم و بیش خود
اس کی فوجی خدمت کا استثنا اس کو بے انتہا منت خواری اور مطلق العنان
مے نوشی پر ترغیب و تحریص دلاتا ہے

اس مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ جس کا اثر زیادہ تر یورپ پر پڑتا ہے۔ اور وہ ٹرکی کی مالی حالت ہے۔

سلطان کی مسلمان رعایا اپنی خیالی آمدنی پر بطور ذاتی ٹیکس کے تیس پیاسٹر اوسط کے حساب سے خراج ادا کرتی ہے۔ اور علاوہ اس کے وہ اپنی محنت کے ایک سو بیاسی دن بھی گورنمنٹ کی نذر کرتی ہے جس کی قیمت خود گورنمنٹ نے پانچ سو پیاسٹر قرار دی ہے۔ اس تمام رقم کا مجموعہ پانچ سو تیس پیاسٹر ہوتا ہے۔ ہم نے اس میں ٹیکسوں کا شمار نہیں کیا۔ جو پیداوار اور مال منقولہ پر عاید کیے جاتے ہیں۔

غیر مسلم رعایا ایک تو وہی تیس پیاسٹر ادا کرتی ہے۔ اور فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کے لیے پچیس پیاسٹر۔ اس طرح پر گویا ایک مسلمان اپنا ذاتی ٹیکس ۵۳۰ اور ۵۵ کے تناسب سے ادا کرتا ہے۔ یعنی تقریباً غیر مسلم سے دس گنا زیادہ۔ جس کی نسبت انصافاً یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ایک غیر مسلم اس حساب سے چار سو پچھتر پیاسٹر کا شاہی خزانہ کا مقروض ہے۔ اور یہ ایک ایسا اضافہ ہے کہ ٹرکی خزانے کے حق میں نہایت مفید ہو

اب اگر غیر مسلم نوجوان ایک کروڑ بیس لاکھ کی کل آبادی کا پانچواں حصہ فرض کیے جائیں تو اس حساب سے یہ ایک ارب اٹھارہ کروڑ پچھتر ہزار پیاسٹر کی عظیم الشان رقم ہو جاتی ہے۔ جو تقریباً دس ملین اسٹرلنگ پونڈ ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس رقم کا وصول کرنا عین انصاف ہوگا۔ کیونکہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ جبکہ سلطنت عثمانیہ اپنی تمام مسلمان رعایا پر اس قدر ٹیکس لگاتی ہے۔ تو وہ عیسائیوں سے اسی قدر رقم لینے کا حق رکھتی ہے۔

جب بہ زمانہ بایزید ترکوں کے ساتھ پوری رعایتیں کی جاتی تھیں۔ اور غیر مسلموں کو کوئی مالی اور ملکی حقوق حاصل نہ تھے۔ تو اس وقت یہ جبریہ خدمت بے شک تکلیف دہ ہوتی لیکن اب جبکہ ترک اور غیر مسلم رعایا ہر لحاظ سے سوائے فوجی خدمت کے ایک حالت میں رکھے گئے ہیں رحالانکہ یہی استثناء عثمانی نسل کے نیست و نابود ہوجانے کا خوف دلا رہا ہے) اور جبکہ غیر مسلم اعلیٰ سے اعلیٰ رتبے اور کثیر المنفعت عہدے حاصل کرسکتے ہیں۔ اور جبکہ تمام سرکاری مدارس اور کالج ان کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ تو ایسی صورت میں کسی قسم کا کوئی ممکن یا معقول عذر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ کہ غیر مسلم تو محنت کے ٹیکس سے مستثنیٰ کردیئے جائیں۔ حالانکہ مسلمان اپنے خون کا ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ہم سے ایک بڈھے ترک نے کیا اچھی بات کہی کہ جب کفار پاشا بنائے جاتے ہیں۔ تو سپاہی کیوں نہیں بنائے جاتے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ پاگل اور بزدل ہے [1]

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ خاص خاص مثالیں اور مذکورہ واقعات کی ضروری تفصیل ہم آئندہ صفحات میں جب رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ سے بحث کریں گے۔ حسب موقع پیش کریں گے:

---

[1] دی ایسٹرن کوئسچن ان بلگیریا سینٹ کلیر و بی بروفی صفحہ (۳۱) تا (۳۲)

فقہ اسلامی

(۱)

من کانت له ذمتنا فدمه کدمنا ودیته کدیتنا (علی المرتضیٰ)

جو غیر مسلم ہمارے ذمہ میں آجائے اس ذمی کا خون ہمارا خون ہے اس کی دیت ہماری دیت ہے۔

(۲)

حضرت عبید اللہ ابن عمر فاروقؓ نے دو کافروں کو اس شبہ میں قتل کر دیا۔ کہ وہ قتل عمرؓ میں شریک تھے حضرت عثمانؓ جو مسند خلافت پر پہنچے۔ تو انہوں نے مہاجرین وانصار سے رائے لی حضرت علی رضؓ نے فتویٰ دیا گردن اڑا دی جائے۔ مہاجرین نے بالاتفاق کہا۔ عمرؓ کے بیٹے کو قتل کر دینا چاہیئے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے پاس سے خون بہا ادا کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔

"امام رازی رح نے اپنی کتاب مناقب الشافعی میں حنفیوں کو طعنہ دیا ہے کہ ان کے نزدیک، ابوبکر صدیق رض کا خون اور ایک ذمی کا خون برابر ہے۔ یعنی اگر ابوبکر صدیق رض بے جرم کسی ذمی کو قتل کر ڈالتے تو حنفیوں کے نزدیک وہ بھی قتل کئے جانے کے مستحق تھے ——————— ہم فخر کے ساتھ اس طعنہ کو قبول کرتے ہیں۔ بے شبہ انصاف اور حق کی حکومت میں شاہ و گدا، مقبول اور مردود کا ایک رتبہ ہے۔ بے شبہ یہ اسلام کی بڑی فیاضی ہے کہ اس نے اپنی رعایا کو اپنے برابر سمجھا۔ اسلام کو اس انصاف پر ناز ہو سکتا ہے۔ اگر امام رازی رح کو عار آتی ہے تو آئے!"

(سیرت النعمان۔ شبلی رح)

اگر کوئی ذمی جزیہ ادا کرنے سے انکار کردے یا کسی مسلمان کو قتل کر ڈالے یا سب نبی کرے یا کسی مسلمان عورت سے زنا کرے تو اس حرکت سے اس کا معاہدۂ اطاعت معدوم نہیں ہو جائے گا۔ کیونکہ ذمیوں کو قتل کرنا جس بنا پر فتویٰ کیا گیا ہے۔ وہ جزیہ کا صرف تسلیم کر لینا ہے نہ کہ حقیقی طور پر اس کا ادا کرنا اور جزیہ تسلیم کر لینے کا معاہدہ ابھی تک باقی ہے۔

ہمارے حنفی فقہا کی رائے میں سب نبی صرف ایک کلمۂ کفر ہے۔ جو ایک کافر سے سرزد ہوا ہے۔ اور جبکہ اس کا کفر معاہدۂ اطاعت کے وقت مانع معاہدہ نہیں ہوا تو یہ نیا کفر اس معاہدۂ اطاعت کو ساقط بھی نہیں کر سکتا[1]

---

[1] ہدایہ ترجمہ چارلس ہملٹن جلد ۲ صفحہ ۲۲۱ یا اصل عربی جلد ۲ صفحہ ۱۴۴ مطبوعہ کلکتہ

"قوم مفتوح پر (مسلمانوں کی طرف سے) جو شرائط لگائی گئی تھیں۔ وہ ایسی تھیں کہ لوگ فاتحین کے مقابلہ میں بجائے ظلم کے اطمینان پاتے تھے۔ اور جب وہ اپنی اس حالت کا مقابلہ اپنی گزشتہ حالت سے کرتے تھے جس میں انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ تو وہ اس تبدیلی کو اپنی خوش قسمتی خیال کرتے تھے۔ مذہبی امور میں انہیں پوری آزادی تھی۔ ان کے گرجے تمام مداخلت اور نقصان سے بری تھے۔ ان کے جان و مال مامون و محفوظ تھے۔ یہ تھا وہ صلہ جو انہیں غیروں کی اطاعت میں ملا۔ اور اس کے معاوضے میں وہ صرف ہلکا سا ٹیکس (جزیہ) ادا کرتے تھے لیکن علاوہ اس کے انہیں اور فوائد بھی حاصل تھے۔ مثلاً عرب اپنے وعدے کے پکے اور قول کے پورے تھے۔ وہ ہر قوم و ملت کے شخص سے یکساں انصاف کا برتاؤ کرتے تھے جس سے لوگوں کو عموماً اہل عرب پر بڑا بھروسہ ہو گیا تھا۔"

تاریخ اسپین (عہد اسلام) از کانڈی

معروضات

گذشتہ اوراق میں ہم بسط و تفصیل کے ساتھ یہ بتا چکے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ قرآن و حدیث میں کس قسم کے روادارانہ برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے۔

اب ہم فقہ کو لیتے ہیں اور اس عنوان کے تحت بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ فقہ اسلامی نے ذمیوں اور مفتوح غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کے جو اصول اور قواعد قرآن و حدیث کی روشنی میں وضع کئے ہیں، وہ اپنی رواداری و روح کے اعتبار سے دنیا کی کسی کتاب آئین میں نہیں ملیں گے۔

فقہ اسلامی میں زیادہ تر ہم فقہ حنفی کو پیش نظر رکھیں گے، اس لئے کہ مسلمانان عالم کی اکثریت اسی فقہ پر عمل کرتی ہے۔ خاص طور پر ملوک و سلاطین اسلام کی بہت بڑی تعداد اسی فقہ پر عامل رہی، اور اس فقہ کے بنائے ہوئے قاعدے ضابطے اور اصول عدالتوں میں معمول بہ رہے۔ قاضی اور منصف انہی ضابطوں کی بنا پر فیصلے کرتے تھے، اور وہ نافذ ہوتے تھے۔ یہ بات دوسرے ائمہ فقہ کے اصولوں اور ضابطوں کو حاصل نہیں تھی۔ اس لئے فقہ حنفی کے

امثال و شواہد گویا اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ کہ مسلم ملوک و سلاطین کے عہد حکومت و فرماں روائی میں غیر مسلموں اور ذمیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا رہا؟ انہیں کیا کیا مراعات حاصل ہوئے؟ انہوں نے کس طرح زندگی بسر کی؟ ان میں اور عام مسلمانوں میں حکومت کے نقطۂ نظر سے کچھ فرق تھا یا نہیں تھا؟ یہ اور اس طرح کے جتنے سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ سب ہمارے اس عنوان کے تحت آجائیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ فقہ حنفی میں ذمیوں کے متعلق کچھ سخت احکام بھی ملتے ہیں لیکن یہ بات بالاتفاق تسلیم شدہ ہے کہ

۱۔ یہ متاخرین فقہا کی اپج ہے جس کا امام ابوحنیفہ کے اجتہاد و استنباط سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۔ دوسرے یہ چند احکام صرف کاغذی ہیں۔ عملی حیثیت انہیں کبھی اور کسی دور میں حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ خود غیر مسلم مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کرنے پر اپنے تئیں مجبور پایا۔

اب ذمیوں اور غیر مسلموں سے متعلق فقہ حنفی کے مختلف اہم مسئلے زیر بحث آتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ اصل موضوع پر گفتگو شروع ہو۔ میں اپنے ماخذ کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ یوں تو ہدایہ، شرح وقایہ اور دوسری کتب فقہ بھی میرے پیش نظر رہی ہیں۔ لیکن زیادہ مدار میں نے فتاوی عالمگیری پر رکھا ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک مفتی بہ اور معمول بہ کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کتاب میں استدلال و استناد کے موقعہ پر جن اصل ماخذوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ مسائل کے ساتھ ساتھ موجود ملیں گے۔

جہاد کی شرط اباحت

جہاد اسلام کا بہت ہی اہم بالشان مسئلہ ہے۔ جہاد کی تاکید و تائید اور ترغیب اور تحریص و تشویق سے متعلق قرآن کی جو آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ اور حدیث نبوی میں جو

کچھ فرمایا گیا ہے۔ وہ صفحات ماسبق میں گذر چکا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ جہاد کی شرط اباحت کیا ہے؟ فقہ حنفی نے اس سلسلہ میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ کب اور کن حالات میں اسے جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ فقہ کا صاف فیصلہ یہ ہے۔

"اگر دشمن کو مسلمانوں کی طرف سے امان نہ دی گئی ہو۔ اور نہ اس کے اور مسلمانوں کے درمیان امن ہو تو جہاد جائز ہے ورنہ نہیں" [1]

گویا امان اور معاہدۂ امن اگر ہے تو کفار سے جو جنگ ہوگی "اسے" جہاد نہیں کہا جا سکتا۔

غیر مسلم والدین کی مسلمان اولاد

اسلام اور ایمان کی شرط اولین یہ ہے۔ کہ جو شخص اسلام قبول کرتا ہے۔ مومن اور مسلم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ دنیا کی کسی چیز کو بھی اسلام پر ترجیح نہ دے۔ ہر خواہش، ہر تمنا، ہر آرزو اس راستے میں قربان کر دے۔ اور اگر ضرورت پیش آئے۔ تو اپنی سب سے قیمتی اور آخری پونجی ——— زندگی ——— تک خدا کی راہ میں نثار کر دے ———

——— ہاں وہ اپنی جان نثار کر سکتا ہے لیکن اپنے کافر والدین کا دل دکھا کر نہیں۔ ان کے جذبات مجروح کر کے نہیں۔ یہ بڑا اہم اور نازک مسئلہ ہے۔ ع

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر

ایک طرف اسلام کی محبت، اسلام کے عشق، اسلام کے ناموس اور حرمت پر کٹ مرنے، جان دے دینے، نثار ہو جانے کا جنون۔ دوسری طرف خود اسلام کی عائد کی ہوئی یہ قدغن کہ جہاد کے راستہ میں تم قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اگر تمہارے کافر والدین کو تمہاری جدائی شاق ہے۔ نہیں تمہاری جان کا خطرہ ہے۔

---

[1] ہدایہ ۱۲

فقہ، قرآن و حدیث کی طرح مجمل نہیں ہوتی۔ وہ کتاب و سنت کے اجمال سے اپنی تفصیل تیار کرتی ہے۔ فقہی مجتہدات کی اصل و اساس قرآن اور حدیث کے سوا کچھ نہیں۔ انہی بنیادوں پر وہ اپنی عمارت تعمیر کرتی ہے۔ چنانچہ فقہ نے اس اہم اور معرکہ آرا مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو نگاہ میں رکھا ہے۔ ہر ہر پہلو سے بحث کی ہے۔ اور تمام باتوں کو سامنے رکھ کر ایک ضابطہ مرتب کیا ہے۔

اس سلسلہ میں فقہ حنفی کی معتبر، متداول اور مستند کتابوں میں وضاحت اور تشریح کے ساتھ صورت مسئلہ کا جو پہلو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے:۔

"——— اگر والدین کافر ہوں یا دونوں میں سے ایک کافر ہو اور دونوں نے اس کے جہاد پر جانے کو مکروہ (ناپسند) رکھا۔ یا کافر نے مکروہ رکھا تو اس پر (مسلمان اولاد پر) لازم ہے کہ اپنے قلب سے تحرّی (فتویٰ) کرے۔"

ا۔ پس اگر اس کی تحرّی میں یہ بات آئے کہ انہوں نے میرا نکلنا اس وجہ سے مکروہ رکھا ہے کہ میرے قتل ہو جانے کے خوف سے ان کے دل پر گھبراہٹ اور صدمہ ہے تو نہ نکلے۔

۲۔ اور اگر اس کی تحرّی میں یہ بات آئے کہ انہوں نے میرا جہاد میں جانا اس وجہ سے مکروہ رکھا کہ ہمارے دین و ملت (اہل کفر) والوں سے قتال کرے گا۔ تو اس کو اختیار ہوگا کہ بدون ان کی رضامندی کے چلا جائے۔

۳۔ لیکن اگر ان (کافر والدین) کے ضائع ہو جانے (صدمہ سے ہلاک ہو جانے) کا خوف ہو۔ تو اس صورت میں بھی جہاد پر نہ نکلے ——— !

۴۔ اور اگر اس نے تحرّی کی اور اس کی تحرّی ان میں سے کسی بات پر واقع نہ ہوئی۔ بلکہ اس کو شک رہا اور کوئی جانب گمان دوسرے پر مرجح نہ ہوئی۔ تو مشائخ نے فرمایا ہے کہ اسے جہاد پر نہ نکلنا چاہیئے۔

کیا کسی مذہب نے کسی قوم وملت نے کسی آئین ملکی نے "غیر مذہب والے والدین" یا اصطلاح میں "دشمن" کے لئے یہ مراعات ملحوظ رکھے ہیں؟ جہاد اسلام کا افضل ترین فریضہ ہے۔ جہاد کرتے ہوئے جو لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ وہ مرتے نہیں۔ زندہ رہتے ہیں۔ جہاد سے جو لوگ جی چراتے ہیں۔ ان کی اسلام کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رہ جاتی۔ ایک صحابی کو جو محض اپنی کسلمندی کے باعث جہاد میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ داعی اسلام ؐ نے معاشرتی مقاطعہ کی سزا دی تھی۔ لیکن یہی اسلام غیر مذہب والے والدین کے جذبات کا اتنا پاس ولحاظ رکھتا ہے۔ کہ مسلم اولاد کو اجازت نہیں دیتا۔ کہ وہ ان کا دل دکھا کر یہ سب سے بڑی سعادت حاصل کر سکے۔ ذرا سا پہلو بھی اگر کافر والدین کو قلبی صدمہ پہنچنے کا نکلتا ہے تو اسلام اسے روا رکھتا ہے کہ جہاد نہ کیا جائے۔ مگر اسے گوارا نہیں کرتا۔ کہ کافر والدین کو روتا چھوڑ کر جہاد کا راستہ اختیار کیا جائے۔

"امان" جہاد کی حالت میں

جنگ شروع ہوجانے کے بعد جب تلوار میان سے نکلتی ہے تو پھر وہ کسی کی رعایت نہیں کرتی کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ کسی سے مروت نہیں کرتی جو سامنے آیا اگر زور آور ہے تو قتل بنا۔ کمزور ہے تو قتل ہوا۔ دوست، دشمن، عزیز، قریب، رشتہ دار، ساتھی یہ سارے الفاظ جنگ کے باہر کام دیتے ہیں۔ جنگ کے میدان میں ہر چہار طرف دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں۔ احتیاط کی روش، امن اور سکون کی حالت میں اختیار کی جاتی ہے جنگ چھڑ جانے کے بعد اگر وضع احتیاط پر نظر رکھی جائے۔ تو خود اپنی جان کا زیان ہے۔ جنگ صرف ایک ہی بات

کی تعلیم دیتی ہے ——— "جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے"! اور دشمن صرف اس لئے ہے کہ اس کی گردن کاٹ لی جائے۔ اس کے جسم و جان کا رشتہ منقطع کر دیا جائے، اسے کسی حالت میں بھی زندہ رہنے کا موقع نہ دیا جائے۔

لیکن اسلام زندگی کے کسی مرحلہ پر بھی رواداری، انصاف اور عدل کو نظر انداز نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ جنگ کے میدان میں بھی قتل و نہب کی اندھا دھند اجازت نہیں دیتا۔ انسانی اقیادات اور ترجیحات کو یہاں بھی پیش نظر رکھتا ہے۔

چنانچہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک مسلمان کی میدانِ جہاد میں کافر باپ سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو وہ کیا کرے ——— ؟ فقہ اسلامی تفصیل سے اس سوال کا جواب دیتی ہے۔

"——— جب امام المسلمین دار الحرب میں جانے کا قصد کرے۔ اور مسلمان کسی شہر یا قلعہ کا محاصرہ کریں تو

۱۔ پہلے ان (غیر مسلموں) کو اسلام کی طرف دعوت دیں۔ اگر وہ قبول کر لیں تو قتال سے باز رہنا چاہیئے۔

۲۔ اگر انکار کریں تو ادائے جزیہ کی دعوت دیں [1]

۳۔ اگر وہ قبول کر لیں تو ہماری راحت ان کی راحت، ان کی مصیبت ہماری مصیبت ہوگی [2]

۴۔ جس کو اسلام کی دعوت نہیں دی گئی اس سے قتال کرنا جائز نہیں [3]

۵۔ اگر بغیر دعوت اسلام کے ان سے قتال کیا تو سب گناہگار ہوں گے [4]

۶۔ گونگا، بہرا، طفل، بوڑھا لڑائی پر اپنے ہم قوموں کو برانگیختہ کرے تو دوران جنگ

---

[1] ہدایہ [2] کنز الدقائق [3] ہدایہ [4] مبسوط (شمس الائمہ سرخسی)

ہیں) ان کا قتل جائز ہے۔ اور جب وہ مسلمانوں کے ہاتھ آ گئے (گرفتار ہو گئے) تو پھر ان کا قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ اگرچہ انہوں نے کئی آدمیوں کو قتل کیا ہو[۱]

۷۔ مرد مسلمان اپنے مشرک عزیز یا رشتہ دار کو (جنگ کی صورت میں) پہل کر کے قتل کر سکتا ہے۔ لیکن اپنے (مشرک یا کافر) باپ کو قتل نہ کرے۔ بجز اس صورت کے کہ باپ نے بیٹے کو اپنے قتل پر مجبور کر دیا ہو۔ مثلاً بیٹے کے لئے باپ کے قتل کے سوا اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہ گئی ہو۔

۸۔ اگر دوران جنگ میں بیٹے نے اپنے باپ پر قابو پا لیا۔ تو اسے قتل نہ کرے[۲]

کیا اس سے بڑھ کر صلہ رحمی کی کوئی مثال مل سکتی ہے؟ کیا قرابت، تعلق خاطر اور خون کے رشتہ کا اس سے زیادہ احترام کیا جا سکتا ہے؟

بلا اجازت

دشمن کو معاف کرنے یا امان دینے کا اختیار سپہ سالار تک کو نہیں ہوتا۔ صرف مملکت کا رئیس اعلیٰ ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اسلام چونکہ ترک جنگ کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ لہٰذا اس نے یہ اختیار ہر مسلمان کو دے رکھا ہے۔ جو مسلمان بھی دشمن کو امان دے۔ وہ نافذ کر دی جائے گی۔ پھر اس سے قتال (جہاد) ہرگز جائز نہیں۔ چنانچہ فقہ کا مسئلہ ہے۔

"اگر کسی مسلمان نے امام کی اجازت کے بغیر امان دے دی۔ تو یہ جائز ہے اور سب مسلمانوں پر واجب ہو گی یعنی اس کو کوئی توڑ نہیں سکتا[۳]"

---

[۱] فتاویٰ قاضی خاں [۲] البحر المحیط [۳] سراج وہاج

اسلام کی امن پسندی اور جنگ بیزاری کا یہ اتنا بڑا ثبوت ہے جس کے بعد اسلام کو "جنگجو مذہب" صرف وہی لوگ قرار دے سکتے ہیں، جو حق و صداقت سے بالکل دستبردار ہو گئے ہوں۔

صلح کیسے ٹوٹتی ہے؟

دشمن سے کیا ہوا معاہدہ صلح کب اور کس طرح ٹوٹ سکتا ہے؟ یہ بڑا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ دنیا میں آج بھی تعامل اس اصول پر ہے کہ پیمان صلح بڑی آسانی سے ٹوٹ سکتا ہے۔ خواہ دشمن کی کوئی خطا ہو یا نہ ہو۔ شبہ اور شک کی بنا پر بھی اسے توڑا جا سکتا ہے۔ احتیاط اور پیش بندی کے طور پر بھی اسے قطع کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت اور احتیاج کے مطابق بھی اسے ردی کا کاغذ بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جنگ عظیم ثانی میں ہم نے دیکھا۔ جب روس نے پولینڈ پر، برطانیہ نے ایران پر، جرمنی نے روس پر، جاپان نے پرل ہاربر پر، اٹلی نے البانیہ پر یلغار کی۔ تو کاغذات پر پیمان صلح استوار تھا، لیکن جنگ کے میدان میں اسے تلوار کی نوک سے پھاڑا جا رہا تھا۔

آیئے اب دیکھیں، اسلامی فقہ نے اس سلسلے میں جو اصول اور ضابطے بنائے ہیں، وہ کیا ہیں۔

۱۔ نبذ یعنی صلح کا (کافروں کی شرارت یا مصلحت کے باعث) رد کر دینا اس صورت میں جائز ہے کہ انہیں (غیر مسلموں کو) اتنی مہلت دی جائے کہ ان کا بادشاہ (یا سربراہ) اس مدت میں اپنے اطراف مملکت میں یہ خبر پہنچا سکے۔

۲۔ اور اگر غیر مسلم محاربوں نے امن و صلح کے اطمینان پر اپنے قلعے بے مرمت کر ڈالے ہوں۔ اور ادھر ادھر منتشر اور پراگندہ ہو گئے ہوں۔ تو انہیں اتنی مہلت دینی چاہیئے۔ کہ سب (غیر مسلم) اپنے مامن میں واپس آ جائیں۔ اور اپنے قلعوں کو یوں ہی بنا لیں، جیسے وہ پہلے تھے [1]

---

[1] تلبیس ۱۴

۲۔ اور مسلمانوں کو ہر گز یہ جائز نہیں ہے۔ کہ اہل حرب پر یا ان کے اطراف ملک پر جب تک صلح باقی ہے یوٹ مار کریں۔ [1]

جس زمانہ میں بہ حالت صلح جنگ شروع کی جا سکتی ہو اور جنگ کے زمانہ میں ایٹم بم برسائے جا سکتے ہوں۔ اور معاہدہ صلح "حسب مصلحت" توڑا جا سکتا ہو۔ اس زمانہ میں جو لوگ یہ پڑھیں گے کہ معاہدہ صلح قطع کرنے سے پہلے دشمن کو اتنی مہلت دینی چاہیئے کہ وہ اپنے قلعوں کو مستحکم کر لے اور اپنے مورچوں پر سامان جنگ سے لیس ہو کر آ جائے۔ انہیں واقعی بہت تعجب ہو گا۔

عارضی صلح

عارضی صلح یا متارکہ جنگ کی اصطلاح نئی نہیں۔ آج بھی یہ عمل میں لائی جاتی ہے کوریا اور کشمیر میں متارکۂ جنگ کے بعد جو حادثات ہوئے یا ہوتے رہتے ہیں ان پر ہر دو حکومتوں کی طرف سے آئے دن احتجاج کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اسلام نے متارکہ جنگ کے جو حدود مقرر کئے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ممکنہ اور متوقع حقیقی اور فرضی حادثات کے سلسلہ میں جو پالیسی اختیار کی ہے وہ یہ ہے۔

۱۔ اگر اہل حرب میں سے جن کے ساتھ موادعت[2] (TRUCE) اور صلح ہے۔ کوئی جماعت دار الحرب سے نکل کر دار الاسلام میں رہزنی کرے۔ تو یہ امران (ساری کافر قوم) کی طرف سے نقض عہد نہیں تصور کیا جائے گا۔

۲۔ اگر کوئی گروہ ساز و سامان جنگ کے ساتھ بغیر اپنے بادشاہ یا سپہ سالار کی اجازت کے دار الحرب سے دار الاسلام میں حملہ آور ہو تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن اس کے

---

[1] سراج وہاج ص ۵۰۰۔ میں نے موادعت کا ترجمہ انگریزی کے لفظ (Truce) سے کیا ہے جو بالکل ہم معنے ہے۔

[2] موادعت کا معنیٰ ہیں کچھ مدت کے لئے جنگ ملتوی کرنے کا وعدہ کرنا (رئیس احمد جعفری)

بادشاہ اور اس کے اہل مملکت کی طرف سے اس اقدام کو موادعت (TRUCE) یا صلح کی خلاف ورزی نہ سمجھا جائے گا۔

۳۔ لیکن اگر اس گروہ کو اپنے بادشاہ یا مملکت کی تائید و حمایت حاصل ہے تو یہ اہل حرب کے حق میں نقض عہد تصور کیا جائے گا۔[۱]

کیا اس رواداری، وسعت قلب اور مسامحت کی نظیر دنیا کا کوئی ملک آج بھی پیش کر سکتا ہے؟

پاس عہد کی انتہا

معاہدہ ایسی حالت میں بھی ختم نہیں ہو جاتا۔ اس عہد انسانیت کبریٰ میں بھی جو رعایت کوئی قوم کسی کو نہ دے سکی، وہ اسلام نے غیر مسلموں کو دی ہے۔ یہ وہ رعایت ہے جس پر ہمیشہ اسلامی حکومتوں نے عمل کیا۔ اور اگر کسی بادشاہ نے اس پر عملدرآمد کرنے میں کوتاہی کی تو علماء حق نے اسے ٹوکا۔

اگر اہل اسلام اور اہل حرب سے صلح قائم ہے۔ پھر اہل حرب میں کا کوئی شخص دار الحرب سے کافروں کے ایسے ملک میں داخل ہوا جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہے۔ وہاں مسلمانوں نے اس اہل حرب کو بھی گرفتار کر لیا۔ تو سابقہ معاہدہ کے مطابق اب بھی (اس سے صلح قائم رہے گی۔ وہ امن میں ہو گا۔ اس پر کوئی زیادتی نہیں کی جا سکتی۔ اس کا مال بھی نہیں چھینا جا سکتا۔ اپنے غلام اور املاک، سب پر اس کا تصرف رہے گا۔ کیونکہ جن کافروں سے ہم صلح کر چکے ہیں۔ وہ جہاں چاہیں، جائیں۔ جس ملک میں چاہیں داخل ہوں۔ ہر حالت میں وہ مامون رہیں گے۔[۲]) انہیں ایوکی (EVACUEE) قرار دیا جائے گا نہ انٹنڈنگ ایوکی (INTENDING EVACUEE)

یہ امن کوئی ملک اپنے ہم وطن اور کوئی قوم اپنے ہم قوموں اور کوئی مذہب اپنے ہم مذہبوں کو بھی دینے پر تیار نہیں لیکن اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے یہ حق عطا

---

[۱] فتاوی کرخی [۲] سراج وہاج

زمادیا تھا۔

انتہائی اعتماد

اسلام نے ذمیوں کے ساتھ جو رعایتیں کی ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اسلام نے ذمیوں پر جو اعتماد کیا ہے، اس کی مثال بھی دنیا کی کوئی قوم نہیں پیش کر سکتی۔

تقسیم ہند کے وقت اور اس کے بعد مسلمانان ہند سے ہتھیار لے لئے گئے۔ در اس دیمبیتی کی حکومتوں نے علی الاعلان محکمہ پولیس میں ان کا داخلہ روک دیا۔ اب بھی ان پر اعتماد نہیں کیا جاتا، انہیں پاکستان کا دوست اور ایجنٹ پبلک جلسوں میں کہا اور اخبارات کے صفحات پر لکھا جاتا ہے۔ حالانکہ ہندوستان ایک سیکولر حکومت ہے اور از روئے آئین دستور وہاں کے مسلمانوں کو وہی حقوق حاصل ہیں جو کسی ہندو کو حاصل ہو سکتے ہیں ——
—— لیکن قول و عمل کا فرق ہم ہر روز دیکھتے، سنتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام اپنی مملکت میں ذمیوں کو شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ انہیں دوسرے کافروں اور مشرکوں کا ایجنٹ اور بدخواہ نہیں سمجھتا۔ جنگ اور دشمنا کہ جنگ ہر حالت میں وہ ان پر اتنا ہی اعتبار و اعتماد کرتا ہے جتنا کسی مسلمان پر، چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب میں آپ دیکھیں گے۔

"اہل حرب کے ہاتھ ساز و سامان جنگ فروخت کرنا مکروہ ہے۔ خواہ ان سے صلح ہو گئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اسی طرح لوہا وغیرہ جو چیز اصل آلات حرب ہے، ان کے ہاں بھیجنا یا ان کے ہاتھ فروخت کرنا مکروہ ہے۔ اور ذمیوں کے ہاں ان چیزوں کا بھیجنا یا بیچنا مکروہ نہیں ہے۔"[1]

ہم نے رواداری، اخوت اور مساوات پر بہت سے اکابر عالم کی تقریریں پڑھی ہیں، بہت سے بین الاقوامی شہرت کے مدبرین کے بیانات دیکھے ہیں۔ بہت سے دانشمندانِ وقت کے خیالات و تاثرات کا مطالعہ کیا ہے لیکن ہمیں کہیں بھی یہ سراغ نہیں

---

[1] شرح مختار ۲

ملا کہ کسی نے اپنی مملکت میں غیر قوم کے افراد کے ساتھ اس درجہ اعتماد کیا ہو۔ یا اس کی تلقین کی ہو۔

غلام کا مقام

زندگی کے ہر معاملہ میں اسلام جتنا اعتدال پسند، احتیاط پسند اور اصول پسند ہے اتنا ہی ترقی پسند بھی ہے۔ اسلام ہی نے سب سے پہلے عورت کو مرد کا ہم پایہ قرار دیا۔ اسلام ہی نے سب سے پہلے عورت کی خود مختاری، انفرادیت اور وراثت تسلیم کی اسلام ہی نے سب سے پہلے غلام اور آقا کو ایک صف میں بٹھایا۔

دنیا نے غلام کا جو روپ دیکھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنی کسی چیز کا مالک نہ تھا۔ نہ جان کا، نہ مال کا، نہ آبرو کا، نہ ضمیر کا، نہ ارادہ کا، نہ فکر کا، وہ صرف اس لئے تھا۔ کہ روندا جائے، کچلا جائے، پامال کیا جائے۔ اس کے برعکس اسلام نے سب سے پہلے تو غلامی کا انسٹی ٹیوشن ہی ختم کیا اور جو باقی رہ گئے تھے انہیں وہ مقام دیا جو کسی طرح آقا سے فروتر نہ تھا۔

فقہ ان قوانین کا مجموعہ ہے۔ جو قرآن و حدیث کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے گئے ہیں انہی قوانین کے ماتحت قاضی کی عدالت فیصلہ کرتی ہے۔ ہماری اس کتاب الآئین نے بھی غلام کو ہر طرح سے مساویانہ حقوق عطا کئے ہیں ان حقوق سے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں غلام کا مقام کیا ہے؟ وہاں یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ رواداریانہ برتاؤ کرنے میں غلامی اور آقائی ایک ہی سطح پر آجاتی ہیں۔

غیر مسلم اور غلام

کافروں اور مشرکوں سے جنگ کی صورت میں ایک مرد مسلم اور ایک مومن خاتون کو حق ہے۔ کہ وہ امان دے دے۔ یہ امان اسلامی اسٹیٹ تسلیم کرلے گی جن شرائط

پر امان دی گئی ہے، وہ بحال رہیں گے، پھر ان کے جان و مال سے تعرض نہیں کیا جائے گا ——— بالکل یہی حق اسلام نے ایک غلام اور باندی کو بھی دیا ہے، چنانچہ فقہ اسلامی ہمیں بتاتی ہے

۱۔ اگر غلام نے ——— جس کے آقا نے اسے جہاد و قتال کی اجازت دے رکھی ہو ——— امان دی تو بلا اختلاف اس کی امان جائز ہے۔

۲۔ اور اگر اس کے آقا نے اسے جہاد و قتال کی اجازت نہیں دی ہے، تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کی امان نادرست ہے۔ امام محمد کے نزدیک صحیح ہے۔ امام ابویوسف کا قول مضطرب ہے۔

۳۔ بعض مشائخ کا قول ہے کہ غلام محجوب کی امان میں یہ اختلاف اس صورت میں ہے کہ یہ جہاد بغیر نفیر عام کے واقع ہوا ہو (یعنی فرض کفایہ ہو فرض عین نہ ہو) لیکن اگر جہاد کے واسطے نفیر عام ہو (یعنی فرض عین کی صورت ہو) تو ہر فرد بشر پر جہاد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بلا اختلاف اس کی امان صحیح ہوگی[1]

جو حق حکومتیں اپنے سربر آوردہ اصحاب کو بھی نہیں دیتیں، وہ حق اسلام نے ایک غلام کو عطا کر دیا ہے ——— یہ غلام کی عزت افزائی ہے اور غیر مسلموں کے ساتھ محبت رحم اور عنایت کی انتہا ہے!

باندی اور طفل صغیر

غلام تو خیر مرد ہے، سیاست اور اس کے اتار چڑھاؤ کو سمجھ سکتا ہے لیکن کیا ایک باندی بھی اس کی سزاوار ہے کہ اسے یہ حق دیا جائے؟ ایک طفل نوخیز بھی اس کا مستحق ہے کہ اس طرح اُسے سرفراز کیا جائے؟

فقہ کا جواب اثبات میں ہے

---

[1] البحر المحیط

" ـــــ باندی کے امان دینے میں بھی وہی تفصیل ہے جو غلام میں مذکور ہوئی یعنی اگر باندی اپنے آقا کی اجازت سے قتال کرتی تو اس کا امان دینا صحیح ہے۔ اور اگر وہ قتال نہ کرتی ہو تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کی امان صحیح نہیں ہے [1]

اسی طرح طفل صغیر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ

۱۔ اگر کوئی طفل اسلام کو سمجھتا ہو۔ حالانکہ (کم عمری کے باعث) وہ قتال سے ممنوع ہو تو امام محمد کے نزدیک اس کی امان صحیح ہے۔

۲۔ اور اگر وہ قتال کے واسطے اجازت یافتہ ہو۔ تو بالاتفاق اس کی امان صحیح ہے [2]

بے نظیر اور بے مثال

فقہ اسلامی کی کرید سے غیر مسلموں کے ساتھ روادارانہ برتاؤ کے سلسلہ میں عجیب عجیب قوانین نظر سے گذرتے ہیں۔ ہر قانون اور اس قانون کے جزئیات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ اسلام نے مسلمانوں کے پاس عہد اور غیر مسلموں کے حقوق، ناموس اور احترام کس درجہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ کسی گروہ مشرکین کو امان دے اور دوسرا مسلمان گروہ اپنی لاعلمی کے باعث مصروف پیکار ہو جائے، فتح پائے اور فتح کے لوازمات سے مستفید ہو۔ لیکن کیا امان کی اطلاع مل جانے کے بعد بھی وہ ایسا کر سکے گا؟ ـــــ اور جو کچھ اپنی فتح مندی کے عالم میں وہ کرے گا اس کا انجام اور حشر کیا ہوگا؟ ـــــ ملاحظہ فرمایئے

"اگر مسلمانوں میں سے کسی مرد نے (محارب) مشرکوں کے ایک گروہ کو امان دی، پھر مسلمانوں کے دوسرے گروہ نے ان (مشرکین) پر حملہ کیا ان کے

---

[1] جوہرہ ۱۲۵ [2] فتح القدیر ۱۲

مردوں کو قتل کر دیا۔ عورتوں کو گرفتار کیا، اموال کو لوٹ لیا۔

پھر اس حملہ آور گروہ مسلمین کو معلوم ہوا کہ انہیں کسی مسلمان نے امان دے دی تھی تو

۱۔ جن مشرکوں کو مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ ان کی دیت واجب ہوگی۔

۲۔ ان کی عورتیں واپس کر دی جائیں گی۔

۳۔ مال لوٹا دیا جائے گا۔

جن عورتوں کو گھر میں رکھ لیا گیا۔

۱۔ ان کا مہر ادا کیا جائے گا۔

۲۔ اگر کوئی اولاد پیدا ہوئی ہے وہ خود بخود آزاد ہوگی۔

۳۔ اور باپ کے مسلمان ہونے کے باعث مسلمان قرار دی جائے گی۔

۴۔ اور واپس نہیں کی جائے گی۔[1]

اسلامی فقہ کا یہ قانون ہمیں بتاتا ہے کہ صرف مال ہی نہیں واپس کیا جائے گا صرف عورتیں ہی نہیں لوٹائی جائیں گی۔ بلکہ اس لاعلمی کی جنگ میں جو غیر مسلم قتل ہوئے ان کا خون بہا بھی ادا کرنا پڑے گا۔ اسلامی عدل اور اسلام کی نگاہ میں غیر مسلم کی جان و مال کے احترام کا یہ وہ انتہائی نقطہ ہے، جہاں اب تک دنیا کی ترقی یافتہ قومیں ذہنی اعتبار سے بھی نہیں پہنچ سکی ہیں۔ عملی اور تعاملی اعتبار کا کیا سوال؟ جب غیر مسلموں کو اتنے حق

[1] البحر المحیط ۱۲

حاصل ہو جائیں۔ تو کیونکر ممکن ہے کہ کوئی مسلمان ان پر دست تعدی دراز کر سکے؟

مقبوضہ عورتیں

دشمن سے جنگ و پیکار کی صورت میں جو عورتیں گرفتار ہوتی ہیں۔ وہ لونڈی ہی بنائی جاتی ہیں لیکن اسلام عورت کا کس درجہ احترام کرتا ہے اس کا جواب یہ ہے۔

۱۔ (۱) ضبح ہو عورتیں عدت کی مدت گذار لینے کے بعد واپس کی جائیں گی۔

۲۔ اس عدت کے زمانہ میں کسی عادل کے پاس رکھی جائیں گی۔

۳۔ اور عادل اس معاملہ میں بوڑھی پرہیزگار عورت ہوگی نہ کہ مرد۔

ان تمام دفعات میں کوئی ایک دفعہ بھی ایسی ہے جو عدل و قسط کے خلاف ہو؟ سب سے اہم سوال عدت کا تھا۔ اس زمانہ کے لئے نہ حوالات تجویز کی گئی نہ سکیو ہوم بلکہ ایک بوڑھی عورت ولی قرار پائی۔ اور صاف الفاظ میں مرد ——— خواہ کتنا ہی متقی اور پارسا ہو ——— خارج کر دیا گیا ———

بات سے بات

بات میں بات نکلتی ہے۔ ابھی چند سال پہلے ہندوستان تقسیم ہوا تھا۔ اور اس تقسیم کے وقت دونوں حکومتوں نے اقلیتوں کو "اماں" دی تھی۔ لیکن پائی پھر لاکھوں آدمی قتل ہوئے۔ ہزارہا ہزار عورتیں مقبوضہ قرار پائیں۔ اربوں روپیہ کا مال لوٹا گیا ——— نہ خون بہا ادا کیا گیا۔ نہ عورتوں کی فریاد سنی گئی۔ نہ مال واپس کیا گیا۔ بلکہ ایک نئی اصطلاح عازم تخلیہ INTENDING EVACUEE عالم وجود میں آگئی!

اماں کی صورتیں

اسلام کا قانون اماں کے لئے یہ ضروری نہیں قرار دیتا۔ کہ وہ چند خاص اصطلاحی

لہ البحر المحیط ۳

الفاظ کا مجموعہ ہو۔ چونکہ وہ ہر حالت میں امان دینا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ ایسے الفاظ کو بھی جائز قرار دیتا ہے جن سے امان کا مفہوم نکل سکتا ہو۔ اگر کوئی مسلمان کسی محارب غیر مسلم سے ایسے الفاظ بول دے جن سے امان کا مفہوم نکلتا ہو۔ تو وہ الفاظ امان کا جامہ پہن لیں گے۔ وہ امان نافذ کر دی جائے گی۔ اور غیر مسلم محارب ان الفاظ سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا:

اب ہم بتلاتے ہیں کہ فقہ نے کن کن الفاظ سے امان جائز رکھی ہے

۱۔ اگر مسلمانوں نے کسی حربی سے کہا لا تخف (مت ڈرو)

۲۔ یا اس سے کہا لا باس علیک (کوئی اندیشہ نہ کرو)

۳۔ یا اس سے کہا آؤ خدا کا کلام سنو

۴۔ یا اس سے کہا اجرناك (ہم نے تمہیں اجر دیا)

تو یہ سب صورتیں امان کی ہیں

امان کی اور صورتوں کے علاوہ کلام اللہ سننے کی دعوت دینا بھی امان ہے[1]

الفاظ اور اشارے

جو الفاظ اور جو اشارے جنگ میں "حکمت عملی" "پالیسی" چالاکی "وقت پرستی" کے تحت دشمن کی سادہ لوحی، موافقت یا حسن ظن سے فائدہ اٹھا کر اس کے استیصال تام کے کام آتے ہیں۔ اسلام میں وہ امان کا پیمانہ بن جاتے ہیں۔

۱۔ اگر سردار لشکر اہل اسلام نے کسی محصور جماعت سے کہا ہمارے پاس اتر آؤ۔

۲۔ یا یہ کہا کہ آؤ ہم سے خرید و فروخت کرو۔

---

[1] البحر، محیط ۱۲

تو یہ بھی حربیوں کے لئے امان نامہ سمجھا جائے گا۔

۳۔ یا اہل حرب کسی مستحکم قلعہ میں پناہ گزین ہیں، جہاں انہیں زور و قوت حاصل ہے۔ کسی مسلمان نے کسی حربی سے اشارہ سے کہا: "ہمارے پاس چلا آ"۔

۴۔ یا اہل قلعہ کو اشارہ سے کہا۔ دروازہ کھول دو۔ انہوں نے امان سمجھ کر دروازہ کھول دیا۔ تو ان مشرکوں کو امان ہوگی۔

... یعنی ایسی صورت میں رائے دشمن کی مانی جائے گی نہ کہ مسلمان کی۔[1]

لفظ اور اشارہ

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن اشارہ دیکھ لے۔ منہ سے نکلنے والے الفاظ نہ سنے۔ مسلمان دشمن کو دیکھ کر اشارہ سے بلاتا ہے۔ اور زبان سے کہتا ہے "آؤ تو مزہ چکھاؤں"۔ دشمن اشارہ دیکھ لیتا ہے۔ الفاظ نہیں سنتا ——— اب کیا ہوگا؟

اگر کسی مسلمان نے دشمن کی طرف اپنی انگلی سے اس طرح اشارہ کیا، جس سے سمجھا جاتا ہے کہ میرے پاس آؤ۔ حالانکہ اشارہ کرنے والا اپنی زبان سے کہہ رہا ہے "اگر تو آیا۔ تو میں تجھے قتل کر دوں گا" لیکن دشمن مذکور چلا آیا تو وہ امان میں ہے۔ اس کا قتل کرنا جائز نہیں۔

علی ہذا اگر مسلمان نے کافر سے کہا "چلا آ تاکہ میں تجھے قتل کر دوں"۔ وہ چلا آیا تو بھی اس کی امان ہے۔ بشرطیکہ اس نے آخری لفظ یا سنا نہ ہو یا سمجھا نہ ہو۔[2]

ایک اور صورت مسئلہ بھی خاص طور سے غور طلب ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ دشمن کے متعلقین بھی کس طرح اسلام کے رحم و کرم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

---

[1] ذخیرہ اور البحر المحیط ۱۲

اگر اہل حرب میں سے کسی مرد نے اہل اسلام سے امان طلب کی اور اس کو امان دی گئی۔ پھر اپنے ساتھ ایک عورت کو لایا اور کہا کہ یہ میری جورو ہے اور اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے لایا اور کہا کہ یہ میری اولاد ہے۔ حالانکہ امان اس نے صرف اپنی ذات کے لئے لی تھی۔ لیکن پھر بھی استحساناً یہ سب امان میں داخل ہوں گے ؎۱

جھوٹے مسلمان کی امان

ایک آدمی امیر لشکر کی طرف سے جھوٹ بھی تو بول سکتا ہے؟

اس کے لئے اسلام اس جھوٹ کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔ اور اس کا فائدہ لشکر اسلام کو نہیں، گروہ کفار کو دیتا ہے۔

۱۔ اگر امیر لشکر (اسلام) نے اہل قلعہ (کفار) سے کہا۔ اگر تم کو کوئی مسلمان امان دے۔ تو وہ باطل ہوگی جب تک میں تو تم کو امان نہ دوں۔

۲۔ پھر اہل قلعہ کے پاس کوئی مسلمان آیا اور کہا میں سردار لشکر کی طرف سے ایلچی آیا ہوں تم کو ہمارے سردار لشکر نے امان دے دی۔

۳۔ اہل قلعہ اس خبر پر اتر آئے۔ تو وہ سب کے سب امان یافتہ ہوں گے۔

۴۔ اگرچہ دشمن مذکور اس خبر میں کاذب ہو ؎۱

ہوسکتا ہے کہ اگر وہ کفار دشمن کی شرارت سے تنگ آ کر سپہ سالار اسلام یہ فیصلہ کرے کہ دشمن کو امان نہیں دی جائے گی۔ اور اس فیصلہ کا اعلان بھی کر دے۔ بعد میں کسی مسلمان نے امان دے دی۔ تو یہ امان بلا تامل نافذ کر دی جائے گی۔

اور اگر امیر لشکر نے اہل قلعہ سے کہا جب میں تم کو امان دوں تو میری

؎۱ بحر المحیط

امان باطل ہے۔ پھر ان کو امان دی۔ تو یہ امان صحیح ہوگی [1]

امام محمد کا فتویٰ

امام محمد کا فقہ اسلامی میں جو درجہ ہے۔ وہ پڑھے لکھے مسلمانوں سے پوشیدہ نہیں۔ وہ امام ابوحنیفہ کے اجل تلامذہ میں سے تھے۔ امام ابو یوسف، امام زفر اور امام محمد یہ تھے وہ اصحاب ثلاثہ جو فقہ حنفی میں ستونوں اور بنیادوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تینوں میں بھی امام محمد کا پایہ سب سے بلند ہے۔ وہ اپنے تدبر، تفقہ اور وسعت علم و نظر کے اعتبار سے اپنے اقران و امثال میں بہت زیادہ ممتاز تھے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی متداول اور معتبر کتابوں میں مفتی بہ مسائل زیادہ تر وہی ہیں جو امام محمد ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی رائے مفتی بہ نہیں امام محمد کی ہے۔

چنانچہ امام محمد کا یہ فتویٰ خاص طور پر لائق ملاحظہ طلب ہے۔

امام محمد سے مروی ہے۔ کہ اگر کافروں نے امان کی درخواست کی۔ کہ ہمیں اس شرط پر امان دی جائے۔ کہ پہلے ہم پر اسلام پیش کیا جائے۔ اگر ہم قبول کر لیں تو خیر ورنہ ہم اپنی پناہ گاہ پر واپس کر دیئے جائیں تو امام المسلمین پر اس شرط کا قبول کرنا واجب ہے۔ پس اگر قلعہ سے اتر آئے۔ ان پر اسلام پیش کیا گیا۔ مگر انہوں نے قبول نہ کیا۔ تو ان کو اختیار ہوگا۔ کہ وہ اپنے قلعہ میں چلے جائیں۔ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ انہیں قتل کریں یا ان کی عورتوں اور بال بچوں کو گرفتار کر لیں [2]

ایک اور امکانی صورت

فقہ اسلامی نے دشمن کے ساتھ کہیں بھی زیادتی اور ناانصافی ملحوظ نہیں رکھی ہے اگر اہل حرب نے کسی شخص کو حکم بنایا کہ جو یہ فیصلہ کرے گا۔ وہ ہمیں

---

[1] البحر المحیط ۲؎ زاد المعاد

منظور ہوگا، پھر وہ قلعہ سے اتر آئے اور حکم فیصلہ کرنے سے پہلے مر گیا تو یہ لوگ اپنے محفوظ مقام پر (جہاں سے آئے تھے) واپس کر دیئے جائیں گے۔ ؎۱

اسلام کسی حالت میں بھی اسے روا نہیں رکھتا کہ کسی اتفاق یا حادثہ سے فائدہ اٹھا کر دشمن کو زک دے۔ وہ ہر حادثہ اور اتفاق کا فائدہ پوری رواداری اور اولوالعزمی کے ساتھ دشمن کو دیتا ہے۔

فریب کار کافروں سے حسن سلوک

فقہ کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے:-

"اگر اہل حرب نے کہا کہ ہم کو امان دو حتیٰ کہ ہم تمہارے لئے قلعہ کا دروازہ کھول دیں۔ اور تم اس شرط سے آؤ کہ تم ہم پر اسلام پیش کرو پھر ہم مسلمان ہو جائیں لیکن جب ان پر اسلام پیش کیا گیا۔ تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تب بھی وہ لوگ امان یافتہ ہوں گے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ قلعہ سے نکل آئیں پھر ان کا عہد رد کریں۔"

مسلمان کو دھوکہ دے کر بھی اگر کوئی کافر اپنے لئے امان حاصل کر لیتا ہے۔ تو اسلام اس کی امان میں خلل نہیں ڈالتا اسے تسلیم کر لیتا ہے اور اس کی آزادی بحال رکھتا ہے۔ اسلام قبول کرنے کا وعدہ کر کے امان حاصل کرنے والا اور امان حاصل ہو جانے کے بعد اسلام نہ قبول کرنے والا شخص خواہ کتنا ہی برا ہو لیکن اسلام اس کی امان برقرار رکھتا ہے کسی قسم کی زیادتی روا نہیں رکھتا۔

اشتعال انگیز فریب کاری — مگر حسن سلوک

ایک مسلمان حاکم یا برسرِ اقتدار گروہ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی لالچ نہیں ہو سکتا کہ اگر وہ ایک یا چند غیر مسلم محصورین کو امان دے دے۔ تو اتنے سارے مسلمان قیدیوں کا

؎۱ البحر المحیط

سراغ لگ جائے گا۔ اور وہ دشمن کے دستِ تعدّی سے نجات پا جائیں گے لیکن سراغرسانی کا غلط وعدہ کر کے امان حاصل کرنے والا کافر بہر حال مامون ہے۔ اس کی یہ اشتعال انگیز فریب کاری اس کے جان و مال کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائے گی۔

"اگر محصور لوگوں میں سے کسی شخص نے کہا۔ مجھے امان دو، حتیٰ کہ میں تمہارے پاس اتر آؤں۔ بدیں شرط کہ میں تم کو سو افرد مسلمان قیدیوں کی طرف کسی مقام پر رہنمائی کروں مسلمانوں نے اسی شرط پر اس کو امان دی۔ پھر جب وہ اتر آیا اور مسلمانوں کو اس مقام پر لے آیا۔ مگر دیکھا۔ تو وہاں کوئی قیدی نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ قیدی یہاں تھے۔ مگر کہیں چلے گئے مگر میں نہیں جانتا۔ کہاں چلے گئے۔ تو یہ شخص اپنے قلعہ میں یا جہاں سے آیا ہے۔ وہیں پہنچا دیا جائے گا[1]

چند اصطلاحات

عشر، خراج، غنیمت اور فے یہ سب فقہی اصطلاحیں ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے انہیں ہم سمجھ لیں تو بہتر ہو گا۔

"غنیمت اس مال کا نام ہے جو کافروں سے بہ قہر و غلبہ دوران جنگ میں حاصل کیا جائے اور فے اس مال کو کہتے ہیں جو بغیر قتال کے لیا جائے جیسے خراج اور جزیہ وغیرہ غنیمت سے پانچواں حصہ بیت المال کے لئے لیا جاتا ہے اور فے میں سے نہیں لیا جاتا[2]"

عشر وہ ٹیکس ہے جو مسلمانوں سے لیا جاتا ہے اور خراج وہ جو غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے۔ عشر جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ دسواں حصہ ہوتا ہے اور خراج جیسا طے ہو جائے

---

[1] البحر المحیط [2] غایۃ البیان

امام محمد کا ایک اور فتویٰ

عشر اور خراج سے متعلق امام محمد کے ایک فتوے کا ذکر اس جگہ ضروری ہے۔ جس سے معلوم ہو گا کہ عملی طور پر مسلمان اور غیر مسلم کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ مسلم حکومت روا نہیں رکھتی۔

"امام محمد کا فتویٰ ہے کہ اگر کسی شہر کے لوگ مسلمان ہو گئے قبل اس کے کہ مسلمان ان پر لڑ کر غالب آئیں تو وہ سب آزاد مسلمان ہوں گے۔ ان کی اراضی پر عشر مقرر کیا جائے گا خراج نہیں۔ اور یا اگر وہ لوگ مسلمانوں کے غالب آنے سے پہلے (مسلمان تو نہیں ہوئے) ذمی ہو گئے تو بھی یہی حکم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کی اراضی پر (بجائے عشر کے) خراج مقرر کیا جائے گا"۔[1]

جنگی ضرورت اور غیر مسلم

جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ لڑنے والی حکومت اپنی ہم قوم رعایا پر جو چاہتی ہے ٹیکس عائد کرتی ہے۔ جس چیز پر چاہتی ہے برائے نام یا مکمل معاوضہ دے کر یا بلا معاوضہ دیئے قبضہ کر لیتی ہے۔ اور اگر کہیں دشمن کا مال اس کے قبضہ میں آ جائے جب تو پھر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ صرف اس لئے ہے کہ بے محابا استعمال کیا جائے اور اس سے جتنا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اٹھایا جائے۔

کیا اسلام کا اصول بھی یہی ہے؟

سخت ترین ضرورت کے موقعہ پر بھی اسلام عدل اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

"اور اگر لشکر (اہل اسلام) کو آگ روشن کرنے کی حاجت ہو۔ خواہ

[1] البحر المحیط

پھلنے کے واسطے یا سردی کا صدمہ دور کرنے کے لئے تو مضائقہ نہیں ہے اہل حرب کی لکڑیاں اور نرکل وغیرہ جو پائیں وہ جلا دیں۔ بشرطیکہ یہ چیزیں جلانے کے لئے رکھی گئی ہوں۔ اور اگر کسی اور غرض سے رکھی ہوئی ہوں یعنی جلانے کے لئے نہ ہوں مثلاً وہ لکڑی کٹھرے اور کٹھولیاں بنانے کے لئے رکھی گئی ہو اور وہ اپنی ایک خاص قیمت رکھتی ہو۔ تو اس کا استعمال روا نہیں ہے[1]

کیا یہ وضع احتیاط اور کہیں اب بھی ملحوظ خاطر رکھی گئی ہے؟

دار الاسلام اور حربی

ایک حربی اگر امان لے کر دار الاسلام میں آ جاتے تو یہاں آنے کے بعد اسے کیا حقوق ملتے ہیں؟ اور وہ کس طرح غیر مسلم اور منکر اسلام ہونے کے باوجود مسلمان پر بعض مالی اور معیشی معاملات میں ترجیح اور فوقیت رکھتا ہے۔ بہتر ہو گا اگر یہ داستان السیر کی کتاب الامان سے سنی جائے۔

ایک حربی دار الاسلام میں امان لے کر داخل ہوا۔ کسی مسلمان نے اس حربی کے پاس کچھ مال ودیعت رکھا جس کو وہ دار الحرب لے گیا پھر وہ حربی مسلمان ہو گیا یا ذمی بن گیا۔ تو مال مذکور ذمی کا رہے گا۔ اس واسطے کہ وہ دار الاسلام میں اس مال کا ضامن نہ تھا[2]

پاکستان کے غیر مسلموں کو سوچنا چاہیے۔ کہ اگر یہاں اسلامی آئین نافذ ہوا۔ تو اس سے انہیں خائف ہونا چاہیے یا نہیں؟

شراب کا تاوان

سود اور شراب دونوں چیزیں اسلام میں حرام مطلق ہیں۔ دوسرے مذاہب میں نہیں اور اسلام کی مملکت میں دوسرے مذاہب کے پیرو بھی رہ سکتے ہیں اقامت کے حق

---

[1] البحر المحیط [2] المبسوط شمس الائمہ سرخسی

ساتھ انہیں یہ حق بھی ہے کہ شراب پئیں اور سور کھائیں۔ اور اگر کوئی مسلمان ان کی شراب کا نقصان کر دے یا سور ضائع کر دے تو اس پر تاوان واجب ہے۔

اگر کسی مسلمان نے کسی ذمی کی شراب ضائع کر دی یا سور تلف کر دیا تو اس کی قیمت بطور تاوان کے دیگا۔

ذمی کی غیبت نہیں کی جا سکتی

اسلام نے بڑی فیاضی سے ذمیوں کو وہ حقوق دیئے ہیں، جو عام مسلمانوں کو، چنانچہ ذمی کا مسئلہ ہے

اور واجب ہے کہ جو چیز اس کے (ذمی کے) لیئے تکلیف دہ ہے اس سے رکا جاتے۔ چنانچہ اس کی غیبت بھی حرام ہوگی جیسے مسلمان کی غیبت حرام ہے۔

پھر غور فرمائیے

ذمی کی غیبت بری، ناپسندیدہ اور محبوب نہیں ——— حرام ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مسلمان کی غیبت حرام ہے۔ حضرت علی رضہ کا یہ قول کہ ذمیوں کا خون ہمارا خون ہے صرف ایک قول نہیں۔ ایک حقیقت ہے۔ اور یہ حقیقت اسلام کی کتاب آئین تک ہر جگہ صاف اور نمایاں نظر آئے گی۔

حربی کا مال اور ودیعت

حربی اگر مستامن بن چکا ہے یعنی امان حاصل کر چکا ہے۔ تو اس کے حقوق مال اور ودیعت قائم رہیں گے۔

ایک حربی مستامن اگر دار الاسلام میں آیا۔ پھر دار الحرب واپس ہو گیا۔ اور اہل اسلام اس دار الحرب پر غالب نہ ہوئے۔ مگر حربی مذکور قتل کیا گیا

فتح القدیر

تو اس کا مال اور دولت اس کے وارثوں کا حق ہے۔ یا اگر وہ حربی اپنی موت سے دار الحرب میں مرگیا تو بھی یہی حکم ہے [1]

کیا یہ رواداری کی انتہا نہیں؟

ذمّی کے وارث اور وراثت

ایک ملک کا باشندہ کسی دوسرے ملک میں وراثت حاصل کرنے میں کیسی کیسی مشکلوں اور محرومیوں اور مایوسیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس سے اس کتاب کے پڑھنے والے ناواقف نہ ہوں گے بلکہ ممکن ہے تجربہ بھی رکھتے ہوں۔

لیکن اسلام اس معاملہ میں بھی ذمّی کے ساتھ پورا انصاف اور رعایت منظور رکھتا ہے ورثا کی عدم موجودگی میں وہ آنجہانی ذمّی کا مال و اسباب امانت رکھتا ہے۔ اور ورثا کے آنے کے بعد ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور حوالے کرتے وقت بھی یہ تحقیق کر لیتا ہے کہ کوئی وارث باقی تو نہیں رہ گیا؟

(۱) اگر حربی مستامن دار الاسلام میں اپنا مال چھوڑ کر مرگیا۔ اور اس کے وارث دار الحرب میں ہیں تو اس کا مال اس کے وارثوں کے واسطے رکھ چھوڑا جائے گا۔

(۲) پھر جب وہ لوگ یہاں (دار الاسلام میں) آئیں۔ تو اپنی وراثت پر گواہ قائم کریں تاکہ مال پائیں۔

(۳) اگر انہوں نے کسی ذمّی کو بطور گواہ پیش کیا۔ تو وہ قبول ہوں گے۔

(۴) مال حربی کے ورثا کو دے دیا جائے گا۔

(۵) مگر ان سے کفیل لے لیا جائے گا کہ اگر مال مذکور کا کوئی دوسرا مستحق ظاہر ہو تو کفیل مذکور ضامن رہے [2]

---

[1] تبیین [2] فتح القدیر

اسلام کا قاضی ذمّی کے وارثوں سے یہ نہیں کہتا کہ یہ دولت لے کر تم ایک غیر ملک میں نہیں جا سکتے۔ وہ ایک ایک پائی گن کر حوالے کر دیتا ہے۔ وہ اس کا بھی خیال رکھتا ہے کہ حربی کا کوئی اور وارث باقی رہ گیا ہو تو وہ جب بھی آئے اپنے حق سے محروم نہ رہے ـــــ!

ـــــ یہ ہے قرونِ وسطیٰ کا مذہب! ـــــــــ اسلام ـــــــــ

اسلامی دستور کا خلاصہ ہے کہ کچھ اسی قسم کی باتیں جش غیر ملکی اور پڑوسی مدبرین نے فرمائی تھیں۔

ابن تیمیہ اور کافرِ حربی

علامہ ابن تیمیہ اپنے مسلک میں بڑے متشدد ہیں۔ وہ روافض، نصیریوں، دروزیوں میریوں وغیرہ کے کفر کا فتویٰ کھلم کھلا دیتے ہیں۔ ان کے قتل کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کے قتل کو "کارِ ثواب" قرار دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہر قسم کی سفاکی اور درشتی کو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ انہیں کسی قسم کا کوئی حق دینا نہیں چاہتے۔ بہرحال یہ ان کا مسلک ہے جس طرح مولانا عبدالشکور لکھنوی کو موجودہ دور میں ان کے مسلک سے روگرداں نہیں کیا جا سکا اسی طرح اپنے زمانہ میں علامہ ابن تیمیہ پوری شدت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہے۔ کوئی شبہ نہیں علامہ ابن تیمیہ بہت بڑے آدمی تھے لیکن بہرحال آدمی تھے فرشتہ نہیں تھے۔ فکر و نظر میں ان سے بھی لغزش ہو سکتی ہے۔ اور ہر شخص کو پورا پورا حق ہے کہ وہ ان کے مسلک سے دلائل اور حقائق کی بنا پر اختلاف کرے۔

غیر مسلموں کے بارے میں بھی علامہ ابن تیمیہ کچھ زیادہ سخی نہیں تھے لیکن مجبور تھے۔ مسلمان مخالفوں اور فرقِ اسلامیہ کے بارے میں جو مسلک اختیار کرتے ہیں، جو سخت اصول وضع کرتے ہیں وہ ان کا اجتہاد ہے۔ لیکن غیر مسلموں کے بارے میں اجتہاد کی صورت نہیں، قرآن موجود ہے۔ سنت رسول موجود ہے۔ اسوہ خلفائے راشدین موجود ہے۔ غیر مسلموں کے بارے میں جب فتویٰ دیتے ہیں۔ تو ان کے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں، جو کہہ سکتے ہیں، جو کہنا چاہیئے۔ طبیعت کی درشتی لاکھ مجبور کرے لیکن

حق سے تو اعراض نہیں کر سکتے۔ چنانچہ کافر حربی کے بارے میں فتویٰ دیتے ہیں۔

واذا قدر على كافر حربي فاذا
نطق بها كف عنه ثم ان لم يصل
فانه يستتاب فان صلى والا قتله
الامام وليس لاحد من الرعية قتله
انما يقتله ولي الامور عند ابي حنيفة
يعاقبه بدون القتل [1]

"اور اگر کسی کافر حربی پر قابو پا جائے اور
وہ قبول اسلام کا اقرار کرے تو اسے چھوڑ
دینا چاہیے۔ پھر اگر نماز نہ پڑھے تو اس سے
توبہ کرائی جائے۔ اب اگر نماز پڑھے تو ٹھیک
ہے۔ ورنہ امام اسے قتل کی سزا دے گا لیکن
لیکن افراد امت میں کسی کو یہ حق نہیں بلکہ
صرف اولی الامر ہی قتل کی سزا دے سکتا ہے
اور ابو حنیفہ کے نزدیک اسے سزا دی جائے گی
قتل نہیں کیا جائے۔"

اس جگہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔ کہ علامہ نے جو رعایتیں "کافر حربی" کو دی ہیں
وہ ملائکہ مرتدین۔ خوارج۔ روافض۔ عبیدیین و نصیریہ کو نہیں دی ہیں۔
کمزور کی بات مانی جائے گی یا شستہ کی
کافروں کا ایک گروہ مسلمانوں کے ہاتھوں میدان جنگ میں گرفتار ہوتا ہے۔ [illegible]
جان بچانے کے لئے یہ دعویٰ کرتا ہے۔
ہم ذمی ہیں:
اسلام کی فوج کا سپہ دار اور لشکر والے مسلمان گواہی دیتے ہیں۔ نہیں یہ حربی ہیں [illegible]
جنگ میں گرفتار ہوئے ہیں۔
لیکن امام مسلمین سپہ دار اور لشکریان اسلام کی بات نہیں مانے گا۔ ان [illegible]
کافروں کی بات مانے گا۔ انہیں ذمی قرار دے گا۔ اور پروانہ رہائی عطا کر دے گا

[1] مختصر الفتاوی المصریہ لابن تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ۵۱

اگر کسی چھوٹے لشکر اسلام نے جو امام مسلمین کے علاوہ کسی سردار کی ماتحتی میں جہاد پر گیا ہو۔ اور اس نے جہاد کر کے کسی گروہ کو اسیر کر لیا۔ اس گروہ نے امام المسلمین کے سامنے دعویٰ کیا کہ ہم ذمّی ہیں ان مسلمان لوگوں نے ہم کو دارالاسلام سے اسیر کیا ہے۔ اور لشکر والوں نے کہا کہ یہ اہل حرب ہیں۔ ہم نے ان کو دارالحرب سے گرفتار کیا ہے۔ تو قول ان اسیروں کا قبول ہو گا [۱]

کیا اس سے یہ بات واضح نہیں ہو جاتی کہ

۱۔ اسلام جنگ نہیں چاہتا۔

۲۔ دین و مذہب کے معاملے میں جبر نہیں روا رکھتا۔

۳۔ غیر مسلموں کی جان، مال، عزت آبرو کا پورا احترام ملحوظ رکھتا ہے

۴۔ ہر شبہ، ہر غلط فہمی، ہر شک کا فائدہ مسلمان کے مقابلے میں غیر مسلموں کو دیتا ہے۔

۵۔ غیر مسلموں کی ان باتوں کو بھی برداشت کرتا ہے جنہیں وہ مسلمانوں کے لئے حرام مطلق قرار دے چکا ہے۔

۶۔ ان کی غیبت تک کو حرام قرار دیتا ہے

پھر کیا اس کے بعد بھی اسے نا روادار کہا جائے گا؟

اس پر تعصب کا الزام لگایا جائے گا ——— ؟

اسے تنگ دل اور تنگ نظر قرار دیا جائے گا؟

اسے قرون وسطیٰ کا مذہب کہہ کر اس کا مذاق اڑایا جائے گا؟

---

[۱] فتح القدیر

گرجا میں نماز پڑھی جا سکتی ہے

عام طور پر ایک مذہب دوسرے مذہب کو غلط سمجھتا ہے۔ ایک مذہب والے لوگ دوسرے مذاہب کے پرستاروں کو غلط کار اور غلط رو سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کوئی مضائقہ نہیں۔ خود اسلام بھی دوسرے مذاہب کو محرف قرار دیتا ہے۔ اور جو لوگ مسلمان نہیں ہیں انہیں کافر اور مشرک قرار دیتا ہے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ ایک مذہب کے لوگ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو بھی نجس اور غیر طاہر قرار دیتے ہیں۔ ان کا کوئی احترام نہیں کرتے۔ پنجاب پر جب سکھوں کا قبضہ تھا۔ تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں یہاں کی مسجدوں کی اور شاہی مسجد لاہور کی جو گت بنی وہ کس کو نہیں معلوم؟ اسی طرح ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خونین کے بعد بلا مبالغہ ہزاروں مسجدیں غیر مسلموں کے قبضہ میں آگئیں خود بھارت کی راجدھانی دلی میں ابھی کئی سو مسجدیں ایسی ہیں جو غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں۔ جہاں گندگی ہے نجاست ہے۔ جانور باندھے جاتے ہیں۔ کپڑے دھوئے جاتے ہیں۔ شراب پی جاتی ہے۔ فواحش کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ یہ اتنے دلخراش حقائق ہیں کہ ان کا تذکرہ بارہا انڈین پارلیمنٹ میں ہو چکا ہے۔ حکومت اقرار کر چکی ہے۔ اور انخلا کا وعدہ بھی کر چکی ہے۔ لیکن ابھی تک بات جہاں تھی وہیں ہے۔ موجودہ حکومت کے ارباب حل و عقد (راجندر پرشاد، ولبھ بھائی پٹیل، جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد) ایک وفد کی صورت میں گاندھی جی سے وعدہ کر چکے تھے۔ لیکن

...نی کی مسجدیں جلد واگذار کرا دی جائیں گی لیکن آٹھ سال کی مدت میں بھی یہ وعدہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا:

اس کے برعکس اسلام غیر مذاہب کی عبادت گاہوں کا، عبادت گاہ کی حیثیت سے اس حیثیت سے کہ وہاں خدا کا ذکر ہوتا ہے پورا احترام کرتا ہے۔ چنانچہ

وتجوز الصلوٰۃ فی الکنیسۃ [۱]

عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں میں مسلمان نماز پڑھ سکتے ہیں

اہل کتاب کو جھٹلانے کی ممانعت

آنحضرت ﷺ نے عیسائیوں اور یہودیوں کو حکم خدا سے اہل کتاب قرار دیا تھا۔ اگرچہ بات طے شدہ تھی کہ

فانا قد تیقنا قطعاً ان اصل دینھم ماخوذ عن المرسلین ثم اخبرنا اللہ انھم قد حرفوا وکذبوا [۲]

ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اہل کتاب کے دین کی اصل انبیاء مرسلین سے ماخوذ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آسمانی کتابوں میں تحریف کی اور جھوٹ بولا۔

مذہبی غلو اور تشدد کے باوجود اور اہل کتاب کی تحریف اور غلط گوئی کے باوجود جب ان کی نظر اس حدیث پر پڑی تو وہ بھی خاموش ہو گئے۔

اذا حدثکم اھل الکتاب فلا تصدقوھم ولا تکذبوھم [۳]

اہل کتاب جب کوئی بات کہیں تو نہ اس کی تصدیق کرو نہ تکذیب کرو

یعنی تصدیق اس لئے نہیں کی جا سکتی کہ نہ معلوم یہ سچ کہہ رہے ہیں یا غلط؟ اور

---

[۱] مختصر الفتاویٰ المصریہ لابن تیمیہ مطبوعہ مصر ص ۹۵ [۲] ایضاً صفحہ ۵۱۵ [۳] بخاری شریف

تکذیب یوں نہیں کی جاسکتی کہ ممکن ہے کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہوں وہ تحریف شدہ نہ ہو، صحیح ہو۔ لہذا اقتضائے احتیاط یہ ہے کہ سکوت اختیار کیا جائے۔ غیر مذاہب کے ساتھ یہ محتاط برتاؤ کیا کسی دوسرے مذہب میں نظر آسکتا ہے ؟

کسی کافر پر لعنت نہ بھیجو

وہ کافر جو اسلام کے "داعی اسلام" کے، اور تعلیمات اسلامی کے مخالف ہیں کبھی بد اندازی سے باز نہیں آتے۔ دشمنی میں جو کچھ کر سکتے ہیں کر گذرتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ چودہ سو سال کی تاریخ شاہد ہے۔ کہ انہوں نے کبھی بھی اسلام یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کیا۔ لیکن باایں ہمہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کافر پر لعنت کی جائے اور اسے برا بھلا کہا جائے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ بامر تشدد و تو غل اس مسئلہ پر کہ کافر پر لعنت کی جاسکتی ہے یا نہیں ؟ یہ فتویٰ دیتے ہیں۔

لعن الكفار مطلقا حسن لما
فيهم من الكفر واما لعن المعين
فينهى عنه وفيه نزاع وتركه اولى [1]

کفار کی جماعت پر بحیثیت مجموعی اگر لعنت کی جائے تو ٹھیک ہے۔ اس لئے کہ وہ منکر اسلام ہیں لیکن نام لے کر کسی کافر پر لعنت کرنا منع ہے بعض علماء کا اس میں اختلاف بھی ہے۔ لیکن ترک اولیٰ اور انسب ہے۔

یہ فتویٰ ہے اس شخص کا جو اپنے مسلک کے تشدد میں معروف ہے۔

---

[1] مختصر الفتاویٰ المصریۃ لابن تیمیہ

جزیہ!

تعریف، مقدار، نوعیت، کیفیت

جزیہ ——— بڑا بدنام لفظ ہے!

یہ لفظ جیسے ہی غیر مسلموں کے کان میں پڑتا ہے۔ وہ خفا ہو جاتے ہیں۔ برہم ہو جاتے ہیں۔ اسلام کو بُرا سمجھنے لگتے ہیں۔ اسلام کے متعلق غیر مناسب الفاظ اور تند و تلخ لب و لہجہ میں اظہار خیال کرنے لگتے ہیں

لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو نہ اسلام کو جانتے ہیں نہ جزیہ کو۔

جنہیں نہیں معلوم، اسلام نے جہاں اور تمام معاملاتِ حیات میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ آسانی اور سہولت دی ہے۔ وہاں ٹیکس اور محصول کے معاملہ تک بھی مسلمانوں پر انہیں ترجیح دی ہے۔ مسلمانوں سے طرح طرح کے ٹیکس اور محصول لئے جاتے ہیں لئے گئے لئے جا سکتے ہیں لیکن غیر مسلموں سے ان کی جان و مال کے

تحفظ کا صرف ایک ہی محصول لیا جاتا ہے یہی جزیہ ہے۔ اور جب مسلمان اس قابل نہیں رہتے کہ ان ذمیوں کی جان و مال کا تحفظ کر سکیں۔ تو یہ رقم پوری دیانت داری کے ساتھ واپس کر دیتے ہیں اور غیر مسلموں کی دعائیں لیتے ہیں۔ وہ تمنائیں کرنے لگتے ہیں کہ یہ مسلمان نہ جائیں پھر ہم پر حکومت کرنے لگیں۔

پھر یہ جزیہ کوئی بڑا ٹیکس نہیں اتنا معمولی محصل ہے۔ جسے بڑی آسانی کے ساتھ ہر شخص ادا کر سکتا ہے!

اب ہم جزیہ اور اس کے متعلقات پر اسلامی کتاب الآئین کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں۔ تاکہ مسئلہ کا ہر پہلو صاف اور منقح ہو جائے۔

جزیہ کی تعریف

جزیہ اس مال کا نام ہے جو اہل ذمہ سے لیا جاتا ہے [1]

جزیہ کس سے لیا جاتا ہے

جزیہ فقط اس ذمی پر واجب ہوتا ہے کہ

۱۔ مرد بالغ ہو

۲۔ لیاقت قتال رکھتا ہو۔

۳۔ عاقل ہو

۴۔ محترف (پیشہ ور) ہو [2]

جزیہ کی مقدار

۱۔ جزیہ اگر صلح و تراضی سے مقرر کیا گیا ہے۔ تو اس کی مقدار وہی رہے گی جس پر باہم اتفاق ہوا ہے [3]

۲ اس مقدار میں زیادتی ہو سکتی ہے نہ کمی [4]

---

[1] ملاحظہ ہو نہایہ [2] سراجیہ [3] کافیہ [4] نہر الفائق

قدر معلوم

لیکن اگر مسلمانوں نے صلح و تراضی سے جزیہ مقرر نہ کیا ہو، مغلوب و مفتوح ہونے کے بعد کفار پر جزیہ عاید کیا جائے تو اس کی مقدار اور نوعیت کیا ہوگی؟ اس سوال کا جواب بھی فقہ نے بہت صاف دے دیا ہے

"اور اگر امام المسلمین کافروں پر جنگ کر کے غالب آئے۔ اور ان کو ان کی املاک پر باقی رکھ کر جو جزیہ مقرر کرے گا۔ وہ مقدار بہ قدر معلوم ہے۔

۱۔ تونگر پر ہر سال میں وزن سبعہ[1] کے ۴۸ درہم یا ماہوار ۴ درہم

۲۔ متوسط الحال سے ۲۴ درہم سالانہ یا ۲ درہم ماہوار

۳۔ فقیر معتمل (بر سرکار) سے بارہ درہم سالانہ یا ایک درہم ماہوار[2]

شناخت کیوں کر ہو؟

تونگر، متوسط الحال اور فقیر یہ الفاظ ہیں ــــــــــ ان کا اطلاق کیسے کیا جائے؟ کسے ہم تونگر سمجھیں؟ کسے متوسط الحال قرار دیں؟ کسے فقیر تصور کریں؟ اس تعیین میں اختلاف رائے تو ہو سکتا ہے؟ عین ممکن ہے اسلامی حکومت جسے تونگر گردانے وہ دعویٰ کرے میں متوسط الحال ہوں، جسے متوسط الحال مانے، وہ کہے میں فقیر ہوں؟ ــــــــــ اس سوال کا فیصلہ کیسے ہوگا؟

فقہ نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے؟

---

[1] وھو للذھب عشرون مثقالا وللفضة مئتا درھم کل عشرة منھا سبعة مثاقیل اعلم
[2] ھکذا لوزن یسمی وزن سبعة ای المثقال عشرون قیراطا والدرھم اربعة عشر قیراطا والقیراط خمس شعیرات (خلاصہ: درہم = ۷/۱۰ مثقال = ۱۴ قیراط = ۷۰ شعیر، ایک درہم = ۳ ماشہ ۱/۲ رتی = ۱/۵ ۱ رتی۔
ترجمہ: یعنی اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے: نصاب سونے کا بیس مثقال ہے اور چاندی کا دو سو درہم۔ دس درہم سات مثقال کے برابر ہے۔ اسی وزن کو اصطلاح فقہ میں "وزن سبعہ" کہتے ہیں۔ مثقال بیس قیراط (باقی ۲۸۰ صفحہ پر)

"علماء نے تونگر، متوسط الحال اور فقیر معتمل کی شناخت میں گفتگو کی ہے چنانچہ شیخ ابو جعفر نے فرمایا کہ ہر بلاد میں وہاں کا عرف معتبر ہو گا بس جس بلاد والے اپنے شہر میں جسے تونگر یا متوسط یا فقیر شمار کرتے ہوں۔ وہ ایسا ہی ہو گا اور یہی اصح ہے۔

اور اس سے بڑھ کر ماقل و دل جواب اور کیا ہو سکتا ہے؟

ایک اور معیار

امام کرخی رہ نے فرمایا ہے کہ فقیر وہ ہے جو تقریباً دو سو درہم کا مالک ہو متوسط وہ ہے جو دو سو سے زائد دس ہزار درہم تک کا مالک ہو۔ اور تونگر وہ ہے جو دس ہزار درہم سے زائد کا مالک ہو شیخ رضی اللہ عنہ یعنی قاضی حسن بن منصور کا قول ہے۔ کہ اعتماد اس باب میں کرخی رہ کے قول پر ہے [1]

بیماری کی معافی

"اگر ذمی تمام سال بیمار رہا اور اس نے کام کرنے پر قدرت نہ پائی۔ تو اگر وہ تونگر ہے۔ تو بھی اس پر جزیہ واجب نہ ہو گا۔ اسی طرح اگر نصف سال یا زیادہ بیمار رہا۔ تو بھی یہی حکم ہے [2]

غور فرمائیے یہ رعایت "تونگر" ذمی تک کو دی جا رہی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ذمی سے جو جزیہ لیا جاتا ہے۔ وہ اس کی جمع جتھا سے نہیں لیا جاتا۔ صرف اس کی کارکردگی سے وصول کیا جاتا ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی۔ کہ ایک

---

[1] فتاویٰ قاضی خان [2] الایضاح

حاشیہ بقیہ صفحہ ۲۷۹، کا ہوتا ہے اور قیراط پانچ جو کے برابر ہوتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ درہم ۷/۱۰ مثقال یعنی ۷۰ جو کا ہوتا ہے یعنی ۷۰ جو کے برابر ہمارے ملک کے حساب سے ایک درہم کا وزن ۲ ماشہ ۱½ رتی یعنی ۳ ماشہ ½ رتی کے قریب ہوتا ہے جس کی قیمت آج کل کے حساب سے تقریباً چار پانچ آنے ہوتی ہے [3] فتح القدیر جز ہدایہ اور کافی ۱۲

"تو گر ذمی اگر سال بھر یا چھ مہینے بیمار رہے تو اس پر سے جزیہ ساقط ہو جائے۔"

جزیہ سے استثنار

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں۔ اسلامی حکومت جن کے حفاظ و دفاع کی ذمہ دار ہے۔ لیکن ان سے جزیہ نہیں لیا جاتا

"ذا صحیح ہو کہ عورت، بچہ، اندھا، مفلوج، بوڑھا اور فقیر غیر معتمل (بیکار) جزیہ سے مستثنیٰ ہیں" [1]

"مجنوں اور اپاہج پر بھی جزیہ نہیں ہے" [2]

"معتوہ سے بھی جزیہ نہیں لیا جائے گا" [3]

چند اور مستثنیات

جزیہ کے سلسلہ میں مستثنیات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ چنانچہ مذکورہ لوگوں کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ جزیہ سے معذور قرار دیئے گئے ہیں۔

مملوک، مکاتب، مدبر، ام ولد پر جزیہ نہیں باندھا جائے گا نہ ان کے مولیٰ (آقا) ان کی طرف سے ادا کریں گے ——— نہ راہبوں پر جزیہ عاید کیا جائے گا [4]

غلبہ کے بعد جزیہ

فقہ اس کی بھی اجازت دیتی ہے کہ دشمن کو مغلوب کر لینے کے بعد اس سے جزیہ لے لیا جائے۔ اور اس کی تمام املاک اسے واپس کر دی جائیں۔

"اور اگر امام کسی قوم اہل حرب پر غالب آیا۔ پھر اس کو مناسب معلوم ہوا کہ ان کو ذمی بنا کر ان پر اور ان کی اراضی پر خراج باندھے۔ جیسے حضرت عمرؓ نے سواد کوفہ والوں کے ساتھ کیا تھا۔ تو یہ جائز ہے جب ایسا کیا گیا۔ تو یہ

---

[1] الہدایہ [2] اختیار شرح مختار [3] البحرالمحیط [4] الہدایہ

لوگ ذمی ہوجائیں گے اور

۱۔ کنیسہ بنانے

۲۔ بیعہ بنانے

۳۔ آتش خانہ بنانے

۴۔ بیع خمر

۵۔ اور بیع خنزیر سے منع نہ کئے جائیں گے[1]

کیا ایک مغلوب اور مفتوح دشمن کے ساتھ اس سے بڑھ کر بھی کوئی بات کی جاسکتی ہے؟

جزیہ کی تاریخ

یہ خیال بھی غلط ہے کہ جزیہ اسلام کی بدعت ہے!

"تاریخ کے اوراق کھنگالے جائیں تو معلوم ہوگا۔ کہ جزیہ بہت پرانا محصول ہے۔ فرق جو کچھ ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں نے اس بوجھ کو زیادہ سے زیادہ ہلکا کر دیا۔ اور تمام حقوق مساوات عطا کر دیئے۔ مسلمانوں سے پہلے یہ حقوق کسی قسم کے حاصل نہ تھے۔ اور یہ بوجھ جان لیوا بن گیا تھا۔

"یہ قدیم زمانہ کا ایک ٹیکس ہے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں جب ساحل ایشیائے کوچک کے باشندوں کو یونانیوں نے اپنی حمایت میں لے کر فنیقیہ والوں کے حملہ سے بچایا ہے۔ تو ان سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا جس کو حفاظت جان کے صلہ میں یہ لوگ خوشی سے ادا کیا کرتے تھے۔ اسی طرح رومانیوں نے جب گال (فرانس) کا ملک فتح کیا ہے۔ تو وہاں کے باشندوں پر ۹ گنی سے ۱۵ گنی تک سالانہ جزیہ وصول کیا تھا۔ اس کے بعد یونانیوں سے ایران میں یہ ٹیکس آیا جس کا نام گزیت تھا۔ گزیت کے لغت میں یہ معنی ہیں

---

[1] سرح وطرح ملہ تاریخ تمدن اسلام جرجی زیدان صفحہ ۱۷۹ جلد اول مطبوعہ مصر

گزیت زرے باشد کہ حکام ہر سال از رعایا گیرند و آں را خراج ہم گویند و زرے را نیز گویند کہ از ذمّی می ستانند"

گزیت کی سند میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گہش خاقاں خراج چیں فرستہ
گہش قیصر گزیت دیں فرستہ

(نظامی گنجوی)

گزیت رز باد و شش درم
بخرماستان بر ہمیں رہ و رسم

(فردوسی)

فردوسی کہتا ہے کہ ساسانی عہد میں انگور کی ٹٹیوں اور کھجوروں پر چھ درہم کے حساب سے لگان (گزیت) لیا جاتا تھا۔

جب مسلمانوں نے ایران فتح کر لیا، تو غیر مسلم رعایا پر حفاظت جان و مال کے معاوضہ میں جزیہ مقرر کیا گیا، اور جزیہ دینے والے فوجی خدمات سے معاف کر دیئے گئے۔ عہد عباسیہ میں جزیہ کی شرح یہ تھی۔

۱۔ دولتمند	۴۸ درہم (بارہ روپے)	سالانہ
۲۔ متوسط	۲۴ درہم (چھ روپے)	"
۳۔ غریب	۱۲ درہم (تین روپے)	"

بیس سال سے کم عمر والے اور پچاس سال سے زائد عمر والے بوڑھے مرد، عورت، مجنوں، مفلوج، اندھے، مفلس، راہب (عیسائی درویش) اور فوجی ملازم جزیہ سے بری تھے اور حکام کی رپورٹوں پر کمی بھی ہو جاتی تھی اور کبھی بجائے فی کس ٹیکس چوکیداری کی طرح فی گھر جزیہ وصول ہوتا تھا اور یہ

ٹیکس بذریعہ اقساط وصول کیا جاتا تھا اور نقدی کے عوض کبھی جزیہ میں دوسری جنس بھی قبول کی جاتی تھی۔ چنانچہ نجران کے عیسائی بجائے نقدی کے حلّے (ایک قسم کا لباس[1]) دیا کرتے تھے۔"

بہرحال جزیہ کوئی مذہبی ٹیکس نہ تھا۔ بلکہ حفاظت جان و مال کا ایک معمولی معاوضہ تھا۔ اور لفظ جزیہ عربی نہیں ہے۔ بلکہ گزیت سے معرّب ہوا ہے۔

رجزیہ کے مفصل حالات کے لئے قبادو نوشیروان کا قانون دیکھنا چاہیئے[2] یہ رقم خراج سے جداگانہ تھی۔

---

[1] حضارۃ الاسلام صفحہ ۱۲۸ و مقدمہ ابن خلدون و بلاذری۔

[2] الفظم الکلام۔

چند اور مسائل

جہاد، جزیہ، مستامن، حربی، ذمّی

گذشتہ صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں۔ کہ فقہ اسلامی غیر مسلموں کے ساتھ کیسے روادارانہ قوانین پر مشتمل ہے۔

ذیل میں ہم چند اور مسائل بیان کرتے ہیں۔ یہ مسائل اگرچہ ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر بنظر تفحص و استیعاب ان کا مطالعہ کیا جائے۔ تو ان سے بھی یہ بات واضح ہو جائے گی۔ کہ نہ صرف کلیات میں بلکہ جزئیات میں بھی غیر مسلموں کے جذبات کا کس درجہ پاس ولحاظ رکھا گیا ہے ——— حالانکہ قانون بڑی خشک اور سنگدل چیز ہے۔ اسے رحم و رعایت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ لیکن فقہ اسلامی کے قوانین چونکہ تعلیمات اسلامی پر مبنی ہیں۔ اس لئے یہ اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہیں ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر ؛ خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

دعوت اور جہاد

جہاد کے متعلق فقہ نے یہ بات اور زیادہ صراحت کے ساتھ بیان کردی ہے کہ جب تک اسلام کی دعوت نہ دی جائے۔ دشمن سے لڑائی روا نہیں۔

"جن لوگوں کو دعوت اسلام نہیں پہنچی ہے۔ انہیں پہلے دعوت اسلام دی جائے۔ بغیر دعوت ان سے لڑنا جائز نہیں" [1]

پاس عہد

کفار و مشرکین سے جو عہد کیا جائے۔ اس کی پابندی بہر حال لازمی ہے:

"عہد توڑنا مثلاً یہ معاہدہ کیا۔ کہ اتنے دنوں تک جنگ نہیں ہوگی پھر اسی زمانہ عہد میں جنگ شروع کردی تو یہ ناجائز ہے" [2]

مقتول دشمن سے سلوک

یہ عام رواج تھا۔ کہ دشمن کو قتل کرنے کے بعد اس کا مثلہ کرتے تھے یعنی اس کے ہاتھ پاؤں ناک وغیرہ کاٹ کر اسے بہت زیادہ بدہیئت بنا دیتے تھے لیکن اسلام میں یہ جائز نہیں۔

"مثلہ یعنی ہاتھ، پاؤں یا ناک، کان کاٹنا یا منہ کالا کردینا جائز نہیں۔" [3]

ذمی اور ادنیٰ مسلمان کی امان

دشمن کو امان دینے کے لئے اسلام نے اور اس کے قانون نے تقریباً کوئی شرط نہیں رکھی ہے۔ یہ وہ حق ہے جو سب کو حاصل ہے:

"مسلمان آزاد مرد یا عورت نے کافروں میں سے کسی ایک مرد کو یا کسی کافر جماعت کو یا پورے شہر کفار کو امان دے دی۔ تو یہ امان صحیح ہے نافذ ہوجائے گی۔ اب کسی کافر کا قتل جائز نہیں۔ اگرچہ امان دینے والا فاسق ہو

[1] در مختار [2] مجمع الانہر [3] فتح القدیر ۱۲

یا اندھا ہو یا بہت بوڑھا ہو۔ امان صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ کفار نے لفظ امان سن لیا ہو، اگرچہ وہ کسی زبان میں ہو۔ اگرچہ اس لفظ کے معنے وہ نہ سمجھتے ہوں[1]

آنے والی نسلوں پر ذمہ داری

اسلام غیر مسلموں کے ساتھ وقتی معاہدہ نہیں کرتا۔ دائمی پیمان باندھتا ہے۔ مفتوح و مغلوب کافروں سے جن شرائط پر صلح کی جائے۔ وہ صرف ایک دور کے لئے نہیں ہوتے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوتے ہیں۔

اگر کسی شہر کو بطور صلح مسلمانوں نے، فتح کیا، تو جن شرائط پر صلح ہوئی وہ تمام رہیں گے۔ ان شرائط کی خلاف ورزی کرنے کی نہ صلح کرنے والوں کو اجازت ہے نہ بعد میں آنے والی نسلوں کو اور وہاں کی زمین انہی لوگوں کی ملک رہے گی[2]

کیا اس سے زیادہ احترام ایک غیر مذہب کا ممکن ہے؟

مسلمان اور دار الحرب

دار الحرب میں کوئی مسلمان امان لے کر گیا تو وہاں والوں کی جان سے تعرض کرنا اس پر حرام ہے۔ کیونکہ امان کا پورا کرنا واجب ہے۔ اسی طرح کافروں کی عورتیں بھی اس پر حرام ہیں[3]

قاضی کی بے بسی

مسلمان دار الحرب میں امان لے کر گیا۔ اس نے وہاں کسی حربی کو قرض دیا یا کوئی چیز اس کے ہاتھ اُدھار بیچی۔ یا حربی نے مسلمان کو قرض دیا یا اس کے ہاتھ کوئی چیز اُدھار بیچی۔ یا ایک نے دوسرے کی کوئی چیز غصب کی۔ پھر یہ

---

[1] در مختار [2] در مختار [3] جوہرہ۔ در مختار

دونوں دارالاسلام میں آئے۔ تو قاضی شہر کوئی فیصلہ نہ کرے گا۔ ہاں اب یہاں آنے کے بعد اگر اس قسم کی بات ہوگی۔ تو فیصلہ کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر دو حربی امان لے کر دارالاسلام میں آئے اور دارالحرب میں ان کے درمیان اس قسم کا کوئی معاملہ تھا۔ تو ان کا فیصلہ نہ کیا جائے گا۔[1]

ذمّی عورت اور حربی مرد

کتابیہ عورت امان لے کر دارالاسلام میں آئی۔ اور اس سے کسی مسلمان یا ذمّی نے نکاح کر لیا۔ تو یہ عورت ذمیہ ہوگئی۔ اب دارالحرب نہیں جا سکتی۔ اسی طرح اگر میاں بیوی دونوں آئے اور شوہر مسلمان ہوگیا۔ تو عورت نہیں جا سکتی۔ اور اگر حربی مرد نے کسی ذمّی عورت سے نکاح کیا۔ تو اس عورت کی وجہ سے وہ ذمّی تصور نہیں کیا جائے گا۔ وہ طلاق دے کر جا سکتا ہے۔[2]

مالدار اپاہج

جزیہ اپاہج اور معذور سے نہیں لیا جاتا۔ لیکن اگر وہ دولت مند ہو تو بھی نہیں لیا جا سکتا۔

بچہ، عورت، غلام، پاگل، بہرا، لنجا، اپاہج، فالج زدہ، بیمار، بوڑھا، عاجز، اندھا، فقیر (ناکارہ)، پجاری، راہب ان میں سے کسی سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ اگرچہ یہ بیمار اور اپاہج وغیرہ مالدار کیوں نہ ہوں۔[3]

ایک اور رعایت

"ذمّی جو کچھ کماتا ہے۔ وہ سب اس کی ضروریات میں صرف ہو جاتا ہے۔ کچھ بچتا نہیں۔ تو اس پر سے جزیہ ساقط ہو جائے گا۔"[4]

---

[1] در مختار [2] در مختار [3] در مختار [4] فتاویٰ عالمگیری

ذمّی اگر مرجائے

کوئی ذمّی اثنائے سال میں یا سال تمام کے بعد مسلمان ہوگیا۔ تو اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ اگرچہ کئی سال کا اس کے ذمہ باقی ہو۔ اسی طرح اگر کوئی ذمّی مرجائے یا اندھا ہوجائے یا اپاہج ہوجائے یا فقیر ہوجائے یا کام پر قادر نہ رہے تو اس کا جزیہ بھی ساقط ہوجائے گا۔[1]

جزیہ کا اصل اصول

جزیہ کے بارے میں اصل اصول یہ ہے:

"ان اللّٰہ اوجب الجزیۃ علی من ھو اھل القتال فلا تجب علی من لیس من اھل القتال۔ یعنی اللہ نے اہل قتال پر جزیہ واجب کیا ہے۔ جو لوگ قتال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان پر نہیں واجب ہوگا۔[2]

ذمّی اگر رسولؐ کو گالی دے

ایک مسلمان کے لیے رسول اللہؐ سے زیادہ محبوب ہستی کس کی ہوسکتی ہے۔ نبی کی حرمت پر کٹ مرنا ہر مسلمان کا خوشگوار ترین فریضہ ہے۔ مسلمان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے لیکن نبی کی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔

لیکن اگر کوئی کافر ذمّی بن چکا ہے۔ اسلام کی پناہ میں آچکا ہے۔ تو اب اگر وہ نعوذ باللہ سب نبی کرے یعنی رسالتمآبؐ کو گالی دے تو بھی اس کا ذمہ قائم رہے گا۔ اس کے حقوق قائم رہیں گے۔ اسے باغی تصور نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ ہماری طرح رسول کے احترام پر مجبور نہیں ہے۔

ذمّی جزیہ دینے کا سلسلہ بند کردے۔ مسلمان کو قتل کر ڈالے۔ آنحضرت کی شان میں گستاخی کرے۔ کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کرے۔ ان

---

[1] ... [2] بدائع الصنائع

میں سے کوئی فعل بھی ذمہ کو ختم نہیں کر سکتا، اسے قوانین مروّجہ کے ماتحت سزا ان جرائم کی ملے گی، لیکن عقد ذمہ قائم رہے گا۔ سوا اس کے کہ وہ علانیہ بغاوت کا مرتکب ہو یا فتنہ و فساد کا جرم اس سے سرزد ہو[1]

ذمی کا فدیہ بیت المال سے

اگر کوئی ذمی اپنے کسی دشمن کے پنجہ میں پھنس جاتا ہے اور قابض دشمن اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ جب تک فدیہ نہیں ملے گا اسے رہا نہیں کرے گا؟ ——— ایسی صورت میں اسلام کا بیت المال فدیہ کی رقم ادا کرے گا۔ اور اس غیر مسلم کو دشمن کے پنجہ سے نکال کر اپنے زیر سایہ زندگی بسر کرنے کا موقعہ فراہم کرے گا:

"اگر کوئی ذمی دشمن کے قبضہ میں آجائے اور اس کی رہائی فدیہ پر منحصر ہو تو اس کا فدیہ مسلمانوں کے بیت المال سے ادا کیا جائیگا[2]

یہ ہے "قرون بیطئی کا اسلام"! ——— کاش دنیا کے محکوم و مغلوب مسلمانوں کو وہی حقوق اسلام کے معترضین دے دیتے جو اسلام نے غیر مسلموں کو دیئے ہیں۔

---

[1] بدائع و الصنائع [2] کتاب الاموال ابو عبید

اعتراض و جواب

افسانہ اور حقیقت کا تصادم

گذشتہ صفحات میں ہم بسط و تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں، کہ فقہ اسلامی نے ذمیوں اور غیر مسلموں کو اسلامی حکومت اور اسلامی غلبہ کی صورت میں کتنے اور کیسے مساویانہ حقوق دیئے ہیں۔ یہ وہ حقوق ہیں، جو موجودہ دور جمہوریت میں کوئی حکومت اپنے سیاسی مخالفین اور مشتبہین تک کو نہیں دیتی۔ امریکہ میں میکارتھی نے تطہیر کی جو مہم شروع کر رکھی تھی، اس کی زد سے سابق صدر ٹرومین تک نہ بچ سکے۔ مصر میں جنرل نجیب اور کرنل ناصر نے نحاس پاشا کے ساتھ جو کچھ کیا، اور ایران میں ڈاکٹر مصدق کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کل کا نہیں آج کا واقعہ ہے۔ اسی طرح روس میں اسٹالن کے بعد (NEXT TO STALIN) سب سے بڑے آدمی بیریا کو معزول کر کے حکومت کے حکم سے جس طرح گولی مار کر ہلاک کیا گیا، ہندوستان میں شیخ عبداللہ کی گرفتاری جس جرم کے تحت عمل میں آئی۔ ان واقعات کو سامنے رکھ کر ذمیوں اور غیر مسلموں کے

حقوق پر ایک نظر ڈالئے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

اب ہم ان اعتراضات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو فقہ اسلامی پر روا رکھے جاتے ہیں جن کی رو سے فقہ اسلامی پر الزام لگایا جاتا ہے۔ کہ وہ ذمیوں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ روا رکھتی ہے۔ وہ ذمیوں سے ٹیکس لیتے وقت انہیں "ذلیل" کرنے کے لئے محصّل کو ہدایت کرتی ہے۔ کہ وہ اس کا گلا پکڑ کر جھنجوڑے اور اسے "عدو اللہ" کہہ کر جزیہ کا مطالبہ کرے۔ مرتد کے لئے سزائے موت تجویز کرتی ہے۔ ذمیوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنا لباس تک مسلمانوں کا سا نہ رکھیں۔

یہ ہیں وہ اعتراضات جو فقہ پر وارد کئے جاتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں فقہ کی بعض کتابوں میں یہ باتیں موجود ہیں لیکن یہ متاخرین فقہا کی اُپج ہے۔ اور وہ اس کی بنا قرآنی لفظ "صاغرون" پر قائم کرتے ہیں لیکن اول تو صاغرون کا وہ مطلب نہیں۔ جو ان متاخرین فقہا نے لیا ہے۔ دوسرے اجل فقہا نے نہ صرف ان باتوں کو تسلیم نہیں کیا بلکہ انہیں قابل اعتراض قرار دیا ہے۔ تیسرے یہ صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں، عملی طور پر یہ کبھی نافذ نہیں ہوئے۔ اور اس کا اعتراف غیر مسلم مورخین تک نے کیا ہے جس کا ذکر آگے چل کر ہم کریں گے۔

مسئلۂ ارتداد

مسئلۂ ارتداد کے بارے میں قرآن و حدیث کا مسلک ہم اچھی طرح صفحات ماسبق میں پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم فقہ کو لیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فقہ مرتد کی سزا قتل تجویز کرتی ہے لیکن اول تو اس کی عائد کردہ پابندیوں کی بنا پر اس کا نفاذ تقریباً ناممکن ہے

"مسلمانوں کا فقہی قانون جرم ارتداد کی سزا معیّن کرنے میں بہت نرم ہے۔ "مؤید الابصار" کا مصنف لکھتا ہے کہ

"کسی مسلمان کے ارتداد پر اس وقت تک فتویٰ نہیں دیا جائے گا

جب تک کہ اس کے الفاظ کا کوئی عمدہ محل پیدا ہو سکتا ہو۔ یا جبکہ اس کے کفر میں اختلاف رائے ہو۔ اگرچہ کہ اس اختلاف کی بنیاد غیر صحیح احادیث ہی پر کیوں نہ ہو۔[1]

دوسرے جیسا کہ اس سے پیشتر ہم کہیں عرض کر چکے ہیں۔ فقہ کے سامنے ارتداد ہمیشہ بغاوت کے روپ میں آیا۔ اور باغی کی سزا قتل کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتی۔ اس طرح فقہ کے نزدیک ارتداد اور بغاوت ہم معنیٰ الفاظ بن گئے!

ناقابل تردید دلیل

ممکن ہے ہمارے اس قول کو قول بلا دلیل کہا جائے لیکن ہمارے پاس اس دعوے کی تائید میں ایسا محکم ثبوت موجود ہے جس کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی تاویل بھی نہیں کی جا سکتی۔

فقہ نے مرتد مرد کے قتل کا فتویٰ دیا ہے۔ لیکن مرتد عورت کو قتل سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ اس لئے کہ اس میں عورت ہونے کی وجہ سے یہ صلاحیت نہیں کہ وہ بادشاہ یا حکومت کے خلاف صف آرا ہو، برسر جنگ ہو۔ اور ہتھیار لے کر اس کے مقابلے کو نکلے۔ وہ صرف مرتد ہے باغی نہیں۔ لہٰذا اس کا قتل بھی جائز نہیں[2] —————— کیا اس برہان قاطع کے بعد ہمیں کسی اور دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت ہے؟

قرآنی آیت اور اس کا مطلب

صاغرون کا لفظ قرآن میں سورۂ توبہ کے اندر آیا ہے۔

حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید و ھم صاغرون۔ اس کا ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کیا ہے:

"یہاں تک کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں؟"

---

[1] ردالمختار کتاب الجہاد باب المرتد صفحہ ۲۹۴ مطبوعہ مصر [2] ہدایہ جلد دوم

مولانا اشرف علی رح اپنے عہد کے "حکیم امت" مانے جاتے تھے۔ انہوں نے "ذلیل ہوکر" ترجمہ نہیں کیا۔ "ماتحت اور رعیت بن کر" کیا اور یہی صحیح ہے!

دوسرے ائمہ کی رائے

امام شافعی رح کی جلالت شان سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ان پر امام ابوحنیفہ رح کی طرح "صاحب الرائے" ہونے کا الزام بھی نہیں ہے۔ وہ خالص عرب تھے، ہاشمی تھے خاندان رسول ؐ کے ایک فرد تھے۔ ان کی فقہ تمام تر حدیث ہی ہے۔ انہوں نے بھی صغار کی یہ تفسیر[1] تسلیم کی ہے کہ ذمیوں کا مسلم مملکت کا قانون تسلیم کر لینا اور ٹیکس دینا بجائے خود اہانت[2] ہے۔ اس لئے کہ جب وہ لڑنے اور مخالفت کرنے کے بجائے اطاعت پر رضامند ہوئے تو گویا خود انہوں نے اپنے لئے ماتحتی کی زندگی پسند کر لی۔ اس کے بعد عمال حکومت کی طرف سے ذلت چپکانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حافظ ابن قیم (متوفی ۷۵۱ھ) کی بھی یہی رائے ہے۔ کہ ذمیوں کو ذلیل کرنے اور ان سے اہانت آمیز لب ولہجہ میں تخاطب کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ وہ اسے مانتے ہیں کہ نہ آیت سے یہ مطلب نکلتا ہے۔ نہ رسالتمآب ؐ اور خلفائے راشدین رض سے ایسی کوئی روایت پہنچی ہے۔ امام شافعی رح نے کتاب الام میں جو فقہ شافعی کی مستند ترین کتاب ہے۔ فرمایا ہے ——— صغار یا عیسائیوں کی ذلت صرف یہ ہے کہ "قانون مملکت کی پیروی کریں ——— "[3]

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ یہ آیت ذمیوں کے بارے میں ہے بھی نہیں۔ اس کی شان نزول ان عیسائیوں سے متعلق ہے۔ جو شامی سرحد پر مجتمع ہو کر فتح مکہ کا خواب دیکھ رہے تھے۔

مشہور حنفی المذہب مصنف جو اس صدی میں شام، مصر و ترکی

---

[1] فتح البیان حصہ اول، نواب صدیق حسن خاں۔ [2] کتاب الام (الشافعی) [3] کتاب الام (شافعی)

مذاہب کا مشہور فقیہ گذرا ہے۔ اور جس کا نام ابن عابد بن محمد امین ہے۔ اور جس نے درالمختار کی شرح لکھی ہے۔ وہ اپنی کتاب ردالمختار میں لکھتا ہے کہ:

مصنف ہدایہ نے جہاں اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ از روئے حدیث ٹیکس وصول کرنے والوں کو چاہیئے۔ کہ اس کا گلا پکڑ کے جھنجوڑے اور کہے "اے ذمی! محصول ادا کر!" تو صاحب ہدایہ کو اس حدیث پر یقین نہیں ہے۔ اور وہ اس پر اعتماد نہیں کرتے لہ

علاوہ ازیں:

"امام نووی نے جو ساتویں صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ خاص کر اس قانون کو بہت برا بھلا کہا ہے۔ وہ اپنی کتاب منہاج میں بیان مذکور کو نقل کرنے کے بعد یہ رائے دیتے ہیں۔

"یہ حالت اب بالکل کالعدم ہے۔ اور اسے مستحب خیال کرنا خطائے شدید ہے"

امام شہاب الدین احمد ابن حجر ہیثمی کی جنہوں نے ۹۷۴ھ میں وفات پائی۔ اپنی شرح کتاب مذکور میں یہ فرماتے ہیں:

"یہ حالت اب بالکل کالعدم ہے۔ کیونکہ سنت میں اس کی کوئی بنیاد یا سند نہیں ہے اور نہ خلفائے راشدین نے کبھی ایسا عمل کیا ہے۔ اور اسی بنا پر "ام" میں صاف لکھا ہے کہ ٹیکس بڑے اخلاق کے ساتھ وصول کیا ہے ان کی اہانت صرف اس قدر ہے کہ انہیں قانون کی اتباع کرنی پڑتی ہے لیکن ان کے ساتھ نہ کسی قسم کا برا سلوک کیا جاتا ہے اور نہ مار پیٹ کی جاتی ہے

لہ ردالمختار جلد ۳ صفحہ ۲۷۴

ہے چونکہ یہ بلا وجہ بدسلوکی ہے۔ لہذا ایسا کرنا بالکل ناجائز ہے۔"

کتاب الام جس کا حوالہ پیشتر دیا گیا ہے۔ امام شافعی کی تالیف ہے۔ جو مذاہب فقہ کے چار ائمہ میں سے ہیں۔ وہ ہجری کی دوسری صدی میں تھے (سن پیدائش ۱۵۰۔ اور سن وفات ۲۰۴ ہجری)

فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کے انگریزی ترجمہ میں بھی یہی بات موجود ہے:

"جن لوگوں سے جزیہ طلب کیا جاتا ہے۔ اگر وہ اس کے دینے پر راضی ہوں تو اسی حفاظت اور حقوق کے مستحق ہیں۔ جو مسلمانوں کو حاصل ہیں کیونکہ حضرت علی رض نے فرمایا ہے کہ: "جزیہ دیتے ہیں: تاکہ ان کا خون مسلمانوں کے خون کے مانند اور ان کا مال مسلمانوں کے مال کے مثل ہو جائے"[1]

اسی طرح جامع صغیر میں بھی یہ بات موجود ہے:

جامع صغیر میں لکھا ہے کہ اگر کسی ذمی سے سال کے گذر جانے تک جزیہ وصول نہیں کیا گیا۔ اور دوسرا سال آ پہنچا۔ تو پچھلے سال کا ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ یہ امام ابو حنیفہ رح کی رائے ہے[2]

ذمی کی توکیل

نکاح کا مسئلہ کتنا اہم ہوتا ہے۔ شرعی، اخلاقی، قانونی، عرفی ہر اعتبار سے اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ نکاح کے معاملہ میں ہم کسی ذمی کو اپنا وکیل بنا سکتے ہیں یا نہیں۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہیں۔ آخر ایک غیر مسلم کو کسی مسلمان کے نکاح سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ کیوں نہ ایسے موقع پر کسی مسلمان ہی کو وکالت سپرد کی جائے۔ ٹھیک ہے ہر شخص اپنی صواب دید پر ایسا کر سکتا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان

---

[1] ہدایہ مترجمہ چارلس ہملٹن جلد دوم صفحہ ۴۴۱ مطبوعہ لندن ۱۷۹۱ء۔

[2] ہدایہ، جلد ۲ صفحہ ۲۱۰ ترجمہ انگریزی سر چارلس ہملٹن۔

کسی غیر مسلم (ذمی) کو اپنے نکاح کے سلسلہ میں وکیل بنانا چاہے۔ تو شرع اسے نہیں روک سکتی۔ وہ ایسا کر سکتا ہے اور ذمی کی توکیل جائز ہوگی۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔[1]

ذمّی کی دل شکنی

فقہ کی بعض معتبر اور مستند کتابوں میں صاف طور پر مرقوم ہے کہ ذمیوں سے ایسے الفاظ میں تخاطب نہ کیا جائے۔ جس سے ان کا دل دکھے۔ یا وہ اپنی توھین محسوس کریں۔

"اسلامی فقہ میں کسی ذمی کو یا کافر" اور "یا عدو اللہ" کے الفاظ سے مخاطب کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اور ایسے شخص کے لئے سزا مقرر کی گئی ہے۔ جو غیر مسلم رعایا کی تکلیف دہی یا دل آزاری کے لئے ایسے غیر مہذب الفاظ سے ان کو مخاطب کرے۔ درّ المختار کا مصنف "قنیہ" (تصنیف نجم الدین زاہدی متوفی ۶۵۸ھ) سے نقل کرتا ہے۔ کہ ایک ذمّی کو لفظ "یا کافر" سے خطاب نہ کرنا چاہیئے۔ اور جو شخص اس لفظ سے مخاطب کر کے اس کا دل دکھاتا ہے۔ وہ گنہگار ہوتا ہے۔

مصنف "ردالمختار شرح درالمختار" اس فقرے کی شرح میں "کہ جو شخص اس لفظ سے مخاطب کر کے اس کا دل دکھاتا ہے وہ گنہگار ہوتا ہے۔" لکھتا ہے کہ اس لفظ کے استعمال کرنے والے کے لئے قانونی سزا مقرر کی گئی ہے۔

مصنف "بحر" کی بھی یہی رائے ہے۔ مصنف "درالمختار" نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ لیکن صرف "نحر" کا مصنف اس

---

[1] مختصر الفتاویٰ المصریہ لابن تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ۴۲۹۔

پر معترض ہے [1]

کیا ان واضح تر تشریحات کے بعد بھی یہ کہا جاسکتا ہے؟ کہ فقہ اسلامی ذمیوں کی توہین و تذلیل روا رکھتی ہے؟ انہیں مساویانہ حقوق نہیں دیتی؟ ان کے ساتھ متعصبانہ سلوک کرتی ہے؟

---

[1] رد المختار جلد ۳ صفحہ ۲۷۲ مطبوعہ مصر بحوالہ اعظم الکلام

اعترافات

مسلمانوں کے حسن سلوک کا اعتراف غیر مسلموں کی زبان سے

ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ قانون اسلامی اور شرع اسلامی نے ذمیوں اور غیر مسلموں کو کیسے مساویانہ حقوق عطا کئے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا۔ کہ معترضین کی طرف سے اس سلسلہ میں بعض فقہی مسائل پر جو اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں۔ وہ بھی کتنے کمزور اور بودے ہیں۔ اب ہم یہ دیکھیں گے۔ کہ خود حقیقت شناس غیر مسلم مورخین نے کتنے فاش اور برملا انداز میں مسلمانوں کی عالی ظرفی اور وسعت قلب کا اعتراف کیا ہے، کتنی صفائی اور صداقت کے ساتھ مانا ہے۔ کہ اسلام اور شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غیر مسلموں اور مسلمانوں میں عملی طور پر کسی قسم کا فرق و امتیاز روا نہیں رکھا ہے۔ تسلیم کیا ہے کہ مسلم ملوک و سلاطین نے اپنے مفتوح غیر مسلموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ملاطفت اور حسن سلوک کا مظاہرہ کیا۔

مورخ کا اعتراف

مسٹر ہنری کوپی نے اپنی تاریخ "فتح ہسپانیہ" میں اس برتاؤ کے متعلق جو مسلمان، یہودی اور عیسائیوں سے کرتے تھے۔ یہ تحریر کیا ہے:

"میں اس سے قبل اس برتاؤ کے متعلق جو یہودی اور عیسائیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ اندروئے قیاس اگر دیکھا جائے تو یہ مسئلہ کچھ دشوار نہ تھا۔ لیکن عملاً بوجہ تعصب وعناد مذہبی اس میں بڑی بڑی دشواریاں تھیں۔ باوجود اس کے کہ مسلمان اپنے مذہب کی پابندی میں بہت سخت ہیں۔ اور دیگر مذاہب کو ناقص اور باطل سمجھتے ہیں تو بھی اس برتاؤ کے مقابلہ میں جو عیسائی فرقے آخر زمانہ میں ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ اور نیز اس برتاؤ کے مقابلہ میں جو عیسائیوں نے ہر زمانہ میں یہودیوں کے ساتھ روا رکھا ہے مسلمانوں کا برتاؤ تمام اہل مذاہب سے نہایت مسامحت اور مسالمت کا تھا۔ یہی تو بڑی قوی وجہ تھی کہ مفتوحہ اقوام ان کی اطاعت، سہولت اور آسانی کے ساتھ برداشت کر لیتی تھیں۔ البتہ مرتدوں کو سزائے موت دی جاتی تھی[1]۔ جو لوگ مطلوبہ خراج ادا کرتے تھے وہ اپنے مذہب میں آزاد تھے۔ یہ مذہبی آزادی یا مسالمت پیغمبر کا ایک فیاضانہ خیال اور نیز سیاسی ضابطہ تھا۔ یوں دیکھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیاساً ان کے مذہب کی اصل اس بات کی

---

[1] مرتد کے بارے میں گذشتہ صفحات میں ہم تفصیل سے بحث و گفتگو کر چکے ہیں اور ثابت کر چکے ہیں کہ اسلام میں قتل کئے جاتے ہیں بے شک مگر وہ باغی اور طاغی نہ جو ہنری کوپی صاحب اس بارے میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جو اہل مذہب مسلسل پیدا کرتے چلے آئے ہیں ۱۲ اصغری۔

اجازت دیتی کہ تمام کفار کو غارت[1] کر دیا جائے[2]

ایک اور اعتراف

ایک اور فرنگی مؤرخ صاف اور دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہے

"ان برائیوں سے اگر قطع نظر کر کے دیکھا جائے، جو ایک ایسی فوج کشی کے ساتھ ضرور پیدا ہو جاتی ہیں۔ تو بھی فاتحوں کی پالیسی فیاضانہ تھی۔۔ جن عیسائیوں نے ملک مفتوحہ میں رہنا پسند کیا۔ ان کے جان و مال کی پوری پوری حفاظت کی گئی۔ انہیں پورا حق حاصل تھا۔ کہ اپنے طور پر اپنی عبادت کریں۔ معینہ حدود میں انہیں کے قانون رائج تھے۔ بعض ملکی اور فوجی عہدوں پر ان کا تقرر کیا گیا۔ ان کی عورتوں کو اجازت تھی، کہ وہ فاتحوں کے ساتھ شادی بیاہ کریں۔ غرض از روئے قانون ان کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا جس سے وہ مفتوح یا غلام معلوم ہوں۔ یہ سچ ہے کہ بعض اوقات عیسائی ظلم و ستم کے یا عام شورش کے شکار ہو جاتے تھے[3]

---

[1] ہنری کوپی صاحب کا یہ خیال بھی غلط ہے جس مذہب کی اصل تمام کفار کو غارت کر دینے کی اجازت دیتی ہو وہ رواداری کیسے ہو سکتا ہے اور رواداری بھی ایسا کہ جس جگہ گیا ہو وہاں رواداری کا ریکارڈ قائم کر دیا ہو جس کا اعتراف خود ہنری صاحب بھی فرما رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے اور گزشتہ صفحات میں ہم اس پر بھی گفتگو کر چکے ہیں کہ جن کافروں کو غارت کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہ وہی ہیں جو خود بھی مسلمانوں کو غارت کرنے پر تل گئے ہوں اور کسی طرح صلح و سلام کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ نہ ہوں [2] تاریخ فتح ہسپانیہ اہل عرب مع کارنامہ تمدن

[2] انہوں نے یورپ کو بخشی مصنفہ ہنری کوپی ج ۲ صفحہ ۲۲۷ مطبوعہ لندن ۱۸۸۱ء [3] "بعض اوقات جس طرح عیسائی ظلم و ستم یا عام شورش کا شکار ہو جاتے تھے"۔ اسی طرح خود مسلمانوں کے عہد حکومت (باقی صفحہ ۳۰۴ پر)

بنایا۔ نہ شرمناک ظلم وستم اور جبر وتعدی کی۔ اس کا دامن اس دھبہ سے پاک رہا ہے۔ ترکی نے کبھی ظالمانہ طور سے ان لوگوں کو جو اس کے مذہب سے اختلاف رکھتے تھے جلاوطن نہیں کیا۔ ان غریب بے خانماں یہودیوں کو جنہیں جرمنی، انگلینڈ، فرانس، اسپین نے پے درپے طرح طرح کی ایذائیں اور تکلیفیں پہنچائیں۔ ترکی ہی نے پناہ دی"۔

عیسائی اور مسلمان

عیسائیوں اور مسلمانوں کے باہمی سلوک کے بارے میں یہ وقیع شہادت ایک ایسی دستاویز ہے۔ جو ہمیشہ یادگار رہے گی۔

"میں بلا تامل اس امر کا اظہار کرتا ہوں۔ کہ ترکی افسر دولت عثمانیہ کے اس حصہ میں عیسائیوں اور یہودیوں سے نہایت درجہ مصالحت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اور میں نے کبھی کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں سنا جس میں انہوں نے ان سے برا برتاؤ کیا ہو یا لڑے جھگڑے ہوں۔ در حقیقت جہاں تک میرا تجربہ ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان عیسائیوں کے معاملہ میں بہت متحمل ہیں۔ حالانکہ عیسائیوں کا معاملہ مسلمانوں سے ایسا نہیں ہے، عیسائیوں کو وہی حقوق اور رعایتیں حاصل ہیں۔ جو ان کے مسلمان بھائیوں کو، اور اگرچہ انصاف بہت مستعدی کے ساتھ نہیں کیا جاتا لیکن بے رو رعایت کیا جاتا ہے"[1]

ایک اور شہادت

ذیل میں ہم ایک اور شہادت پیش کرتے ہیں۔ یہ پہلی سے زیادہ وقیع اور یادگار

---

(1) The Armyman Compaign, by Charles William, preaces p.10

یثیت کی حامل ہے۔

کپتان سن کلیر اور چارلس بروفی مصنفین TWELVE YEARS STUDY OF THE EASTERN QUESTION

(دوازدہ سالہ مطالعہ مسئلہ شرق میں) لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر ترک عیسائی رعایا سے نفرت کرتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ وہ عیسائی ہیں۔ کیونکہ اگر وہ کسی مذہب کو اپنے مذہب کے بعد بہتر سمجھتے ہیں تو وہ عیسائی مذہب ہے۔ بلکہ یہ نفرت ان کے خصائل و اخلاق کی وجہ سے ہے۔ ایک حساس طبیعت کا شخص ایک سال کلیسائے یونانی کے مقتداؤں کے ساتھ رہنے کے بعد انکار نہ کر سکے گا۔ کہ تمام امور میں یہاں تک کہ مذہب میں بھی مشرقی کلیسا پیروانِ اسلام سے بدرجہا کمتر ہے"[1]

کیا یہ اعترافات کافی نہیں؟

کیا ان اعترافات کے بعد بھی مسلمانوں پر لگائے ہوئے ان الزامات کی فہرست بدستور طویل رہے گی؟

کیا اب بھی حق کے ماننے سے انکار اور کذب کی تبلیغ پر اصرار ہوتا رہے گا؟

---

(۱) مسئلہ مشرق کا دوازدہ سالہ مطالعہ

رواداری کے باعث خلفائے بنو فاطمہ پر کفر کا فتوے

بعض علمائے کرام کا خیال ہے کہ جو سرزمین صلح سے نہیں بلکہ دست درازی کی قوت سے فتح کی جائے اور کسی معاہدہ اور میثاق کے بغیر فاتحانہ طور پر مسلمان اس ملک میں داخل ہوں، تو انہیں حق ہے کہ کنیسے اور غیر مسلموں کے عبادت خانے ڈھادیں یا کم از کم نئے نہ بنانے دیں۔ لیکن مصر پر جب بنو فاطمہ کی حکومت تھی تو انہوں نے اس قول پر عمل نہیں کیا بلکہ غیر مسلموں کو عبادت خانے بنانے کی اجازت دی۔ انہیں اعلیٰ مناصب پر سرفراز کیا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ فیاضانہ، فراخدلانہ اور روادارانہ برتاؤ کیا؟ یہی سلوک علامہ ابن تیمیہ وغیرہ کو اتنا حد سے بڑھا ہوا نظر آیا کہ انہوں نے مولوی محمد علی خاں صاحب کی طرح فتوائے کفر تک دے دیا۔ چنانچہ قاہرہ کا ذکر کرتے ہوئے جو عنوۃً (یعنی بزور قوت) فتح ہوا تھا۔ وہ فرماتے ہیں۔

(فی القاهرة) قد ملکها
...یون الذین [illegible] خارجون

قاہرہ کی بادشاہت عبیدیوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ خارج از شریعت تھے یعنی وہ

عن الشريعة وانهم كانوا اسماعيلية كما قال الغزالي ظاهر مذهبهم الرفض وباطنه الكفر المحض، واتفقوا ان قتلهم كان جائزا وهم الذين ابتنوا للنصارى هذه الكنائس وصنف العلماء في كفرهم وزندقتهم مثل القدوري او الشيخ ابي حامد الاسفرائيني والقاضي ابي يعلى و ابي محمد بن ابي زيد وابي بكر ابن الطيب الباقلاني ؎

لوگ ہیں۔ جو اسماعیلی کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ غزالی فرماتے ہیں۔ ان کا مذہب ظاہری طور پر تو رفض ہے اور باطنی طور پر کفر محض متفقہ طور پر ان کا قتل جائز ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے نصاریٰ کے لیے نئے نئے کنیسے اور گرجے بنائے۔ ان کے کفر اور زندقہ پر علماء مثلاً قدوری۔ شیخ ابو حامد اسفرائنی۔ قاضی ابو یعلی، ابو محمد ابو زید، ابو بکر ابن الطیب باقلانی وغیرہ کافی لکھ چکے ہیں۔

ابن تیمیہ نے عبیدیین یعنی خلفائے فاطمہ (مصر) کے جرائم کفر، زندقہ اور الحاد کی جو فہرست گنائی ہے۔ وہ کافی لمبی چوڑی ہے۔ لیکن جرائم میں سرفہرست جو چیز نظر آتی ہے۔ وہ غیر مسلموں کے ساتھ ان کی یہی رواداری ہے چنانچہ مزید فرماتے ہیں۔

وكان وزيرهم بالقاهرة مرة يهوديا فقويت اليهودية بسببه ومرة نصرانيا ارمينيا وقويت النصارى بسبب ذالك النصراني الارمني ونحوا كثيرا ؎

ان عبیدیوں کا ایک سردار جو وزیر ہوتا تھا۔ وہ کبھی یہودی ہوتا تھا۔ تو اس کے سبب یہودیت جڑ پکڑ جاتی تھی۔ اور کبھی ارمنی عیسائی ہوتا تھا۔ تو اس کے سبب عیسائیت قوت حاصل کرلیتی تھی۔

؎ مختصر الفتاوی المصریہ لابن تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ۵۱۳

كثيرة بارض مصر في دولة اولئك الرافضة المنافقين [1]

ان لوگوں نے سرزمین مصر پر بہت سے کلیسا اور گرجے ان رافضی منافقوں کے زمانے میں بنا ڈالے۔

بہرحال بنو فاطمہ جب تک مصر پر حکمران رہے۔ اپنی اس روش پر قائم رہے۔ ان پر چاہے جتنے کفر کے فتوے دیئے جائیں۔ لیکن ان کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ لاکھوں غیر مسلموں کے قلوب پر انہوں نے اسلام کی بے تعصبی، رواداری اور عالی حوصلگی کا نقش بٹھا دیا۔ انہوں نے خود اپنے ہم مذہبوں کی طرف سے کفر اور زندقہ اور منافقت کا الزام گوارا کر لیا۔ لیکن اسلام پر اور اسلام کی ہیئت حاکمہ پر یہ الزام نہیں لگنے دیا۔ کہ محکوم غیر مسلم اسلام کے حدود میں عزت نفس، خودداری اور مساوات کی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ مان لیا کہ یہ عبیدی (بنو فاطمہ) کافر تھے لیکن کافر بھی کتنے اچھے تھے۔ انہوں نے اسلام کی تعلیمات رواداری پر عمل کر کے غیر مسلموں کو اسلام سے قریب تر کر دیا۔ اسلام کا مداح اور معترف کر دیا۔

اور بنو فاطمہ پر کفر کا فتویٰ دینے والے علامہ ابن تیمیہ خود مفتی کی حیثیت سے کہنے اور ماننے پر مجبور رہیں۔

واذا كان اليهودي او النصراني خبيراً بالطب جاز له ان يستطبه كما يجوز له ان يودعه المال وان يعامله وقد استاجر رسول الله صلى الله عليه وسلم رجلا مشركا

اگر کوئی یہودی یا نصرانی فن طب میں درک رکھتا ہو۔ تو یہ بات جائز ہے۔ کہ اس سے معالجہ کرا لیا جائے جس طرح سے یہ بات جائز ہے کہ اس کے پاس مال بطور امانت رکھوا دیا جائے اور اس سے معاملت کی جائے۔ خود رسول اللہ

---

[1] مختصر الفتاوی المصریہ لابن تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ۵۱۳

لما هاجر وكان هاديا ماهرا بالهداية الى الطريق من المكة الى المدينة وائتمنه على نفسه وماله وقد ردى ان الحارث ابن كلدة ـــــ وكان كافرا ـــــ امرهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يستطبوه [1]

نے ایک مشرک شخص کو اجرت پر حاصل کیا جب آپ م نے ہجرت فرمائی تھی، جو بڑا ماہر راہ شناس تھا۔ تاکہ وہ مکہ سے مدینہ تک کے راستہ کی راہنمائی کرے۔ اور اس طرح گویا اس کی امانت میں اپنی جان اور مال دے دیا۔ نیز روایت ہے کہ حارث بن کلدہ (جو ایک کافر تھا) کے بارے میں رسول اللہ نے حکم دیا کہ لوگ اس سے علاج کرائیں۔

اس سلسلہ میں یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ کسی طبیب سے علاج کرانا درحقیقت اپنی زندگی کو اس کی امانت میں دے دینا ہے۔ اور اتنا اعتماد ہر شخص پر نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر ایسے آدمی پر جو اسلام کا مخالف ہو۔ لیکن اسلام کی رواداری صاف اور واضح الفاظ میں اس کی اجازت دیتی ہے۔

---

[1] مختصر الفتاوی المصریہ لابن تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ٥١٦

سرورِ کائناتؐ کی رواداری

غیر مسلموں سے!

دشمنوں اور پیمان شکنوں سے!

منافقوں سے!

شکست خوردہ حریفوں، محکوموں اور جنگی قیدیوں سے!

عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت دخل رھط من الیھود علی رسول اللہ علیہ وسلم فقالوا السّام علیکم قالت عائشۃ ففھمتھا فقلت وعلیکم السام واللعنۃ قالت فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مھلاً یا عائشۃ ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ فقلت یا رسول اللہ اولم تسمع ما قالوا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلت وعلیکم

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت (از راہ شیطنت) آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی، یہودیوں نے آنحضرت کو مخاطب کرکے کہا
"السام علیکم" یعنی آپ پر موت آئے
حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں (مطلب) سمجھ گئی، میں نے کہا
"وعلیکم السام واللعنۃ" یعنی تم پر موت آئے اور تم پر لعنت ہو
رسول اللہ نے فرمایا
"نرمی برتو عائشہ، اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں رفق کو پسند فرماتا ہے"!
میں نے کہا
یا رسول اللہ! کیا آپ نے نہیں سنا، انہوں نے کیا کہا؟
رسول اللہ نے فرمایا
میں نے کہہ دیا تھا "وعلیکم" (یعنی تم پر)
(انہوں نے کہا تم پر موت آئے میں نے کہا تم پر، بس یہ کافی ہے!)

ؕ بخاری

تقدیم

سرورِ کائنات ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک آئینہ کی طرح صاف اور روشن ہے جس میں آپ کے جلوۂ جہان آرا کا پورے طور پر نظارہ کر لیا جا سکتا ہے۔ دنیا کے کسی نبی، کسی حکیم، کسی قائد اور کسی رہنما کے احوال شب و روز اس استناد اس صحت اور اس جزئی تفصیل کے ساتھ دستیاب نہیں ہو سکتے۔ جتنے محمد ﷺ کے حالات ــــــــ تاریخ مسلمانوں کے اس بہت بڑے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی!

قول اور عمل کی جانچ

گذشتہ صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں۔ کہ غیر مسلموں کے ساتھ روادارانہ اور فراخدلانہ برتاؤ کے سلسلہ میں قرآن کریم کیا کہتا ہے ؟ احادیث نبوی سے کیا مستنبط ہوتا ہے ؟ اور فقہ اسلامی کا فتویٰ کیا ہے ؟ لیکن اس دنیا میں قول و عمل کا اتفاق کبھی بھی لازمی نہیں رہا ہے۔ زبان کچھ

کہتی ہے اور عمل کچھ کہتا ہے۔ کانوں کے پردے سے جو آواز ٹکراتی ہے، وہ بڑی شیریں اور خوش گوار ہوتی ہے۔ دل کے اعصاب پر انحراف قول کا عمل جس طرح بجلی بن کر گرتا ہے، وہ بالکل جداگانہ چیز ہے۔ آج بھی کہ تہذیب و مدنیت ارتقا کی انتہائی منزلیں طے کر چکی ہے، ہماری آنکھیں برابر یہی دیکھ رہی ہیں کہ ارباب جاہ و حشمت اور اصحاب اقتدار و اختیار کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس، جرمنی اور اطالیہ یہ وہ سب ممالک ہیں جنہیں اپنی مدنیت اور حضارت، انسانیت دوستی اور فراخدلی و رواداری پر ناز ہے لیکن ان کا سلوک ان لوگوں کے ساتھ جو ان کے ہم رنگ نہیں، کیا ہے؟ یہ کون نہیں جانتا؟ قوت اور بےبسی کے درمیان آج بھی بڑی بڑی دیواریں موجود ہیں۔ یہ دیواریں رنگ کی ہیں۔ وطن کی ہیں۔ مذہب کی ہیں، قوم کی ہیں، ماتحتی کی ہیں۔ یہ دیواریں مرور ایام کے ساتھ ساتھ زیادہ دبیز ہوتی جا رہی ہیں۔ ان میں سے کوئی دیوار بھی آج تک نہیں ٹوٹ سکی۔ ان کی بلندی بھی بڑھ رہی ہے اور حجم بھی۔ ہمارے ہمسایہ ملک بھارت میں ہر شہری کو بلا امتیاز مذہب و ملت یکساں حقوق حاصل ہیں لیکن صرف دستور کے کاغذ پر۔ ورنہ کیا بات ہے کہ ہر روز سینکڑوں مسلمانوں کے قافلے اپنے آبائی دیس کو چھوڑ کر ترک وطن کرتے ہیں۔ مساوات یہ ہے کہ انہیں قابلیت کے باوجود ملازمت نہیں ملتی۔ دولت اور تجربہ کے باوجود کاروبار کی سہولتیں نہیں حاصل ہوتیں۔ اپنے موروثی اور ذاتی مکانات، دوکانات اور جائدادوں پر ہر قسم کے تصرف سے صرف اس لئے محروم کر دیئے جاتے ہیں کہ مسلمان ہیں پس ضروری اور بہت ضروری ہے کہ تاریخی حقائق اور شواہد کی روشنی میں دیکھیں۔ داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کی جو تعلیم دی تھی خود اس پر کہاں تک عمل فرمایا؟ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر قول اور عمل کی جانچ کی جا سکتی ہے اور صحیح نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے!

دشمنوں کا اعتراف

غیر مسلموں تک نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ کہ آنحضرتؐ کی زندگی سراپا رفق و شفقت تھی۔ وہ خاکساری اور بے نفسی کے پیکر تھے۔ ان کی حیات گرامی عبارت تھی، مخالفوں، دشمنوں اور معاندوں کے ساتھ رحم و عطا، بخشش و کرم اور صلہ و عفو کا برتاؤ کرنے سے۔ ایک طرف یہ کیفیت تھی کہ آپ فرش خاک[1] پر بغیر فرش و مسند کے نشست فرما ہوتے تھے۔ اپنے دست مبارک سے اپنی جوتی گانٹھ لیتے تھے[2]۔ سب کے ساتھ لطف اور مرحمت کا برتاؤ کرتے تھے[3]۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو دعوت اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ جو ذات رسالت پناہی کے ساتھ انتہائی مخاصمت رکھتے تھے جو مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر چکے تھے، جنہوں نے جنگ کے میدان میں مسلمانوں کا مقابلہ کیا تھا۔ جنہوں نے سازشیں کی تھیں، منصوبے تیار کئے تھے۔ تدبیریں سوچی تھیں۔ کہ اسلام کا نام و نشان حرف غلط کی طرح صفحۂ ارض سے مٹا دیں۔ اور پھر دربار رسولؐ میں یہ بڑے بڑے خطا کار اور سیہ کار لرزتے اور کانپتے اپنے انجام سے خائف، زندگی سے مایوس اور ہر وسیلہ سے محروم حاضر ہوتے ہیں۔ انہیں خود یقین ہوتا ہے کہ اب بچ نہیں سکتے۔ اپنی بدکاریاں ایک ایک کر کے یاد آتی ہیں۔ اپنے جرائم مرئی اور محسوس صورت میں دیکھنے لگتے ہیں۔ اپنی سفاکیوں، انسانیت سوزیوں اور رخون آشامیوں کو یاد کرتے ہیں۔ اپنی شقاوت اور ستمگری، ظلم و جور اور درندگی و بہیمیت کے مناظر نظر کے سامنے سے گزرنے لگتے ہیں۔ اپنے مکر و فریب، سازش و کید، خبث باطن اور عناد و ناحق کو پیش نظر رکھ کر کانپ جاتے ہیں کہ اب اس دربار سے زندہ و سلامت واپس نہیں جا سکتے۔ لیکن رحمت للعالمین کی نگاہ رحمت ان جرائم پر خط عفو کھینچ دیتی ہے۔ ان

---

[1] تاریخ عرب (سیدیو)، [2] شفاء (قاضی عیاض)، [3] تاریخ عرب (فلپ حتی)

کی زندگی انہیں واپس مل جاتی ہے۔ صرف زندگی ہی نہیں، مال و دولت بھی، عزت اور آبرو بھی، وقعت اور سربلندی بھی۔

داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو تعلیم دی اس پر عمل کیا۔ جو ہدایت دی اسے خود کر کے بتایا۔ جو حکم دیا اسے اپنے عمل سے سنوار دیا۔ آج اس حقیقت کو بہت آسانی سے معلوم کر لیا جا سکتا ہے۔ کہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کو یہ مہذب اور متمدن دنیا جو کچھ اب تک نہ دے سکی وہ اسلام کے دار الامن سے چودہ سو برس پہلے عطا ہو گیا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم!

رسالتمآب کا برتاؤ غیر مسلموں سے

قرآن مجید میں واضح طور پر فرما دیا گیا ہے لا اکراہ فی الدین یعنی دین کے معاملہ میں جبر و جور روا نہیں۔ قرآن کریم ہی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے، کہ کافروں اور اسلام کی دعوت قبول کرنے والوں سے کہہ دو لکم دینکم ولی دین تمہیں تمہارا دین مبارک ہمیں ہمارا۔ رسول اکرمؐ کی زندگی مبارک ان آیتی تعلیمات و ہدایات کا واضح ترین اور مکمل ترین نمونہ تھی۔ رسالت مآبؐ کی زندگی میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی غیر مسلم کو جبر یا دباؤ کے ماتحت مسلمان کیا گیا ہو یا ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہوں کہ قبول اسلام کے سوا اس کے لئے کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا ہو۔ اسلام ایک سچا مذہب ہے۔ یہ رسول اللہؐ کا ایمان تھا۔ اور سچائی کی دعوت جبر اور دباؤ کے ذریعہ نہیں دی جاتی۔ سچائی میں خود اعتمادی ہوتی ہے۔ اور بالآخر یہی خود اعتمادی اس کی کامیابی کی ضامن اور کفیل بن جاتی ہے۔ اسلام کی کامیابی کا راز اس کی یہی خود اعتمادی تھی۔ اور دعوت اسلام کے سلسلہ میں رسالتمآبؐ کی طرف سے

کبھی کسی طرح کا جبر نہ کیا جاتا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دل فتح کرنا چاہتے تھے نہ کہ زبان۔ اور زبان تو زور و قوت سے ہمنوا بنائی جا سکتی ہے لیکن دل کسی طاقت سے بھی مرعوب و متاثر نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت مانتا ہے جب قائل ہو جاتا ہے۔

اس باب میں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ سرور کائنات کا سلوک اور برتاؤ کیا تھا۔ ان کے انکار و طغیان۔ استکبار اور شرارت کے باوجود عطوفت اور رواداری کی کیا کیفیت تھی۔

صبرِ خاموش

آنحضرتؐ کی دعوت و تبلیغ سے کفار قریش بہت برہم ہوتے تھے۔ بت پرستی کے مرکز میں توحید کی یہ صدا ان کے دل آدیز کفار کو برہم اور مشتعل کر دیتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ دعوت و تبلیغ کی یہ آواز بند ہو جائے۔ اور اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے تھے لالچ دیتے تھے۔ دھمکی سے کام لینا چاہتے تھے۔ رشوت پیش کرتے تھے۔ اور جب ان باتوں سے کام نہیں چلتا تھا۔ تو وہ بدترین قسم کی ایذا رسانی پر اتر آتے تھے تاکہ حق کی یہ آواز بند ہو جائے۔ اسلام کی دعوت لوگوں کے کان تک نہ پہنچنے پائے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں دو پڑوسیوں کے شر کے درمیان تھا۔ ابولہب و عقبہ بن ابی معیط۔ یہ دونوں پاخانہ لاتے تھے۔ اور میرے دروازے پر ڈال دیتے تھے بعض مرتبہ ایسی ناپاک چیزیں ہوتی تھیں جو لوگ پھینک دیتے تھے یا میرے دروازے پر یہ ڈال جاتے۔ رسول اللہؐ باہر تشریف لاتے اور فرماتے

"اے بنی عبد مناف یہ کون سا حق ہمسائگی ہے؟"

پھر اسے راستہ سے الگ ڈال دیتے تھے [1]

---

[1] طبقات ابن سعد جز اول

کفارِ مکہ اکثر آپ کو ستاتے، پریشان کرتے اور ایذا پہنچانے کے لئے راستے میں کانٹے بچھا دیتے تھے۔ تاکہ پائے مبارک زخمی ہو جائیں۔ اور آپ چلنے پھرنے سے معذور ہو جائیں۔ اور یوں مستقل طور پر نہ سہی تو عارضی طور پر ہی تبلیغ کا کام رک جائے صرف یہی نہیں کہ اس رکاوٹ پر اکتفا کر لیتے ہوں۔ ایک قدم اور آگے بڑھاتے تھے آپ کے دروازے پر طرح طرح کی گندگیاں پھینک جاتے تھے۔ تاکہ آپ کی طبیعت منغض ہو۔ آپ کو وجہ شکایت پیدا ہو۔ آپ مشتعل ہوں۔ اور اپنے حامیوں اور دوستوں کو ساتھ لے کر ہنگامہ آرائی پر مجبور ہو جائیں۔ صرف اسی طرح وہ جی بھر کے اپنی حسرتیں پوری کر سکتے تھے۔ لیکن ان حرکتوں کے جواب میں ——— رسول اکرم کیا کرتے تھے؟ وہ فرماتے تھے!

فرزندانِ عبد مناف! حقِ ہمسائگی خوب ادا کرتے ہو

ایک دوسری روایت ہے کہ:-

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جو مشرکین آپ کے دولت خانہ میں جا کر آپ کو اذیت اور تکلیف پہنچاتے تھے ان کے نام یہ ہیں:-

ابولہب، حکم بن عاص بن امیہ، عقبہ بن ابی معیط، عدی بن حمراء ثقفی، ابن الاصدا ہذلی یہ سب حضور کے پڑوسی تھے۔ اور سوا حکم بن عاص کے ایک بھی ان میں سے دولتِ اسلام سے سرفراز نہیں ہوا۔ اور یہ لوگ ایسے شریر تھے کہ کوئی ان میں سے حضور پر نماز پڑھنے میں بکری کا پیٹ اور آنتیں ڈال دیتا تھا۔ اور کوئی اپنے اپنے گھر کا کوڑا حضور پر ڈالتا تھا یہاں تک کہ حضور مکان کی کوٹھڑی میں نماز پڑھنے لگے اور جب کوئی شخص ایسی چیز آپ پر ڈالتا۔ تو آپ اس کو لے کر دروازہ پر آتے اور

سوطرسکہ

آواز دیتے کہ اے بنی عبد مناف یہ کیسی ہمسائگی ہے۔ پھر اس کو راستہ سے الگ ڈال دیتے[1]
ساری شرارت اور بدطینتی کا جواب یہ تھا۔ جو رسول اللہ کی زبان پر آتا ہ

جبر و رضا

رسول اللہ کو سب سے زیادہ جو چیز مطلوب تھی وہ نماز تھی کسی حالت میں بھی یہ ممکن نہ تھا کہ آپ نماز ترک کر دیں۔ خواہ وہ جنگ کا میدان ہو یا بستر علالت تبلیغ اسلام کے ابتدائی دور میں جب سارا مکہ آپ کا دشمن ہو رہا تھا۔ دشمن طرح طرح کے آوازے کستے تھے اور پریشان کرتے تھے۔ آپ نماز سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ جب ممکن ہوتا، خانہ کعبہ میں تن تنہا نماز ادا کرتے۔ کفار مکہ کے لئے اس سے بڑھ کر اشتعال انگیز بات کیا ہو سکتی تھی۔ اسلام کا مبلغ بت کدہ کو خدائے واحد کی عبادت کا مرکز بناتے۔ وہ مشتعل ہو کر زیادہ سے زیادہ نارو احرکتوں پر اتر آتے تھے۔

چنانچہ ابن عمرو بن العاص اپنا ایک مشاہدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک روز رسالت مآب کعبتہ اللہ میں فریضہ نماز ادا کر رہے تھے۔ اتنے میں عقبہ بن ابی معیط اموی آیا۔ آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر جل گیا۔ اس نے اپنی چادر کو مروڑا اور بل دیئے۔ جب وہ ایک رسی کی طرح ہو گئی۔ تو سجدہ کی حالت میں آپ کی گردن میں ڈال کر پیچ دینا شروع کر دیئے۔ ہر پیچ پر گردن کستی جاتی تھی اور سانس رکتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ لیکن آپ کے حضور قلب اور توجہ الی اللہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ اسی اطمینان سے سجدہ کناں فریضہ نماز ادا کرتے رہے۔ اتفاق سے حضرت ابو بکر صدیق رض کا ادھر سے گذر ہوا انہوں نے عقبہ کو دھکا دے کر قرآن کے الفاظ میں فرمایا

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ اول

اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ وقد جاءکم بالبینات؟ — کیا تم ایسے آدمی کی جان لینا چاہتے ہو، جو کہتا ہے میرا رب صرف اللہ ہے۔ اور حالانکہ اس کے پاس دلائل (واضح) بھی ہیں؟

حضرت ابوبکر رضؓ نے تو اتنا کچھ فرمایا بھی لیکن آنحضرتؐ کا جواب صرف سکوت تھا۔

نہ برہمی نہ نفرت

ابوجہل کو رسول اکرمؐ کی ذات گرامی سے، اسلام سے اور دعوت اسلام سے جو کد تھی۔ وہ اتنا عام اور مشہور واقعہ ہے کہ تاریخ و سیر کا ایک معمولی طالب علم بھی اس سے واقف ہے۔ اسی ابوجہل نے ایک مرتبہ سرکار رسالتؐ کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے دیکھا۔ کچھ اکابر قریش بھی صحن کعبہ میں بیٹھے یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہے تھے۔ ابوجہل نے کہا فلاں مقام پر آج اونٹ ذبح ہوا ہے۔ اس کی اوجھڑی ویسی ہی پڑی ہے (بڑا مزہ ہو) اگر کوئی شخص لائے اور اس شخص (آنحضرتؐ) پر ڈال دے عقبہ فوراً اٹھا اور گندگی سے بھری ہوئی اونٹ کی وزنی اوجھڑی لاکر اس وقت جب آپؐ سجدہ میں تھے۔ آپؐ کی پیٹھ پر رکھ دی۔

کفار قریش کے لئے یہ منظر بڑا دلچسپ تھا۔ وہ ہنسنے لگے۔ اور ایک دوسرے سے چہلیں کرنے لگے۔ حضرت فاطمہ رضؓ پانچ چھ سال کی بچی تھیں۔ خبر سن کر دوڑی آئیں۔ اوجھ ہٹائی اور کفار کو برا بھلا کہا۔ لیکن آنحضرتؐ بدستور پوری محویت کے ساتھ نماز میں مشغول رہے۔ انھوں نے نہ اس تمسخر کا کوئی جواب دیا۔ نہ تشدد کا جواب تشدد سے دینے کی کوشش کی۔ صرف صبر فرمایا۔ نہ نفرت نہ برہمی نہ غصہ نہ اشتعال نہ جنگ نہ پیکار ——— کیا اس سے بڑی بھی کوئی رواداری ہو سکتی ہے؟

بخاری باب مالقی النبی من المشرکین

کفارِ قریش کا برتاؤ دعوتِ اسلام کے جواب میں صرف ایذا رسانی تھا۔ اور اس کا جواب آپ ؐ کی طرف سے صرف پند و موعظت:

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم امرِ الٰہی پر نہایت صبر و استقلال کے ساتھ قائم رہے۔ اور باوجود قوم کے جھٹلانے اور تکذیب کرنے اور اذیت اور تکلیف پہنچانے کے ان کو پند و نصیحت فرماتے تھے۔ اور جو لوگ مشرکین میں سے حضور کی ایذا دہی اور آپ کے ساتھ مضحکہ اور تمسخر کرنے کے بانی مبانی تھے، یہ لوگ اپنی اپنی قوم کے عمر رسیدہ اور سرِ والے تھے[۱]

خاموشی کے ساتھ

ابولہب کی بدطینتی، عناد اور اسلام آزاری کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی کا یہ مقصد قرار دے چکا تھا۔ کہ دعوتِ اسلام کو سرسبز نہ ہونے دے۔ وہ آنحضرت ؐ کے پیچھے پیچھے تھوکتا۔ اور آپ ؐ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے فقروں کی تردید کرتا۔ مذاق اڑاتا۔ اور ان لوگوں کو جو رسول اللہ ؐ کی طرف متوجہ ہوتے اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ عکاظ میں ہر سال ایک بہت بڑا میلہ لگا کرتا تھا۔ اس میلہ میں دور و نزدیک کے قبائل آ آ کر شریک ہوتے تھے۔ یہاں زور بازو کے مظاہرے بھی ہوتے تھے۔ اور زورِ کلام کی معجز نمائیاں بھی اپنا کرشمہ دکھاتی تھیں۔ یہ ایک بہت بڑا دنگل بھی تھا اور بہت بڑا بیت الشعر بھی۔ پہلوان سلطشوری کے جوہر دکھاتے اور شعراء زبان دانی، زورِ کلام، روانیٔ سخن اور الفاظ کی جادوگری کا معجزہ دکھاتے۔ ہر طرف لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے۔ جس کو جس چیز سے دلچسپی ہوتی۔ اسی سے دلچسپی لینے میں محو ہو جاتا۔

---

[۱] سیرت ابن ہشام حصہ اول

اس میلہ میں ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم بھی پہنچے۔ مقصد یہ تھا۔ کہ دور و نزدیک سے آنے والے قبائل کے کانوں تک اسلام کی پکار پہنچا دیں۔ آپ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں دینِ اسلام کی دعوت دی۔ لیکن ابو لہب کا یہ عالم تھا کہ وہ از خود رفتگی کے عالم میں پاگلوں اور مجنونوں کی طرح آپ کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا اور جوشِ مخالفت میں بآوازِ بلند پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

"یہ شخص جھوٹا ہے!"

"یہ اپنے آبائی دین سے منحرف ہو گیا ہے ——!"

لیکن آنحضرت اس دروغ و شیطنت سے ذرا بھی متاثر نہ ہوتے۔ وہ خاموشی کے ساتھ بغیر کسی سے الجھے ہوئے اپنے مقدس کام میں لگے رہے۔[1]

صداقت بیانی کی قدر

اس سلسلۂ دعوت میں آپ جو قبائل کو دعوتِ اسلام دیتے ہوئے قبیلۂ بنو ذہل بن شیبان کے پاس پہنچے اور اسلام کی دعوت پیش فرمائی۔ اس قبیلہ کے رؤسا اس موقعہ پر موجود تھے سب نے آپ کی دعوت سنی۔ آیاتِ قرآنی کی سماعت کی۔ دینِ اسلام کی کشش اور جاذبیت سے متاثر ہوئے۔ لیکن آبائی دین سے منحرف ہونا اور ایک بالکل نئے دین کو قبول کر لینا آسان نہیں ہوتا۔ اور دین بھی وہ جس کا نہ کوئی حامی، نہ مددگار۔ نہ جس کے پاس فوج نہ دولت نہ روپیہ نہ حکومت۔ چنانچہ انہوں نے اسلام سے ایک حد تک متاثر ہو چکنے کے باوجود اسلام قبول کرنے سے معذرت کی، اور اپنی معذرت کے اسباب و وجوہ بتاتے ہوئے کہا

"جس دین پر ہم پشتہا پشت سے قائم چلے آ رہے ہیں۔ اسے یوں یک بیک

---

[1] طبری

چھوڑ دینا ایک طرح کی زود اعتقادی ہے۔ علاوہ ازیں ہم کسریٰ کے حلقہ بگوش ہیں۔ اور اس سے عہد کر چکے ہیں کہ کسی اور کی اطاعت قبول نہیں کریں گے"!

آنحضرتؐ نے یہ جواب سنا۔ بجائے بددل، مایوس، برہم اور مکدر ہونے کے ان کی صاف بیانی اور کھرے پن کی داد دی اور فرمایا

"خدا اپنے دین کی خود مدد فرمائے گا"۔

خدا پر بھروسہ

کفارِ قریش نے اپنا یہ معمول بنا لیا تھا۔ کہ آنحضرتؐ کو زیادہ سے ستائیں۔ زیادہ سے زیادہ دکھ دیں۔ پریشان کریں۔ آزار پہنچائیں۔ اس سے ذہنی سکون حاصل کرتے تھے۔ آپ کو دکھ پہنچا کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ کہ اگر سکے۔ تو کم از کم اتنا تو کر دیا۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ کو درماندہ اور خستہ کر کے دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے روک دیا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے۔ کہ آپؐ اپنی راہ چلے جا رہے تھے۔ اور دشمن تاک تھے۔ ایک بدطینت موقع پا کر آگے بڑھا۔ اور اس نے آپ کے سر مبارک پر کوڑا پھینک دیا۔ آپؐ نے اس شرارت کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے اپنے گھر تشریف لے آئے۔ حضرت فاطمہ رضؓ کو باپ سے غیر معمولی اور والہانہ محبت یہ منظر دیکھ کر وہ بیتاب ہو گئیں۔ جلدی سے اٹھیں اور سر مبارک دھلانے سر دھلاتی جاتی تھیں۔ اور روتی جاتی تھیں۔ آپ نے فرمایا،

"بیٹی تم کیوں رو رو کر ہلکان ہوتی جا رہی ہے؟ تیرے باپ کی حفاظت خدا کرے گا"!

ایک دوسری روایت

جب ابوطالب کا وصال ہو گیا تو قریش آپؐ کی ایذا دہی میں اور جری

ہو گئے۔ یہ جرأت اس سے پہلے میسر نہ تھی۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے راستہ میں آپ کے سر مبارک پر خاک ڈال دی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ جب اس شخص نے آپ کے سر مبارک پر خاک ڈالی۔ آپ مکان میں تشریف لائے۔ آپ کی صاحبزادیوں میں سے ایک صاحبزادی (حضرت فاطمہ رض) اس کو دھونے لگیں۔ اور روتی جاتی تھیں۔ آپ نے ان سے فرمایا بیٹی روتی کیوں ہو۔ خدا تمہارے باپ کا محافظ ہے"۔ [1]

خود بھی صبر کرتے تھے اور متعلقین کی بھی ڈھارس بندھاتے تھے۔

خدا کے لئے

وعظ و تلقین اور تبلیغ و موعظت کا کوئی موقع آپ ہاتھ سے جانے نہ دیتے خواہ دین حق کے بد اندیشوں کی طرف سے کیسی ہی مخالفتیں کیوں نہ ظہور پذیر ہوں۔ ایک مرتبہ آپ نے حسب معمول دعوت دینا شروع کی۔ مکہ کے ارباب جاہ حسب معمول تلملا اٹھے۔ انہوں نے اپنے غلاموں اور آوارہ گرد چھوکروں کو پہلے سے سکھا پڑھا رکھا تھا۔ ایسے مواقع پر وہ چیختے چلاتے مقام وعظ پر پہنچ جاتے کنکریاں پھینکتے، پتھر لڑھکاتے، سیٹیاں بجاتے، ایذا پہنچانے سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ آپ لہولہان ہو جاتے۔ خون بہہ بہہ کر جوتے میں جمع ہو جاتا اور وضو کے لئے جوتے سے پاؤں نکالنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن ان تمام [illegible]وں کے باوجود نہ آپ کسی قسم کی مزاحمت کرتے نہ ترکی بترکی جواب دیتے۔ نہ اپنے حامی کو بدلہ لینے پر ابھارتے۔ خاموشی کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کر لیتے اور وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ گویا یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا تھا۔ اس کا

---

[1] سیرت ابن ہشام | حصہ اول

آپ ؐ کی ذات سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اللہ ——!

ایک مرتبہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا

سرکار دو عالم ؐ تھکے تھکائے یکہ و تنہا ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے اور سو گئے تلوار کمر سے لگی تھی، اسے اتارا اور درخت کی ایک مضبوط شاخ سے ٹانگ دیا۔ ایسی حالت میں کہ آپؐ محو خواب تھے۔ ایک بد اندیش کافر غورث بن حارث ادھر سے گزرا۔ اس نے دیکھا، تلوار درخت کی شاخ سے لٹک رہی ہے۔ اور آنحضرت ؐ بے خبری کی نیند سو رہے ہیں۔ دل میں خوش ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر موقعہ قدرت کی طرف سے اور کیا مل سکتا تھا؟ ہر طرف سناٹا نہ کوئی حامی نہ مدد گار، دشمن محو خواب، شمشیر آبدار سامنے۔ ایک ہی وار میں سارا جھگڑا ختم۔ نہ کوئی خون کا مطالبہ کر سکتا ہے، نہ کسی اور قسم کا ہنگامہ رونما ہو سکتا ہے۔ ضرور اس حد اور موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے ——— یہ سوچ کر اس نے تلوار اتاری، اسے میان سے باہر نکالا

آنحضرتؐ کو خواب سے بیدار کیا۔ اور پیکر قہر و جلال بن کر سوال کیا

"اے محمد! اب تجھے کون (میری تلوار سے) بچا سکتا ہے؟"

آنحضرتؐ نے یہ منظر دیکھا۔ نہ ہراس طاری ہوا، نہ دہشت کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس اطمینان سے جیسے کوئی خطرہ سرے سے درپیش ہی نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا

اللہ ——!

اپنے سوال کا غیر متوقع جواب سن کر غورث چکرا گیا۔ کھڑا نہ رہ سکا، گر پڑا، آپؐ نے تلوار اٹھالی اور باوقار لہجہ میں دریافت فرمایا

"بول اب تجھے کون بچا سکتا ہے؟"

وہ حیرانی اور سرگشتگی کے عالم میں آپ کی طرف حسرت بھری ملتجیانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ کچھ نہ کہہ سکا!

رحمۃ العالمین نے فرمایا

"جا ــــــــ میں کسی سے، بدلہ لینے کا عادی نہیں![1]"

کل کی امید

دعوت اسلام کے سلسلہ میں آپ طائف تشریف لے گئے۔ وہاں کے لوگوں نے نہایت متمردانہ انداز اختیار کیا۔ نہ صرف دعوت اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ بلکہ سخت رویہ اختیار کیا۔ بدتمیزی اور بدتہذیبی کے ساتھ جواب دیا۔ ایک سردار طائف نے ازراہ تمسخر دعوت کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ واقعی پیغمبر ہیں۔ تو آپ سے گفتگو کرنا بے ادبی ہے اور اگر پیغمبر نہیں ہیں۔ تو اس قابل نہیں کہ گفتگو بھی کی جائے۔"

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ طائف کے ان سربراہوں نے غنڈوں کو ابھار دیا کہ وہ آپ کو صحیح و سلامت واپس نہ جانے دیں۔ انہوں نے سنگباری کر کرکے آپ کو لہولہان کر دیا۔ آخر آپ انگوروں کے ایک باغ میں پناہ گزین ہوئے۔ اس موقعہ پر آپ کو مشورہ دیا گیا۔ کہ ان سرکش اور بدنہاد لوگوں کے لئے بارگاہ ایزدی میں بددعا فرمائیں

آپ نے فرمایا

"میں بددعا نہیں کر سکتا۔ آج یہ ایمان نہیں لاتے۔ ممکن ہے۔ کل ان کی نسلیں اسلام قبول کر لیں!"

بددعا سے انکار

اسی طرح قریش کی ایذا رسانیاں جب حد سے بڑھ گئیں۔ تو آپ سے ایک

---

[1] بخاری

صحابی نے عرض کیا،

"یارسول اللہ! آپ ان لوگوں کے لئے بددعا فرمایئے!"

آپؐ کا چہرۂ مبارک یہ الفاظ سن کر تمتما اٹھا۔ اور آپؐ نے ارشاد فرمایا

"تم سے پہلے وہ لوگ گزر چکے ہیں۔ جن کے سروں پر آرے چلائے جاتے تھے اور وہ چیر ڈالے جاتے تھے۔ پھر بھی اپنے فرض کے ادا کرنے سے وہ نہ چوکتے! اللہ اس کام (دین اسلام) کی تکمیل کرے گا!"

یہود کو سلامتی کا تحفہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہود بنی جنفیہ کے نام جو مقنا میں تھے۔ اور اہل مقنا کے نام تحریر فرمایا (مقنا ایلہ کے قریب ہے) تمہارے قاصد جو تمہاری بستی کو واپس جا رہے ہیں وہ میرے پاس آئے۔ لہٰذا جب میرا یہ فرمان تمہارے پاس پہنچے۔ تو تم لوگوں کو امن ہے۔ تمہارے لئے اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمہاری ساری برائیاں اور تمام جرائم معاف کر دیئے ہیں۔ تمہارے لئے اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ہے۔ تم پر کوئی ظلم و زبردستی نہ ہوگی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس چیز سے خود اپنی حفاظت کرتے ہیں۔ اس سے تمہارے بھی محافظ رہیں گے۔ لہٰذا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے تمہارا وہ مال غنیمت ہے جس پر تم کسی سے صلح کر لو۔ اور وہ غلام جو تمہارے پاس صلح میں آئیں۔ مواشی، گھوڑے، ہتھیار اور مال۔ سوا اس کے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاف فرما دیں یا آپ کا کوئی قاصد معاف کر دے۔

تم پر تمہارے کھجور کے باغوں کا چوتھائی حصہ، بحری شکار کا چوتھائی حصہ اور تمہاری عورتوں کے کاتے ہوئے سوت کا چوتھائی حصہ ہے۔ آئندہ تم لوگ ہر قسم کے جزیہ یا بیگار سے بری ہو۔ اگر تم سنو گے اور اطاعت کرو گے۔ تو رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہوگا۔ کہ وہ تمہارے بزرگوں کا احترام کریں۔ اور تمہارے بدکاروں سے درگذر کریں۔ امابعد بنام مومنین ومسلمین جو شخص اہل نقنا کے ساتھ نیکی کرے گا۔ تو یہ اس کے لئے بہتر ہوگا۔ اور جو ان کے ساتھ بدی کرے گا۔ تو اس کے لیے بھی برا ہوگا۔ اور تم لوگوں پر جو حاکم وامیر ہوگا۔ وہ یا تو تمہیں میں سے ہوگا۔ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلقین میں سے ہوگا۔ والسلام [1]

یہود مدینہ سے معاہدہ

ہجرت کے بعد آپؐ نے یہود مدینہ سے جو پہلا معاہدہ کیا۔ اس کا ایک حصہ حسب ذیل ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سرتاسر رواداری پر مبنی نہ تھا۔

"بے شک خدا کا ذمہ ایک ہے، ادنیٰ مسلمان کافر کو پناہ دے سکتا ہے۔ اور بے شک مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور موالی ہیں یہود میں سے جو شخص ہمارا ساتھ دے گا۔ اس کی مدد ہم پر واجب ہے۔ ضروری ہے کہ ہم دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کریں۔ اور مسلمانوں کی صلح ایک ہے۔ یعنی اگر جہاد میں ایک مسلمان صلح کرے گا۔ سب کو منظور ہو گی۔ اور کوئی مسلمان تنہا عدل وانصاف کو چھوڑ کر اور مسلمانوں کے برخلاف کفار سے صلح نہ کرے گا۔

بنی عوف کے یہودی مسلمانوں ہی میں شمار کئے جائیں گے۔ مسلمانوں کے واسطے ان کا دین ہے اور یہودیوں کے واسطے ان کا دین۔ اور ہر ایک کے موالی بھی انہیں کے ساتھ ہیں۔ اور جو شخص ظلم یا گناہ کرے گا۔ وہ اپنے تئیں آپ ہلاک کرے گا۔ اور بنی نجار کے یہود کے واسطے بھی وہی ہے، جو بنی عوف کے یہود کے واسطے ہے۔ اور بنی حرث اور بنی ساعدہ اور بنی جشم اور بنی اوس اور بنی ثعلبہ اور بنی شطنہ

---

[1] طبقات ابن سعد جزو ثالث

ان سب کا یہود کے واسطے وہی ہے۔ جو بنی عوف کے یہود کے واسطے ہے۔ اور جو شخص کوئی برا کام کرے گا۔ اس کا وبال اس کے اوپر ہے۔ اور بنی ثعلبہ کے موالی مثل بنی ثعلبہ کے ہیں اور یہود کی شاخیں بھی مثل انہیں کے ہیں [1]

پروانۂ امت

اہل علم نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بنی حمزہ بن بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ کے لئے تحریر فرمایا۔ کہ ان لوگوں کو ان کے جان و مال کا امن ہے۔ اس کے خلاف ان کی مدد کی جائے۔ جو ان پر ظلم سے حملہ کرے ان پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد واجب ہوگی۔ جب تک سمندر ایک بال بھی تر کر سکے۔ سوائے اس کے کہ یہ لوگ دین الٰہی میں جنگ کریں۔ جب نبی صلے اللہ علیہ وسلم ان کو بلائیں گے تو یہ آپ کا حکم قبول کریں گے۔ اس پر ان لوگوں کا اللہ و رسول ذمہ دار ہے۔ ان میں سے جو نیکوکار و متقی ہوگا۔ اس کی بھی مدد کی جائے گی [2]

اسلام کی تلوار

طفیل بن عمرو دوسی اپنے قبول اسلام کی دلچسپ داستان بیان کرتے ہیں میری بیوی میرے پاس آئی میں نے کہا تمہارا میرے پاس کچھ کام نہیں ہے۔ نہ تم کو مجھ سے کچھ واسطہ۔ اس نے کہا کیوں کیا ہوا؟ میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں میں نے کہا اسلام نے میرے اور تمہارے درمیان جدائی کر دی ہے اور میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا پیرو ہو گیا ہوں۔ اس نے کہا بس تو میں بھی تمہارا دین اختیار کرتی ہوں میں نے کہا کہ پہلے جا کر غسل کر اور ذی الشریٰ کی ناپاکی دور کر (یہ قبیلہ دوس کے بت کا نام ہے) میری بیوی نے کہا ایسا نہ ہو ذی الشریٰ بچوں کو

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ اول [2] طبقات ابن سعد جزو ثالث

کچھ تکلیف پہنچائے۔ میں نے کہا اس میں کیا قدرت ہے کہ کچھ کر سکے۔ میں اس کا ضامن ہوں۔ غرضیکہ میں نے بیوی کو بھی مسلمان کیا، پھر اپنے قبیلہ دوس کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے قبول اسلام میں تامل کیا۔ میں مکہ میں حضور صلعم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ دعا فرمائیے کہ دوس جلد اسلام قبول کرے۔ آپ نے دعا فرمائی اور مجھ سے ارشاد کیا کہ اپنی قوم میں جاؤ اور ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔[1]

ہدایت نرمی کی ہے۔ جبر، جور، زیادتی کا کوئی سوال نہیں۔ سچ پوچھئے۔ تو اسلام کی تلوار "یہی تھی"!

زہر دینے والی عورت کی جاں بخشی

جب حضور فتوحات سے فارغ ہوئے۔ زینب حرث کی بیٹی اور سلام بن مشکم یہودی کی بیوی نے بکری کا گوشت بھون کر آپؐ کی خدمت میں بھیجا۔ اور لوگوں سے دریافت کیا کہ حضورؐ کو کون سا گوشت پسند ہے۔ لوگوں نے کہا دست کا۔ اس نے دست میں بہت سا اور باقی گوشت میں بھی خوب زہر ملا کر سامنے لا کر رکھ دیا۔ آپؐ نے اس میں سے ایک بوٹی اٹھا کر منہ میں رکھی اور اسے چبایا لیکن نگلا نہیں۔ بلکہ تھوک دیا۔ اور بشر بن براء بن معرور بھی پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک بوٹی چبا کر نگل لی۔ آپ صلعم نے فرمایا یہ ہڈی مجھ سے کہتی ہے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے۔ پھر آپؐ نے اس عورت کو بلا کر دریافت کیا۔ اس نے اقرار کیا۔ کہ ہاں میں نے زہر ملایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تجھے یہ کام کیوں کیا۔ عورت نے کہا۔ اس واسطے کہ میری قوم کی جو حالت تم نے کی وہ تم جانتے ہو میں نے یہ سوچا۔ کہ اگر تم بادشاہ ہو۔ تو میں زہر دے کر راحت پاؤں گی۔ اور اگر نبی ہو

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ اول

تب اس زہر کی ضرور خبر ہو جائے گی۔

راوی کہتا ہے۔ حضورؐ نے اس عورت سے درگذر کی[1]

ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تعرض زبانہ پیس نہیں فرمایا[2]

امن نامہ

محمد بن عمرؓ نے کہا۔ کہ دومہ و ایلہ و تیمار کے لوگوں نے جب دیکھا۔ کہ تمام عرب اسلام لے آیا۔ تو انہیں نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے خوف پیدا ہوا۔ اس پر ان کی تسلی کے لئے یہ فرمان تحریر فرمایا

محمد بن عمرؓ نے کہا کہ یحنہ بن روبہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے یہ ایلہ کے بادشاہ تھے۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے پاس بھی لشکر نہ بھیج دیں۔ یحنہ آئے تو ان کے ہمراہ اہل شام۔ اہل یمن اور اہل بحر بھی تھے۔ کچھ لوگ حربہ درد رح کے بھی تھے۔

آپ نے ان لوگوں سے مصالحت فرمائی۔ ایک معینہ جزیہ مقرر فرمادیا۔ اور ان کے لئے یہ فرمان تحریر فرمادیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! یہ امن نامہ اللہ اور محمد نبیؐ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے یحنہ بن روبہ اہل ایلہ کے لئے ان کی کشتیوں اور قافلوں کے لئے ہے جو بحر و بر میں ہیں۔ ان لوگوں کے لئے اور ان اہل شام و اہل یمن و اہل بحر کے لئے جو ان کے ہمراہ ہیں۔ اللہ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری ہے جو کوئی اس عہد کے خلاف نئی بات کرے گا۔ تو اس کا مال اس کی جان کو نہ بچا

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد دوم [2] طبقات ابن سعد جزو رابع

سکے گا۔ وہ اس شخص کے لیے حلال ہوگا جو اس کو لے لے (یعنی اس پر عمل کرے) یہ بھی حلال نہ ہوگا کہ یہ لوگ جس پانی کے کوئیں پر اترتے ہیں۔ اسے روکیں رکھ اور کوئی نہ بھرے) اور نہ خشکی اور تری کے اس راستہ کو جس کا وہ لوگ ارادہ کرتے ہیں۔

یہ فرمان جہیم بن الصلت و شرحبیل بن حسنہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لکھا۔

عبدالرحمٰن بن جابر نے اپنے والد سے روایت کی، کہ جس روز یحنہ بن روبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو میں نے ان کے بدن پر سونے کی صلیب دیکھی۔ جو ان کی پیشانی پر بندھی ہوئی تھی۔ جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ تو وہ دست بستہ کھڑے ہوگئے۔ اور اپنے سر سے تعظیم وسلام کا اشارہ کیا۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے فرمایا کہ اپنا سر اٹھاؤ۔ آپ نے اسی روز ان سے مصالحت کرلی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک یمنی چادر اڑھائی۔ اور بلال کے پاس ٹھیرانے کا حکم دیا۔ جس روز اکیدر کو خالد لائے۔ تو میں نے انہیں بھی اس کیفیت سے دیکھا تھا۔ کہ ان کے بدن پر سونے کی صلیب تھی۔ اور وہ ریشمی لباس پہنے تھے۔[1]

ابوسفیان سے حسن سلوک

ابوسفیان نے جس مسلسل دشمنی کا مظاہرہ آنحضرتؐ کے ساتھ کیا۔ اسے کون نہیں جانتا۔ فتح مکہ کے بعد جب کوئی سبیل نجات کی نہ رہی۔ تو یہ

---

[1] طبقات ابن سعد جزو ثالث

عم رسول حضرت عباس کے پاس حاضر ہوا۔

ابوسفیان نے کہا میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں۔ مجھ کو تو کوئی ترکیب نجات کی بتاؤ۔ میں نے کہا میں کیا بتاؤں۔ اگر تو مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا تو فوراً تیری گردن مار دیں گے۔ خیر تو میرے پیچھے خچر پر سوار ہو جا۔ میں تجھ کو حضور کی خدمت میں لے چلتا ہوں۔ اور تیرے واسطے امن کی درخواست کروں گا۔ حضرت عباس فرماتے ہیں۔ ابوسفیان میرے پیچھے سوار ہو گیا۔ اور دونوں ساتھی اس کے الٹے پھر گئے اور میں اس کو لے کر لشکر میں آیا۔ جس خیمہ کے پاس سے گذرتا تھا۔ لوگ پوچھتے تھے کہ یہ کون جاتا ہے۔ پھر مجھ کو دیکھ کر کہتے تھے۔ کہ رسول خدا کے چچا رسول خدا کی خچر پر سوار ہیں۔ یہاں تک کہ میں حضرت عمر بن خطاب کے خیمہ کے پاس سے گذرا۔ تو عمر کھڑے ہو گئے اور ابوسفیان کو میرے پیچھے سوار دیکھ کر کہنے لگے یہ ابوسفیان خدا کا دشمن ہے۔ شکر ہے خدا کا کہ خدا نے مجھ کو اس پر قابو دیا۔ اور کوئی عہد و پیمان بھی اس کی جان کے بچنے کے واسطے نہیں ہے۔ اور پھر حضرت عمرؓ حضور کی خدمت میں دوڑے حضرت عباس کہتے ہیں میں نے بھی خچر کو دوڑایا تاکہ میں عمر سے پہلے حضورؐ کی خدمت میں پہنچ جاؤں۔ اور ابوسفیان کے واسطے امن اور پناہ حضور سے لے لوں پس میں عمر سے پہلے حضور کی خدمت میں پہنچ گیا اور عمر بھی اسی وقت آ گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ خدا نے مجھ کو ابوسفیان پر بغیر کسی عہد و پیمان کے قابو دے دیا ہے پس مجھ کو اجازت دیجئے میں اس کی گردن مار دوں عباس کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے ابوسفیان کو پناہ دے دی ہے اور قسم ہے خدا کی آج کی رات میں اس کو اپنے پاس رکھوں گا۔

آپؐ نے فرمایا اے عباس اب تو تم اس کو لے جاؤ اور صبح کو میرے پاس لے آنا۔

حضرت عباس کہتے ہیں۔ رات کو ابو سفیان میرے ہی پاس رہا۔ اور صبح کو میں اس کو لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے ابو سفیان کو دیکھتے ہی فرمایا۔ کہ اے ابوسفیان تجھ کو خرابی ہو کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ تو خدا کی وحدانیت کو جانے ابو سفیان نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ کس قدر حلیم و کریم اور رشتہ کے ملانے والے ہیں۔ بے شک میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں۔ کہ اگر خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہوتا۔ تو ضرور مجھ کو کوئی نفع پہنچاتا۔ کیونکہ میں اس کی پوجا کرتا تھا۔ پھر حضور نے فرمایا افسوس ہے تجھ پر اے ابو سفیان کیا تیرے واسطے ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ کہ تو میری رسالت کا اقرار کرے۔ ابو سفیان نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ کس قدر حلیم و کریم اور رشتہ کا پاس اور خیال کرنے والے ہیں قسم ہے خدا کی اس بات سے اس وقت تک دل میں کچھ ہے ۱

"کچھ ہے" کا مطلب یہ ہے کہ نبوت تسلیم کرنے میں ابھی تک شک ہے — اگرچہ پھر وہ مسلمان ہو گیا۔

لیکن اس کے باوجود آپ ابو سفیان کو امن دیتے ہیں۔ اس کے گھر کو دارالامن قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی دریدہ دہنی پر کوئی بازپرس نہیں کرتے!

اسلام کیوں کر پھیلا؟

مذحج کے انس بن مالک کے قبیلے کے ایک شخص سے مروی ہے۔ کہ ہم میں دس شخص تھے۔ جو بطور وفد نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آنحضرت شام کا کھانا نوش فرما رہے تھے۔ آپ نے انہیں

---

۱ سیرت ابن ہشام حصہ دوم

کھانے کے لئے بلایا۔ تو یہ بیٹھ گئے۔

جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کے قریب آئے اور فرمایا کہ کیا تم شہادت دیتے ہو کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندہ اور رسول ہیں۔ انہوں نے کہا کہ (اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ)

فرمایا کہ تم طمع سے آئے ہو یا خوف سے۔ عرض کی طمع کے متعلق یہ عرض ہے کہ بخدا آپ کے قبضہ میں کوئی مال نہیں جس کا کوئی لالچ کرے، اور خوف کے متعلق یہ گذارش ہے کہ بخدا میں ایسے شہر میں رہتا ہوں جہاں آپ کے لشکر نہیں پہنچ سکتے (کہ کوئی خوف کرے) لیکن مجھے (عذاب آخرت کا) خوف دلایا گیا۔ تو میں ڈر گیا۔ مجھے کہا گیا کہ اللہ پر ایمان لاؤ میں لے آیا[1]

ثقیف کے لئے دعا

طائف سے رخصت ہو کر آپؐ مقام جعرانہ میں تشریف لائے ہوازن کے بہت سے قیدی آپ کے ساتھ تھے، راوی کہتا ہے۔ طائف کی جنگ میں ایک شخص نے عرض کیا۔ کہ ثقیف کے لئے بد دعا فرمایئے۔ آپؐ نے دعا کی۔ کہ اے خدا ثقیف کو ہدایت دے کر میرے پاس بھیج دے[2]

یہودی کی شہادت

زہری سے مروی ہے کہ ایک یہودی نے کہا۔ توریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی صفت ایسی نہ رہی۔ جو میں نے نہ دیکھ لی ہو۔ سوائے حلم کے میں نے تیس دینار ایک معینہ میعاد کے لئے آپ کو قرض دیئے تھے میں آپ

---

[1] طبقات ابن سعد جزو ثالث [2] سیرت ابن ہشام جلد دوم

کو چھوڑے رہا جب میعاد کا ایک روز رہ گیا۔ تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا حق ادا کر دیجئے۔ اے گروہ بنی عبد المطلب آپ لوگوں کی ٹال مٹول بہت بڑھ گئی ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اے یہودی خبیث۔ اگر آنحضرت موجود نہ ہوتے تو میں تیرا سر توڑ ڈالتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابو حفص (عمر) خدا تمہاری مغفرت کرے ہم دونوں کو اس کلام کے علاوہ تم سے اس امر کی ضرورت تھی۔ کہ تم مجھے اس کا قرض ادا کرنے کا مشورہ دیتے۔ جو مجھ پر واجب ہے۔ وہ (یہودی) اس کا محتاج تھا۔ کہ تم اس کا حق وصول کرنے میں اس کی مدد کرتے۔

یہودی نے کہا کہ میری جہالت و سختی سے برابر آپ کے حلم و نرمی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ آپ نے فرمایا کہ اے یہودی تیرے حق کا وقت تو کل ہوگا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ کہ اے ابو حفص! اس کو اس باغ میں لے جاؤ جو اس نے پہلے روز مانگا تھا۔ اگر یہ راضی ہو جائے تو اس کو اتنے اتنے صاع دے دو۔ اور جو کچھ تم نے اس کو کہا ہے۔ اس کی وجہ سے اتنے اتنے صاع زائد دے دو۔ اگر وہ راضی نہ ہو۔ تو پھر بھی اس کو فلاں فلاں باغ سے دے دو۔

وہ کھجور پر راضی ہو گیا۔ عمر نے اس کو وہ دیا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اور اتنا زیادہ بھی جس کا آپ نے حکم فرمایا تھا۔

یہودی نے کھجور پر قبضہ کر لیا تو کہا اشہد ان لا الہ الا اللہ وانہ رسول اللہ! اے عمر آپ نے مجھے جو کچھ کرتے دیکھا۔ مجھے اس پر محض اس امر نے آمادہ کیا کہ میں نے تمام صفات مذکورۂ توریت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں مشاہدہ کر لی تھیں۔ صرف حلم باقی تھا۔ آج میں نے وہ بھی آزما لیا۔ میں نے آپ کو توریت کی صفت کے مطابق پایا۔

میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ یہ کھجور اور میرے مال کا نصف حصہ تمام فقرائے مسلمین پر صرف ہوگا۔ عمر نے کہا کہ یا بعض فقراء پر تو اس نے کہا کہ یا بعض فقراء پر۔ اس یہودی کے تمام گھر والے اسلام لے آئے۔ سوائے ایک صد سالہ بڈھے کے جو اپنے کفر پر قائم رہا[1]

یہودیوں سے لین دین

یہودیوں کا جو برتاؤ آنحضرت ؐ کے ساتھ تھا۔ وہ معلوم و معروف ہے۔ دراندازی شرارت۔ سازش۔ ہجو۔ غیبت سب ہی افعال شنیعہ ان سے سرزد ہوتے تھے۔ لیکن آپ نے ان سے سماجی تعلقات برابر قائم رکھے۔ ان میں بھی فرق نہیں آنے دیا۔ چنانچہ:

اسما بنت یزید سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اور جس روز آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کی زرہ ایک یہودی کے ہاں ایک وسق (تقریباً ۵ من) جو کے عوض رہن تھی[2]

اسلام قبول کرنے کی کہانی

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ آپ ؐ کا لشکر جا رہا تھا۔ راستہ میں بنی حنیفہ میں سے ایک شخص ملا لشکر نے اسے گرفتار کر لیا۔ اور یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کون شخص ہے یہاں تک کہ اس کو آپ کی خدمت میں لائے۔ آپ نے فرمایا جانتے ہو تم نے کس کو گرفتار کیا ہے؟ یہ ثمامہ بن اثال حنفی ہے۔ اس کو اچھی طرح سے رکھو۔ اور آپ نے اپنی اونٹنی کے واسطے حکم دیا کہ اس کا دودھ صبح اور شام دونوں وقت ثمامہ کو پلایا جائے۔

---

[1] طبقات ابن سعد جزء ثالث

راوی کہتا ہے۔ آپؐ جب ثمامہ سے ملتے فرماتے۔ اے ثمامہ اسلام قبول کر لے ثمامہ کہتا۔ اے محمدؐ! اگر تم مجھ کو قتل کرو گے تو قتل کر ڈالو۔ اور اگر فدیہ چاہتے ہو۔ تو جو کہیں منگوا دوں۔ اسی طرح چند روز گذر گئے۔ آخر ایک روز حضورؐ نے فرمایا ثمامہ کو چھوڑ دو۔ ہم نے چھوڑ دیا تو ثمامہ بقیع میں گئے اور وہاں خوب اچھی طرح سے غسل اور وضو کر کے آئے اور مسلمان ہو گئے۔

ابن ہشام کہتے ہیں پھر ثمامہ عمرہ کے ارادہ سے مکہ گئے اور وہاں جا کر انہوں نے لبیک کہا اور یہی مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جس نے مکہ میں داخل ہو کر لبیک کہا۔ قریش نے پکڑ لیا اور قتل کرنے لے چلے۔ ایک شخص نے کہا قتل نہ کرو۔ کیونکہ تم لوگ یمامہ سے غلہ کے محتاج ہو تب قریش نے چھوڑ دیا۔

پھر ثمامہ مکہ میں عمرہ کے واسطے گئے۔ اہل مکہ نے کہا اے ثمامہ تو بے دین ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا نہیں میں سب سے بہتر دین محمدؐ کے دین میں داخل ہوا ہوں۔ اور قسم ہے خدا کی اے قریش اب یمامہ سے تم کو ایک دانہ نہ پہنچے گا چنانچہ جب ثمامہ یمامہ میں پہنچے۔ اپنی قوم کو منع کر دیا۔ کہ خبردار مکہ والوں کے ہاتھ ایک دانہ فروخت نہ کرنا۔ اہل مکہ جب بہت تنگ ہوئے۔ تو آپ کی خدمت میں عریضہ بھیجا۔ کہ آپ تو صلہ رحم کا حکم فرماتے ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ باپوں کو تو آپ نے تلوار سے قتل کیا۔ اور اب اولاد کو بھوک کی شدت سے ہلاک کر رہے ہیں۔ آپ نے ثمامہ کو لکھا کہ اہل مکہ کے ساتھ حسب دستور خرید و فروخت جاری رکھو۔[1]

مرتدین سے رواداری

مرتد کے بارے میں فقہا مختلف ہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ دوم

لیکن جہاں تک اسوۂ نبوی کا تعلق ہے۔ مسئلہ بالکل صاف اور واضح ہے۔ کسی قسم کے شک اور شبہ کا امکان بھی باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں یہ مثال خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔

اہل علم نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا ہے کہ قبیلہ لخم میں سے جو اسلام لائے گا۔ نماز قائم کرے گا، زکوٰۃ دے گا۔ اللہ اور رسول صلعم کا حصہ دے گا شرک کو ترک کر دے گا۔ تو وہ اللہ و محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی پناہ و ذمہ داری میں ہے۔ بے وقوف ہے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے گا۔ تو اللہ اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے بری الذمہ ہیں جس شخص کے اسلام کی کوئی مسلمان شہادت دے تو وہ بھی محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی پناہ و ذمہ داری میں ہے اور وہ مسلمانوں میں ہے[۱]

وقت آخر غلاموں کا خیال

علی بن ابی طالب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیماری جب شدید ہو گئی، تو فرمایا۔ اے علی! میرے پاس ایک طبق (کاغذ) لاؤ تو میں وہ بات لکھ دوں کہ میرے بعد میری امت گمراہ نہ ہو۔ علی نے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ (کاغذ لانے سے پہلے آپ کی جان نہ چلی جائے) میں کاغذ سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوں (مجھ سے زبانی فرما دیجئے)

آپ کا سر میری باہوں اور بازوؤں کے درمیان تھا۔ کہ آپ وصیت فرمانے لگے: "نماز اور زکوٰۃ اور جن (غلاموں) کے تم مالک ہو (ان کا خیال رکھنا) آپ اس طرح فرما رہے تھے کہ روح پرواز کر گئی۔ آپ نے کلمہ شہادت لا الٰہ الا اللہ

---

[۱] طبقات ابن سعد جزو ثالث

(ان محمداً عبدہ و رسولہ) کا حکم دیا اور فرمایا جس نے ان دونوں (توحید و رسالت) کی شہادت دی۔ اس پر دوزخ حرام کر دی گئی [1]

حضرت علی کو ہدایت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضہ کو یمن بھیجا۔ ان کے لئے جھنڈا (لواء) بنایا۔ اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور فرمایا جاؤ اور کسی طرف پھر کر نہ دیکھو۔ جب ان کے میدان میں اترو تو ان سے جنگ نہ کرو تاوقتیکہ وہ تم سے نہ لڑیں [2]

غلاموں کے لئے وصیت

زید بن الخطاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا: "اپنے غلاموں کا خیال رکھو، اپنے غلاموں کا خیال رکھو، جو تم کھاؤ۔ اسی میں سے انہیں کھلاؤ۔ جو تم پہنو۔ اسی میں سے انہیں پہناؤ۔ اگر وہ کوئی ایسا گناہ کریں جسے تم معاف کرنا نہ چاہو۔ تو اے اللہ کے بندو انہیں بیچ ڈالو اور انہیں سزا نہ دو [3]

عبدالرحمٰن بن عوف کو ہدایت

شعبان سنہ ۶ھ میں عبدالرحمٰن بن عوف کا سریہ دومۃ الجندل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن بن عوف کو بلایا۔ انہیں اپنے سامنے بٹھایا۔ اپنے ہاتھ سے عمامہ باندھا اور فرمایا:

اللہ کے نام کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ جو اللہ کے ساتھ کفر کرے۔ تم اس سے اس طرح لڑو کہ نہ تو خیانت کرو نہ بدعہدی کرو۔ اور نہ کسی بچے کو قتل کرو [4]

---

[1] طبقات ابن سعد جزو رابع [2] و [3] طبقات ابن سعد جزو ثانی

کافر کی دھمکی

سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ ابی بن خلف الجمعی بدر کے دن گرفتار ہوا۔ اس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فدیہ دیا۔ اور کہا کہ میرے پاس ایک گھوڑا ہے۔ جسے میں روزانہ ایک فرق (۱۰ سیر) جوار کھلاتا ہوں۔ شاید آپ کو اسی پر سوار ہو کے قتل کروں گا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں انشاء اللہ اس پر تجھے قتل کروں گا ؎

حالانکہ بڑی آسانی سے ممکن تھا۔ کہ اس گستاخی کے بعد فدیہ نہ لیا جاتا۔ اور قتل کر دیا جاتا۔

مشرک کی جرأت

راوی کہتا ہے جب حضور نے ہوازن کے مقابلہ پر جانے کی تیاری کی تو کسی نے عرض کیا۔ صفوان بن امیہ کے پاس زرہ اور ہتھیار بہت ہیں۔ حضورؐ نے صفوان کے پاس جو ہنوز مشرک تھے، آدمی بھیجا۔ کہ بطور عاریت کے تم اپنی زرہیں اور ہتھیار ہمیں دے دو۔ تاکہ ہم ان کے ساتھ اپنے دشمن سے جنگ کریں۔ صفوان نے کہا کیا آپ میرا سامان غصب کرتے ہیں۔ حضور نے فرمایا۔ ہم غصب نہیں کرتے بلکہ بطور امانت کے مانگتے ہیں۔ جنگ سے فارغ ہو کر بجنسہٖ تم کو واپس دے دیں گے۔ تب صفوان نے ایک سو زرہیں مع سامان کے ہتھیاروں کے حضور کی خدمت میں بھیج دیں ؎

حلف الفضول

فلاح عامہ کے بارے میں آپ مسلم و کافر کا امتیاز نہیں کرتے تھے۔

؎ طبقات ابن سعد جزو اول ؎ سیرت ابن ہشام حصہ دوم

نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد آپ برابر اسی مسلک پر قائم رہے۔

جتنے عہد و پیمان ہو چکے تھے۔ حلف الفضول کا معاہدہ ان سب میں معزز تھا سب سے پہلے زبیر بن عبد المطلب نے اس کی دعوت دی، بنی ہاشم و بنی زہرہ و بنی تیم یہ سب لوگ عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے۔ زبیر نے ان کے لئے کھانے کا انتظام کیا۔ سب نے اللہ تعالیٰ کو بیچ میں ڈال کے ان لفظوں میں عہد کیا۔

جب تک دریا میں صوف کے بھگونے کی شان باقی ہے۔ ہم مظلوم کا ساتھ دیں گے: تا آنکہ اس کا حق ادا کیا جائے اور معاش میں اس کی خبر گیری اور مواسات بھی کریں گے۔

جبیر بن مطعم کہتے ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

میں ابن جدعان کے گھر میں حلف میں شریک ہوا تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ سرخ رنگ کے اونٹ ملیں تو میں اس کو توڑ دوں، ہاشم و زہرہ و تیم نے قسمیں کھائی تھیں کہ کوئی دریا جب تک کسی صوف کو بھگو سکتا ہے۔ وہ مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اگر مجھ کو (اب بھی)، اس میں بلایا جائے۔ تو میں قبول کر لوں گا۔ حلف الفضول یہی ہے [1]

ابو طالب کیلئے دعائے مغفرت

ابو طالب آپ کے چچا تھے، مربی تھے۔ ہمدرد اور طرفدار تھے، لیکن اسلام نہ لائے۔ پھر بھی آپ کی ہمدردیاں ان کے ساتھ قائم رہیں۔

---

[1] طبقات ابن سعد جز اول

عمرو کہتے ہیں۔ کہ ابوطالب نے جب انتقال کیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے اور تجھے بخشدے۔ جب تک جناب الٰہی سے ممانعت نہ ہوگی میں تیرے لیے استغفار کرتا رہوں گا[1]

ابوطالب کیلئے مغفرت کی امید

اسحاق بن عبد اللہ بن الحارث کہتے ہیں :-

عباس رض (ابن عبدالمطلب) نے عرض کی

یارسول اللہ اترجو لابی طالب (یا رسول اللہ کیا آپ ابوطالب کے لیئے بھی امید رکھتے ہیں (یعنی آیا ان کے لئے بھی کچھ مغفرت ہے؟

فرمایا

کل الخیر ارجو من ربی (میں اپنے پروردگار سے ہر طرح کی خیر و خوبی و نیکی کی امید رکھتا ہوں[1]

پیاسے دشمن کے ساتھ رعایت

جب یہ لوگ یعنی قریش بدر کے میدان میں آکر اترے۔ تو ان میں سے ایک گروہ آپ کے حوض پر آن کر پانی پینے لگا۔ حضور ص نے صحابہ سے فرمایا کہ ان کو منع نہ کرو پینے دو[2]

---

[1] طبقات ابن سعد جزء اول [2] سیرت ابن ہشام حصہ اول

آنحضرت کا سلوک دشمنوں اور پیمان شکنوں سے

گذشتہ باب میں آنحضرت صلعم کی سیرت و کردار کا جو رخ پیش کیا گیا ہے، وہ اس حقیقت پر مشتمل تھا کہ غیر مسلموں کے ساتھ آپ کا برتاؤ کیا تھا؟ اور واقعات نے ثابت کر دیا۔ کہ وہ برتاؤ سراسر رفق و مدارا، احسان و سلوک اور لطف و کرم کا تھا ——— لیکن ایک شخص کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ دور مجبوری اور پریشان حالی کا دور تھا اس دور میں صبر و برداشت کے سوا اور چارہ کار ہی کیا تھا۔ آنحضرت کی پوری حیات طیبہ پر اگر نظر ڈالی جائے۔ تو یہ بات بالکل ہیچ اور بے وقعت ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اسے کچھ اہمیت بھی دی جا سکتی ہے۔ تو اب اس باب میں ہم یہ دکھائیں گے۔ کہ نسبتہً قوت اور طاقت حاصل کرنے کے بعد آپ صلعم کا برتاؤ ان لوگوں کے ساتھ کیا رہا جو کھلے ہوئے دشمن تھے، جنہوں نے معاہدے کیئے اور ان پر عمل نہ کیا جنہوں نے آپ کو اپنی دوستی کا یقین دلایا لیکن جب دوستی کے امتحان کا وقت آیا۔ تو معلوم ہوا۔ ان میں اور دشمنوں میں کوئی فرق نہیں۔ جنہوں نے

پیمان کا احترام صرف اس وقت تک کیا۔ جب تک اپنے مفاد کا تقاضا نظر آیا۔ اور جب مفاد کا تقاضا یہ ہوا کہ اسے توڑ دیا جائے۔ تو بغیر کسی جھجک اور تامل کے ردی کاغذ کا ایک پرزہ قرار دے دیا ——— ان کی بغاوت اور سرکشی، پیمان شکنی۔ فریب کاری اور دروغ و مکر کا جواب صرف تلوار ہی سے دیا جا سکتا تھا۔ اور اب یہ بات بہت آسان تھی۔ کہ تلوار سے یہ جواب دے دیا جائے۔ لیکن ہم دیکھیں گے کہ آیا آپؐ نے بھی قدرت اور امکان کے باوجود ایسا کیا یا نہیں ———؟

دشمن کیلئے اناج کا تحفہ

کفار کی چیرہ دستیاں اور سفاکیاں، مسلمانوں کی مجبوریاں اور ناچاریاں اہل مکہ کی قساوت اور شقاوت۔ مومنین مدینہ کی عطوفت و رافت ایک ایسی حقیقت تھی۔ جو روز بروز واضح تر اور روشن تر صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ داعی اسلام کے حلم و عفو اور اشرار مکہ کی شرارت اور خباثت میں کوئی نسبت ہی نہیں تھی۔ ثمامہ کے قبول اسلام نے ایک بالکل نئی صورت حالات پیدا کر دی۔ اس کا ملک نجد اہل مکہ کا انبار خانہ تھا۔ اگر وہ اناج کی رسد بند کر دیتا تو مکہ والے فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاتے۔ ثمامہ کے قبول اسلام نے یہی کیفیت پیدا کر دی۔ اس کی غیرت ایمانی اسے برداشت نہ کر سکی۔ کہ اب اس کے ملک سے ان لوگوں کو اناج فراہم کیا جائے۔ جو اس کے دین۔ اس کے خدا اور اس کے رسولؐ کے بدترین دشمن ہیں۔ چنانچہ اس نے غلہ کی فراہمی بند کر دی۔ یہ اتنا بڑا سانحہ تھا جس کی تاب مکہ کے تمرد پسند لوگ نہ لا سکے چیخ اٹھے۔

آنحضرتؐ کو جب یہ کیفیت معلوم ہوئی۔ تو آپؐ کی طبع حق پسند اسے گوارا نہ کر سکی۔ کہ اس دشمن کو بھی پیٹ کی مار دی جائے جس نے جنگ بدر کی

معرکہ آرائیوں میں، خندق کی زبردست جنگ میں۔ احد کی قیامت خیز لڑائی میں مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ آپ کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی۔ کہ دشمن کو ہتھیار ڈالنے پر ناکہ بندی کر کے مجبور کر دیا جائے چنانچہ آپ نے ثمامہ کو فرمان بھجوایا کہ اہل مکہ کا غلہ نہ روکا جائے جس طرح غلہ کی آمد و رفت جاری تھی۔ اس میں کسی طرح کی خلل اندازی نہ کی جائے [1]

نہ جبر نہ جور

آنحضرت ؐ نے بہت سے فرمانرواؤں، حاکموں اور بادشاہوں کے پاس خطوط لکھے کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ کفر و شرک کی زندگی سے تائب ہو جائیں اور امن و سلامتی کا مذہب اختیار کر لیں۔ چنانچہ سرکار رسالت کے نامہ بر کی حیثیت سے حضرت علاء حضرمی، منذر بن ساوی کے پاس گئے۔ جو اپنے علاقہ کا فرماں روا تھا۔ نامۂ نبوی کا منذر پر ایسا اثر پڑا۔ کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ پھر اس نے خود ایک مکتوب آنحضرت ؐ کی خدمت میں لکھ کر وہاں کی صورت حالات کی وضاحت کی۔ جو یہ تھی۔ کہ کچھ لوگوں نے انشراح قلب کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ کچھ نے کراہت کا اظہار کیا اور ایک طبقہ نے علانیہ مخالفت کی۔ اس طبقہ کو پیش نظر رکھ کر اس نے سرکار رسالت سے دریافت کیا۔ کہ میرے ہاں یہودیوں اور مجوسیوں کی کافی تعداد ہے۔ ان (مخالفین و معاندین اسلام) کے لئے کیا حکم ہوتا ہے؟

یہ بڑا اچھا موقع تھا دشمنوں کے استیصال کا۔ بڑی آسانی سے اسلام کے دشمن، یہودیوں اور مجوسیوں کا قلع قمع کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ کام دنیاوی بادشاہوں اور ملک گیروں کے ہوتے ہیں۔ روحانی تاجداروں اور ربانی نمائندوں

---

[1] سیرت ابن ہشام

کے نہیں ہوتے۔ چنانچہ منذر کو جواب دیتے ہوئے رسول اللہ نے فرمایا۔

ومن یتصلح انما یتصلح لنفسہ — جو شخص نصیحت (اسلام) قبول کرتا
ومن اقام علی یہودیۃ او مجوسیۃ — ہے۔ وہ اپنی بھلائی کیلئے قبول کرتا ہے۔
فعلیہ الجزیۃ — لیکن جو یہودیت یا مجوسیت پر قائم رہے
اس پر جزیہ کی ادائیگی ضروری ہے۔

کسی طرح کے جبر و جور اور انتقام کا خیال آں حضرت ص کے قلب میں کبھی اور کسی موقع پر آنے ہی نہیں پاتا تھا۔

مال غنیمت قبول کرنے سے انکار

رجب ۲ھ کا واقعہ ہے۔ سرور کائنات ص نے حضرت عبداللہ بن حجش کو اس کام پر مامور فرمایا۔ کہ وہ نخلہ جائیں۔ اور قریش کی سرگرمیوں کی سن گن لیں اور حالات سے دربار رسالت کو مطلع کریں۔ حضرت عبداللہ اس کام پر تشریف لے گئے۔ اتفاق کی بات قریش کے ایک کاروان تجارت سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ حضرت عبداللہ نے سوچا دشمن سامنے آگیا ہے۔ تو اسے بغیر لڑے بھڑے کیوں جانے دیا جائے جنگ شروع کردی۔ اس لڑائی میں دشمن کا ایک شخص ہلاک ہوا دو گرفتار کر لئے گئے۔ اور کافی مال غنیمت ہاتھ آیا۔ حضرت عبداللہ خوش خوش مدینہ تشریف لائے اور یہ واقعہ بیان کرکے مال غنیمت سارے کا سارا رسالتماب ص کے سامنے ڈھیر کر دیا ——— لیکن کیا رسالتمآب ص نے حضرت عبداللہ کے اس فعل کو سراہا؟ پسند کیا؟ مال غنیمت قبول فرمالیا؟ ——— "تاریخ کا جواب صاف انکار میں ہے۔ جو صحابہ موجود تھے۔ انہوں نے بھی آنحضرت ص کی چشم عتاب دیکھ کر حضرت عبداللہ کی زجر و توبیخ کی۔ اور خفگی کے انداز میں کہا

صنعتم مالم تومروا بہ — تم نے یہ کام کیا جس کا تمہیں حکم نہیں دیا گیا تھا[1]

---

[1] تاریخ طبری

مال غنیمت نہ قبول فرمانے سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ کو ایک کافر اور دشمن کے خون ناحق سے کتنی تکلیف پہنچتی تھی۔

اسی سلسلہ کی ایک اور توضیحی روایت

مسلمانوں نے باہم مشورہ کیا۔ کہ آج رجب کا آخری روز ہے۔ اگر تم ان سے ...تے ہو اور ان کو قتل کرتے ہو۔ تو یہ مہینہ حرام ہے۔ اور اگر آج انتظار کرتے ہو ...یہ لوگ رات حرم میں داخل ہو کر پھر تمہارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ آخر انہوں نے اپنے دل قوی کئے اور جنگ ہی پر سب کا اتفاق ہوا۔ اور واقد بن عبداللہ تمیمی نے ایک تیر ابن حضرمی کے ایسا مارا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو مسلمانوں نے قید کر لیا۔ اور نوفل بن عبداللہ بھاگ ...ہر چند اس کو تلاش کیا۔ مگر کہیں نہ ملا۔ پھر عبداللہ بن جحش ان دونوں قیدیوں ...مال غنیمت کو لے کر مدینہ میں حضور کے پاس حاضر ہوئے۔

روایت ہے کہ عبداللہ بن جحش نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا۔ کہ یہ ...قدر مال غنیمت ہمارے ہاتھ لگا ہے۔ اس میں سے پانچواں حصہ ہم حضور ...نذر کریں گے۔ اور یہ واقعہ خمس کے فرض ہونے سے پہلے کا ہے چنانچہ عبداللہ ...جحش نے حضور ﷺ کے واسطے خمس نکالا۔ ابن ہشام کہتے ہیں۔ جب عبداللہ ...جحش مدینہ میں آئے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا۔ کہ میں نے تم سے یہ کب کہا ...تھا کہ تم حرام مہینہ میں جنگ کرو۔ اور حضور ﷺ نے اس خمس کو نہیں لیا۔ اور سب ...اور دونوں قیدیوں کو رہنے دیا۔ عبداللہ اور ان کے ساتھی بہت رنجیدہ ...اور خیال کرتے تھے کہ ہم ہلاک ہو گئے اور مسلمان بھی ان کی اس حرکت کو ...تے تھے۔

سیرت ابن ہشام حصہ اول

دشمن سے رعایت

تاریخ اسلام کی مشہور جنگ بدر کے سلسلہ میں فریقین جب اپنی جنگی تیاریوں میں مصروف و منہمک تھے۔ تو قدرۃً ہر ایک کے دل میں یہی خیال موجزن ہوگا۔ کہ جس طرح بھی بنے دشمن کو شکست دی جائے۔ جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے نہ مروت۔ رعایت یہ نظام اخلاق امن و عافیت کے زمانہ کا ہے۔ جنگ کا نظام اخلاق صرف تشدد اور تلوار ہے۔

جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، کہ ایک موقع بغیر لڑے فتح حاصل کرنے کا مسلمانوں کو مل گیا۔ مسلمانوں نے ایک چشمہ پر قبضہ کر لیا۔ جس نے مسلمانوں کی تشنہ لبی دور کر دی۔ اور کافروں کے لئے موت و زیست کا سوال پیدا ہو گیا۔ لیکن اسلام کے تاجدار نے یہ گوارا نہ کیا۔ کہ دشمن کو پیاسا مارا جائے۔ آپ کی طرف سے حکم صادر ہوا۔ کہ اس پانی سے دشمن بھی حسب ضرورت فائدہ اٹھا سکتا ہے[1] گو اس حسن اخلاق کا دشمن کی شقاوت اور قساوت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کی اسلام بیزاری اور مسلم آزاری کا جذبہ جوں کا توں قائم رہا۔ لیکن تاریخ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس لطف عمیم اور احسان عظیم کو اپنے صفحات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ اور مسلمانوں کے لئے ایک ایسی رعایت قائم کر دی جس سے روگردانی مومنان کے لئے بعد کے ادوار میں بھی آسان نہ رہا۔

کافر باپ کا لحاظ

غزوہ احد میں عجیب صورت حال سامنے آئی ——— کفار کے لشکر سے ابو عامر لڑنے کے لئے بڑھا۔ اسلام کے لشکر سے جو شخص اس سے مقابلہ کرنے کے

---

[1] سیرت ابن ہشام

ے نکلا۔ وہ اس کا بیٹا حنظلہ رضؓ تھا۔ تلوار اس کے قبضہ میں تھی اور آگے بڑھنے کے لئے وہ مچل رہا تھا۔ حق کا جوش بیٹے کو مجبور کر رہا تھا۔ کہ باطل پرست باپ کی گردن کاٹ دے لیکن سرورِ کائنات ؐ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ کہ بیٹا باپ کے مقابلہ میں —— اگرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو —— تلوار سونت کر نکلے۔ آپ نے حنظلہ رضؓ کو باپ کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔

زندگی کی نعمت

خیبر کے مشہور اور ناقابلِ فراموش معرکہ میں ایک دفعہ رات کو لشکر کی پاسبانی حضرت عمر رضؓ کے حصہ میں آئی۔ گرد آوری کے دوران میں ایک یہودی نظر آیا جسے انہوں نے گرفتار کر لیا۔ جنگ کے عام اصولوں کے مطابق دشمن کا جو آدمی اس طرح گرفتار ہو بے تامل قتل کر دیا جاتا ہے۔ اور عرب میں تو بڑی سختی سے اس اصول پر عمل کیا جاتا تھا۔ لیکن خوش قسمت یہودی کا پالا پڑا تھا اسلامی لشکر سے۔ جس میں خود اسلام کا داعی بھی موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن کی جان کے لالے پڑے تھے۔ اسے زندگی کی نعمت مل گئی۔

میری قوم ——!

غزوہ احد تاریخ اسلام کی بڑی یادگار اور فیصلہ کن لڑائی ہے۔ اس جنگ میں ایک مرحلہ ایسا آیا کہ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور کافر پیش دستی اور تیز دستی کے جوہر دکھانے لگے۔ خود سرورِ کائنات ؐ حملہ کفار کی زد میں آ گئے۔ ایک کافر نے تلوار کا ہاتھ سر مبارک پر مارا جس سے خود کٹ گیا۔ اور اس کی دو کڑیاں چبھ گئیں جس کے باعث رخِ انور پر خون کی دھار بہہ نکلی۔ پیش و پس سے تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ چند جاں نثار تھے جو حملہ کو اپنے سر و سینہ پر روکتے تھے۔ اور پروانے کی طرح شمعِ رسالت پر تصدق ہو جانا اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔

اس عالم میں بھی سرورِ کائنات کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہیں نکلا جس سے یہ معلوم ہوتا۔ کہ آپ کے دل میں دشمن کی نفرت ہے۔ اس مرحلہ پر بھی آپ کی زبان پر جو کلمات جاری تھے یہ تھے

رب اغفر قومی فانہم لا یعلمون — یعنی اے میرے پروردگار میری قوم کو بخش دے یہ وہ لوگ ہیں جو ابھی حق کو نہیں جانتے [1]

ان الفاظ میں محبت، تعلقِ خاطر اور خیر و فلاح کے سوا کچھ اور بھی ہے؟

کافر کا خون بہا

قبیلہ کلاب کے رئیس ابوبراء نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر استدعا کی۔ کہ کچھ مسلمان اس کے ساتھ کر دیئے جائیں "تاکہ وہ اس کے اہل قبیلہ کو اچھی طرح سمجھا سکیں۔ آنحضرتؐ نے یہ استدعا قبول کر لی اور ستر صحابہ کو اس کے ساتھ کر دیا۔ یہ لوگ ایک مقام بئر معونہ میں قیام پذیر ہوئے۔ اور ایک شخص کو مکتوب نبوی دے کر عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ جو قبیلہ کا سردار تھا۔ عامر نے قاصد کو قتل کر دیا اس پاس کے قبائل سے مدد لے کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ چڑھ دوڑا اور تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ صرف ایک مسلمان عمرو بن امیہ کو سر کے بال کاٹنے کے بعد یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی۔ جا تجھے آزاد کرتا ہوں۔ عمرو بن امیہ وہاں سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں بنو عامر کے دو آدمی مل گئے۔ عمرو نے انہیں قتل کر دیا۔ اور مدینہ پہنچے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ ان بے گناہ مبلغین اسلام کی یکبارگی شہادت سے سرور کائناتؐ کو کتنا زبردست صدمہ پہنچا ہو گا۔ آپ کو اتنا غم ہوا کہ کسی

---

[1] صحیح مسلم

حادثہ کا اتنا زیادہ غم نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب عمرو بن امیہ سے سنا کہ راستے میں انہوں نے دو عامری لوگوں کو قتل کرکے عامر کی بے وفائی کا بدلہ لے لیا۔ تو آپؐ نے نہ صرف یہ کہ خوشنودی مزاج کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ برہم ہوئے۔ اس لئے کہ یہ دو عامری وہ تھے جنہیں دربار رسالتؐ سے کافر ہونے کے باوجود امان مل چکی تھی۔ اور آنحضرتؐ کو یہ گوارا نہ تھا۔ کہ اسلام کی امان میں آنے کے بعد کوئی کافر بھی بے گناہ قتل ہو۔ ان مقتولوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ پھر یہ قتل کیوں ہوئے۔ آنحضرتؐ اس واقعہ سے اتنے متاثر ہوئے۔ کہ ایک طرف تو آپؐ نے عمرو بن امیہ پر خفگی کا اظہار فرمایا۔ دوسری طرف ان عامری لوگوں کے خون بہا کا اعلان فرما دیا!

مجھے فضیلت نہ دو

کفار کی تالیف قلوب ان کی بدترین ایذا رسانیوں کے باوجود آپ فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک یہودی حضرت موسیٰؑ کے مناقب اس طرح بیان کرنے لگا۔ کہ گویا حضرت موسیٰؑ کو آنحضرتؐ پر سبقت حاصل ہے۔ ایک انصاری کو یہ بات سن کر تاب نہ رہی۔ انہوں نے یہودی کے منہ پر ایک تھپڑ لگا دیا۔ یہودی زیرک تھا۔ بجائے اس کے کہ ترکی بترکی جواب دیتا۔ وہ آنحضرتؐ کے پاس پہنچا اور انصاری کی شکایت کی۔

آپ نے یہودی کی دادرسی کرتے ہوئے حسب روایت بخاری فرمایا

"مجھ کو دوسرے پیغمبروں پر فضیلت نہ دو!"

مسلمان باپ کی کافر اولاد

یہودیوں کو بار بار معاف کیا گیا۔ ان کی سازشوں اور حیلہ جوئیوں کو نظر انداز کیا گیا۔ ان کی باغیانہ اور سرکشانہ سرگرمیوں پر عفو و درگزر کا مظاہرہ کیا گیا۔ لیکن ان کی سرشت اور طینت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہاں تک کہ ان کا ایک قبیلہ ———— بنو نضیر ———— جلاوطن کر دیا گیا۔ لیکن سب کچھ چھین کر نہیں۔ سب کچھ دے کر اور

اس شان و شکوہ اور جاہ و تجمل سے مدینہ چھوڑ رہے تھے جیسے بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ کسی شادی میں شرکت کے لئے جا رہے ہوں لیکن ان کے جاتے جاتے ایک بڑی رکاوٹ پیش آگئی جب کہ انصار نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ وہ یہودیوں سے متاثر تھے۔ بے اولاد لوگ یہودی عبادت گاہوں میں جا جا کر منت مانتے تھے۔ کہ اگر اولاد ہوئی۔ تو پہلی اولاد کو وہ یہودی بناویں گے۔ (یہ ضعیف الاعتقادیاں ہندوستان میں بھی ہیں) اس جملہ معترضہ سے قطع نظر یہودی جب جانے لگے۔ تو ان انصاری عربوں کو ساتھ لے چلے۔ جو نذر اور منت کے باعث یہودی بنائے جا چکے تھے لیکن اب جن کا خاندان ان کو ساتھ نہ جانے دینے پر مصر تھا۔

یہ انصاری عرب بہر حال مذہباً یہودی تھے۔ ان کے مسلمان والدین اور متعلقین کو اگر اجازت دے دی جاتی۔ کہ وہ انہیں روک لیں۔ تو یہ مذہبی معاملات میں مسلمانوں کی طرف سے غیر مسلموں پر ایک قسم کا دباؤ ہوتا۔ اور آپ اسے گوارا نہ کر سکتے تھے ——————— لہٰذا عرب خاندان کے یہودی نوجوانوں کو بلا استثنا اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ چلے جائیں۔[1]

رسول کے لفظ پر نزاع

صلح حدیبیہ (۶ھ) کے موقع پر بار بار ایسے مرحلے آئے۔ کہ معاہدہ لکھے سے پہلے منسوخ ہو جاتا۔ لیکن آپ کی رواداری نے ان تمام نازک مرحلوں کو خیر و خوبی کے ساتھ گذر جانے دیا۔ عین اس وقت جب شرائط پر اتفاق ہو چکا تھا اور امیر المومنین علی رض معاہدہ لکھ رہے تھے۔ قریش کا نمائندہ سہیل بن عمرو تھا۔ معاہدہ

---

[1] طبری

کے آغاز میں برکت کے لئے امیرالمومنین نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" تحریر فرمادیا سہیل بن عمرو نے اعتراض کیا یہ نئی بات ہے۔ ہم اس کے خوگر نہیں ہمیشہ سے اپنے خطوں کی ابتدا میں "باسمك اللهم" لکھتے چلے آئے ہیں وہی لکھئے۔ رسول اللہ نے سہیل کی یہ بات مان لی۔ اور حضرت علی رضؓ سے فرمایا۔ کہ وہی لکھو جو سہیل چاہتا ہے

اس کے بعد بڑا نازک موقعہ آیا۔

حضرت علی رضؓ نے تحریر فرمایا

"یہ وہ معاہدہ ہے جسے محمد رسول اللہ نے منظور فرمایا"

سہیل بھڑک اٹھا

"اگر ہم محمدؐ کو رسول اللہ مانتے ہوتے۔ تو جھگڑا ہی کاہے کا تھا۔ صرف محمدؐ اور محمدؐ کے باپ کا نام ہونا چاہیئے۔"

یہ سن کر آپؐ نے امیرالمومنین سے فرمایا

"رسول اللہ" کا لفظ کاٹ دو!"

حضرت علیؓ عاشق رسول تھے۔ بچپن سے اب تک زندگی کا ایک ایک لمحہ اس لئے گذارا تھا کہ یہ زندگی سرور کائناتؐ پر قربان ہو جائے۔ لیکن محمدؐ کے نام سے "رسول اللہ" کا لفظ اپنے قلم سے محو کرنے پر رضامند نہ ہوئے۔ فرمایا

"مجھ سے ہرگز یہ نہیں مٹایا جا سکتا۔"

سرور کائناتؐ نے فرمایا

"جس جگہ میرا نام لکھا ہے۔ مجھے دکھاؤ"

امیرالمومنین نے وہاں انگلی رکھ دی۔ آنحضرتؐ نے خود اپنے دست گرامی سے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا۔

لرزہ خیز منظر

معاہدہ کے شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مدینہ سے اگر کوئی مسلمان مکہ جائے۔ تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا لیکن مکہ سے اگر کوئی کافر یا مسلمان مدینہ آئے تو اسے مکہ (کفار کے پاس) بھیج دیا جائے گا۔

آنحضرت ص کے سوا تمام سربرآوردہ مسلمان اس معاہدہ صلح کو معاہدہ شکست "سمجھ رہے تھے لیکن خدا کا رسول ص اپنے رب کے کہنے کے مطابق اسے فتح قرار دے رہا تھا۔ اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا۔ کہ واقعی یہ فتح مبین تھی ——— ایسی فتح جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا عرب مسلمان ہو گیا! لیکن اس معاہدے کا ابھی نفاذ نہیں ہوا تھا۔ کہ ایک اور لرزہ خیز اور دہلا دینے والا سانحہ پیش آ گیا۔

کفار قریش کا نمائندہ بن کر تسوید و تکمیل معاہدہ کے لئے جو شخص آیا تھا۔ ہم اس کا نام پڑھ چکے ہیں۔ سہیل بن عمرو تھا۔ اس سہیل کا لخت جگر "ابوجندل" حلقہ بگوش اسلام ہو چکا تھا۔ ابوجندل کو اب تک مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ کیونکہ وہ قید میں تھا۔ اور کافر اسے وحشت ناک مظالم کا ہدف بنائے ہوئے تھے۔ کوئی ظلم ایسا نہیں تھا۔ جو اس غریب پر پوری بے دردی، سنگدلی اور خونخواری کے ساتھ نہ توڑا جا رہا ہو۔ اتفاق کی بات ابوجندل کو فرار کا موقعہ مل گیا۔ وہ اس طرح دربار رسالت میں پہنچے۔ کہ پاؤں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ بدن پر مار کے خون ریز نشانات تھے۔ بدن زخموں سے چور چور ہو رہا تھا۔ نڈھال مضمحل۔ پریشان اور زار و فگار۔ وہ جمال رسالت ص دیکھ کر بے تابانہ چیخ اٹھا

"بجرم عشق توام می کشند غوغائیست"

سہیل نے جو اپنے بیٹے کو دیکھا۔ کہ گرفت سے نکل کر مسلمانوں کے پاس

پہنچ گیا۔اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔اس نے سرورِ کائنات ؐ کو مخاطب کر کے کہا:۔

محمد ——————عہد نامۂ صلح کے مطابق ابوجندل کو مجھے واپس کردو!

سہیل کا یہ مطالبہ سن کر حاضرینِ بارگاہِ رسالت کے چہرے غصہ سے سرخ ہو گئے۔ حضرت عمر رضؓ تو بے قابو ہو گئے۔ ۱۴سو مسلمان قافلۂ نبوت میں موجود تھے اور یہ ایسی تعداد تھی۔جو بڑے بڑے معرکے سر کر چکی تھی اور کر سکتی تھی۔ان میں کا ہر شخص ابوجندل کا حال زار دیکھ کر لڑنے بھڑنے پر تیار تھا صرف اشارۂ نبوی کا منتظر تھا۔کوئی مسلمان بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔کہ ابوجندل جس پر اتنے ہولناک اور وحشیانہ مظالم توڑے جا چکے ہیں۔پھر کافروں کے حوالے کر دیا جائے یہ معاہدہ کی تکمیل کا نہیں۔اس کے شکست کر دینے کا' اسے منسوخ کر دینے کا' اسے چاک کر دینے کا' اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا وقت تھا۔وہ معاہدہ جو ابوجندل جیسے مردِ مومن کو زمرۂ کفار و اشقیا کے حوالے کر دے۔ہرگز باقی نہیں رکھا جا سکتا! —————— اور ابوجندل بدستور خاک و خون میں تھڑے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

رسالت مآب ؐ نے ابوجندل پر شفقت سے بھری ہوئی ایک نظر ڈالی۔اور صبر و تحمل کی تلقین فرمائی۔پھر فرمایا!

انا عقدنا بیننا و بین القوم صلحا ہمارے اور کفار مکہ کے بین صلح ہو چکی اور
وانا لا نغدر بہم ہم بد عہدی کا ارتکاب نہیں کر سکتے؛

یہ سن کر سہیل کا چہرہ جوشِ مسرت سے تمتما اٹھا۔ابوجندل کو موت نظر آنے لگی۔مسلمانوں پر بجلی گر پڑی لیکن کس مسلمان میں مجال تھی۔کہ وہ تاجدار رسالت کے

آگے سرِ تسلیم خم نہ کرتا ——— سہیل خوشی خوشی اپنے "نافرمان" اور "بے دین" بیٹے کو پابجولاں اپنے ساتھ لے گیا ——— اس غم انگیز واقعہ کے کتنے خوشگوار اور کامیاب نتائج رونما ہوئے۔ یہ تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن جس سلسلہ میں ایک طویل داستان کا یہ مختصر سا ٹکڑا ہم نے پیش کیا ہے۔ کیا وہ رواداری کی تاریخ میں عدیم النظیر نہیں؟

بے مثال

اسی طرح کا ایک اور واقعہ خاص طور پہ قابل ذکر ہے۔ مکہ میں جو مسلمان جبر و جور کی زندگی بسر کر رہے تھے کفار ان پر مشق ستم کر رہے تھے۔ لاکھ لاکھ کوشش کرتے تھے۔ کہ یہ اپنے دین سے پھر جائیں۔ اور پھر کفر و شرک کی زندگی بسر کرلیں۔ لیکن اسلام کا نشہ ایسا نہ تھا جو ان ترشیوں سے اتر جاتا۔ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا ؎

تعویز عشق جرم ہے بے صرفِ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

جتنی جتنی سختیاں بڑھتی تھیں۔ اتنا اتنا اسلام کا عشق فزوں ہوتا جاتا تھا۔ بڑی سے بڑی سختی بھی ان بلاکشانِ محبت کو جادۂ اسلام سے منحرف نہ کرسکی ہاں یہ ضرور تھا۔ کہ ان میں سے اگر کسی کو موقع ملتا تھا۔ وہ بھاگ کر مدینہ پہنچ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اسی طرح کفار مکہ کے ستم زدہ ایک شخص عتبہ بن اُسید مکہ سے پہنچے پیچھے پیچھے قریش کے دو آدمی پہنچے۔ اور انھوں نے رسالتمآب صلعم کو معاہدہ صلح یاد دلا کر اصرار کیا۔ کہ عتبہ واپس کر دیئے جائیں۔

له سیرت ابن ہشام

رسالتمآبؐ نے بے تامّل عقبہ کو حکم دیا۔ کہ مکہ واپس جائیں۔
انہوں نے بے بسی کے ساتھ کہا
"کیا ان کافروں کے پاس جاؤں۔ جو مجھے کفر پر مجبور کرتے ہیں؟"
سرور کائناتؐ نے فرمایا!
"خدا تمہارے لئے کشائش کی کوئی صورت نکالے گا"!
اب عقبہ کے پاس اس کے سوا کیا چارۂ کار تھا۔ کہ جہاں کی صحبتوں کی تاب نہ لاکر وہ مدینہ کے دار الامن میں آپہنچے تھے۔ اب پھر وہاں واپس جائیں۔ چنانچہ وہ ان دونوں کافروں کے ساتھ واپس چلے گئے[1]
پیمان شکنوں کے ساتھ پاس عہد کی یہ ایسی مثال ہے۔ جو قیامت تک بے مثال رہے گی!

درگذر سے کام لو

آنحضرتؐ کی سانڈنیاں جس چراگاہ میں چرا کرتی تھیں۔ اس کا نام "غابہ" تھا۔ ایک مرتبہ قبیلۂ غطفان کی ——— جس سے دوستی تھی ——— ایک جماعت نے اس چراگاہ پر چھاپہ مارا۔ اور اونٹنیاں پکڑ کر لے گئی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کے بیٹے اس کے محافظ تھے۔ انہیں قتل کر دیا۔ اور ان کی بیوی کو پکڑ لے گئے۔ ایک صحابی حضرت سلمہؓ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی۔ تو ان حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے۔ اور تیر باری شروع کر دی۔ حملہ آور تیروں کی بارش نہ سہہ سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت سلمہؓ نے حضور رسالتمآبؐ میں پہنچ کر یہ تفصیل سنائی اور عرض کیا! میں تشنہ لب چھوڑ آیا ہوں۔ اگر سو آدمیوں کا ایک دستہ مرحمت ہو تو سب کو گرفتار کر لاؤں

---

[1] طبری

سو آدمی بڑی آسانی سے ممکن تھے۔ اور ان قاتلوں اور حملہ آوروں کی گرفتاری بہت آسان تھی لیکن معلوم ہے۔ رحمۃ للعالمینؐ نے اس معروضہ کا کیا جواب دیا۔ ارشاد ہوا

اذا ملکت فاسجع — یعنی جب قابو پاؤ تو درگذر سے کام لو

عین جنگ کے وقت

جنگ خیبر کا واقعہ ہے کہ جب دوسرے اجل صحابہ یہ مرحلہ نہ سر کر سکے۔ تو سرور کائناتؐ نے علم فتح امیر المومنین حضرت علیؓ کے حوالہ کیا۔ اگرچہ آپ کا مزاج گرامی ناساز تھا۔ امیر المومنین نے پرچم ہاتھ میں لینے کے بعد سرور کائناتؐ سے دریافت فرمایا

کیا جنگ کرکے (ان) یہود کو مسلمان بنا لیا جائے؟

ارشاد ہوا

"نرمی اور ملاطفت کے ساتھ اسلام پیش کرو۔ ایک آدمی بھی اگر تمہاری تلقین سے مسلمان ہو جائے۔ تو یہ سرخ اونٹوں (مال غنیمت) سے بہتر ہے۔"

یہ ہدایت اس وقت دربار رسالت سے دی جا رہی ہے جب فاتح خیبر دشمن سے لڑنے کے لئے پرچم ہاتھ میں لے چکے ہیں۔

سزا یا انعام؟

یہود کے ساتھ آنحضرتؐ کا برتاؤ ہمیشہ لطف و مراعات کا رہا لیکن یہ ہمیشہ احسان فراموشی اور کور چشمی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ بنو نضیر ۴ھ میں خیبر کی طرف جلاوطن کئے گئے تھے۔ اس لئے کہ ان کی شرارتیں حد سے تجاوز کر گئی تھیں۔ اب یہ سرکار رسالتؐ کی جان کے گاہک ہو گئے۔ ایک مرتبہ ایک دیوار کے سایہ میں آپؐ کو بٹھا کر اوپر سے پتھر لڑھکانے کا پروگرام بنایا۔ لیکن وحی الٰہی نے آپؐ کو باخبر کر دیا۔ اور آپ بچ کر چلے آئے۔ اسی طرح بنی قینقاع کو مدینہ سے جلاوطن کرکے خیبر جانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن ان کے جان و مال سے عہد شکنی کے باوجود کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔

ہوا یہ تھا کہ انہوں نے ایک مسلمان عورت کو از راہ شرارت سر بازار برہنہ کر دیا۔ اور ایک غیور مسلمان نے جب اس یہودی کو جس نے یہ حرکت کی تھی سزا دی۔ تو اسے قتل کر دیا۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب رسول اللہ ؐ جنگ بدر میں مصروف تھے۔ واپسی پر آپ نے یہود سے اس شرارت اور عہد شکنی کی وجہ دریافت کی۔ یہود نے معاہدہ صلح کا کاغذ واپس کر دیا۔ اور جنگ کی تیاریاں علانیہ کرنے لگے۔ کیا جلاوطنی اتنے بڑے جرم کی ہلکی سے ہلکی سزا نہ تھی؟ کیا پیمان شکنوں اور سرکشوں، باغیوں اور فتنہ انگیزوں اور "اقلیت" کی شورہ پشتیوں کا جواب دنیا اسی طرح دیتی ہے؟ کیا اب بھی اتنی بڑی شورہ پشتی اور پیمان شکنی کا ایسا ہلکا جواب کوئی "غیر متشدد" ملک بھی دے سکتا ہے؟

زہر دینے والی عورت

خیبر میں جانے کے بعد یہودی اور شیر ہو گئے۔ یہاں بھی ان کی دراندازیوں اور شرارتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اسلام کے خلاف یہ بے وطن یہود سب سے بڑا مورچہ بن گیا تھا۔ پھر جب فاتح خیبر نے خیبر فتح کر لیا۔ اور یہاں کے فتنہ جو اور شر انگیز یہودی مسلمانوں کے محکوم بن گئے۔ تب بھی ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ برتی گئی۔ امن و امان اور عافیت کی زندگی بسر کرنے کا انہیں موقعہ دیا گیا —— لیکن محکوم بن جانے اور مسلمانوں سے امن کی نعمت حاصل کر لینے کے باوجود ان کا رویہ کیا تھا؟

ایک روز ایک یہودی خاندان نے آنحضرت ؐ اور کچھ مجاہدین کی دعوت کی۔ آپ ؐ نے دعوت استمالت اور تالیف قلوب کے خیال سے قبول فرما لی۔ لیکن ایک لقمہ کھایا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانے میں زہر ملا ہوا تھا۔ آنحضرت ؐ نے تفتیش کی۔ تو یہود نے اعتراف کیا کہ ہم نے یہ حرکت اس لئے کی تھی۔ کہ اگر آپ واقعی نبی ہیں تو زہر کا اثر نہ ہوگا۔ ورنہ آپ سے ہمیں نجات مل جائے گی۔ کھانے میں زہر ملانے والی

عورت کا نام زینب تھا۔ یہ مرحب کی بھاوج تھی۔ جو بڑا مشہور اور یکتائے زمانہ یہودی پہلوان تھا۔ اور جسے فاتح خیبر امیر المومنین حضرت علیؓ نے ہلاک کر دیا تھا۔

یہ بہت بڑا واقعہ تھا۔ سازش تھی۔ سازش کا اعتراف تھا۔ مجرمہ آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ لیکن کیا اسے سزا ملی؟ کیا وہ قید کر لی گئی؟ لوگوں کے اصرار کے باوجود آپؐ نے اسے کوئی سزا نہیں دی۔

آپؐ نے زینب کو کوئی سزا نہیں دی۔ اپنے لئے انتقام لینا آپ کو گوارا نہ تھا۔ حضرت عائشہ رضؓ کا یہ قول ایک تابندہ حقیقت ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔[1]

جب تک ثبوت نہ مل جائے......!

خیبر میں ایک مرتبہ یہودیوں نے دھوکہ دے کر ایک صحابی عبداللہ بن سہیل کو قتل کیا اور نہر میں ڈال دیا۔ مقتول صحابی کے ساتھی حضرت محیصہؓ نے آکر رسالتمآبؐ سے یہ ماجرا بیان کیا۔ لیکن چونکہ حضرت محیصہ اپنے دعوے کا کوئی ثبوت نہ دے سکے اس لئے آں حضرتؐ نے یہود سے نہ کسی قسم کی باز پرس کی نہ سزا دی۔

کافر کا مال

صحاح ستہ کی کتابوں میں سے ایک کتاب ابوداؤد میں ایک انصاری یہودی علاقہ کے سفر کی روایت کرتے ہیں جس کا واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرتؐ کے ساتھ ہم سفر میں تھے۔ بھوک معلوم ہوئی۔ مگر کچھ موجود نہ تھا کہ کھاتے۔ سامنے کچھ بکریاں نظر آئیں۔ انہیں پکڑ کے ذبح کر ڈالا۔ اور گوشت بنایا۔ اور ہانڈی پر چڑھا دیا۔ اتنے میں اس واقعہ کا رسالتمآبؐ کو علم ہوا۔ آپؐ تشریف لائے۔ دست مبارک

---

[1] بخاری نیز مسلم

میں کمان تھی۔ اسی سے ہانڈیاں الٹ دیں اور ارشاد فرمایا
"لوٹ کی چیز مردار سے زیادہ حلال نہیں!"

پروانۂ امن

فتح خیبر کے بعد یہود کو دربار رسالتؐ سے پروانۂ امن مل گیا۔ ایک مرتبہ کچھ مسلمانوں نے ——— جو ان کی شرارتوں اور مفسدانہ حرکتوں سے نالاں رہتے ہی تھے ——— بعض یہودیوں سے پھل اور جانور لوٹ لئے۔ آنحضرتؐ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ تو حسب روایت ابوداؤد آپؐ بے حد برہم ہوئے۔ تمام صحابہ کو مجتمع کیا اور فرمایا

ان اللہ تعالیٰ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب نسائھم ولا اکل ثمارھم؛

یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ بات تم پر حلال نہیں کی ہے۔ کہ اہل کتاب (کفار) کے گھروں میں ان کی بغیر اجازت داخل ہو جاؤ۔ یا ان کی عورتوں سے بد سلوکی کرو۔ یا ان کے پھل پھلاری کھاؤ (ابوداؤد)

پاس عہد

صلح حدیبیہ کے شرائط صلح میں ایک دفعہ یہ بھی تھی۔ کہ آنحضرتؐ اس سال بغیر حج کئے واپس چلے جائیں گے۔ آئندہ سال آسکتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے سال آپؐ ان تمام مسلمانوں کے ساتھ جو گذشتہ سال صلح کے موقع پر موجود تھے بڑے تجمل اور شکوہ کے ساتھ تشریف لائے۔ سب سے پہلے آپ نے معاہدہ کے مطابق بغیر کسی کی یاددہانی کے مکہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر بطن یاجج میں تمام ہتھیار رکھ دیئے۔ اور دو سو سواروں کو ان کی حفاظت پر مامور کر دیا۔ پھر مکہ تشریف لے گئے اور وہاں حسب معاہدہ تین دن مقیم رہے۔ رؤسائے قریش اسے گوارا نہیں

کر سکتے تھے۔ کہ مسلمانوں کو اسلامی طرز پر حج کرتے دیکھیں۔ وہ تین دن کے لیے کوہ بوقبیس کی چوٹی پر جا بیٹھے۔ جب یہ مدت گذر گئی۔ تو وہ آئے۔ اور انہوں نے امیر المومنین علی رض سے کہا

"تین دن پورے ہو چکے۔ محمدؐ سے کہہ دو اب جائیں"

پاس عہد کا اتنا خیال تھا۔ کہ آپ نے ابو رافع کو حکم دیا۔ تو انہوں نے کوچ کی ندا دی۔ اور کہا کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص وہاں شام نہ کرے[1]

جیسے ہی گوش مبارک تک یہ پیام پہنچا آپ اسی وقت مکہ سے چل پڑے

خالدؓ سے باز پرس

مکہ میں ۸ھ میں جب آپؐ کا فاتحانہ داخلہ ہوا۔ تو آپؐ نے ہر اس شخص کو امن عطا کر دیا تھا۔ جو جنگ نہ کرنا چاہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے کسی سے تعرض نہیں کیا۔ لیکن قریش کی ایک جماعت برسرپیکار ہو گئی۔ حضرت خالد بن ولید نے ترکی بترکی جواب دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حملہ آور ٹھہر نہ سکے۔ چند لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ آنحضرتؐ نے اس خیال سے کہ شاید حضرت خالد نے ہدایات نبوی کا لحاظ نہیں کیا اور کفار سے بھڑ گئے۔ خالد کو بلایا اور باز پرس فرمائی لیکن جب معلوم ہوا کہ پہل انہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ تو خاموش ہو رہے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ فتح و کامرانی کے عالم میں بھی کفار و مشرکین کی کتنی رعایت آپؐ کو مد نظر رہتی تھی۔

خطا کاروں سے درگذر

معاہدہ حدیبیہ کی تکمیل کے بعد آنحضرتؐ ابھی وہیں قیام پذیر تھے۔ کہ

---

[1] طبقات ابن سعد جزو ثانی

ایک دن کوہ تنعیم سے صبح منہ اندھیرے اسّی آدمیوں کا ایک قافلہ عین اس وقت جب مسلمان نماز میں مصروف تھے۔ انہیں قتل کر دینے کے ارادہ سے نیچے اترا یہ لوگ بجائے اس کے کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے۔ الٹے گرفتار کر لئے گئے۔ دنیا کے ہر آئین و دستور کی رو سے ان کی سزا قتل ہو سکتی تھی۔ اور اب ان کا قتل کر دینا صرف ایک اشارہ چشم کا محتاج تھا لیکن رحمۃ للعالمین نے ان خطا کا رعل پر رحم فرمایا۔ اور سب کو رہا کر دیا۔

صلح حدیبیہ

خود صلح حدیبیہ کا انعقاد اور نفاذ اس حالت میں ہوا کہ مسلمان اب پہلے سے بہت زیادہ طاقتور ہو چکے تھے۔ وہ کفار کا مقابلہ کر سکتے تھے انہیں شکست دے سکتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ جنگ پر صلح کو ترجیح دیتے تھے۔ لہذا آپؐ نے وہ شرائط تسلیم کر لئے۔ جو صرف ہارا ہوا حریف ہی تسلیم کر سکتا ہے۔ خود مسلمان ان شرائط کے تسلیم کر لینے سے بہت بد دل ہوئے۔ لیکن آپؐ نے نہ صرف ان شرائط کو قبول فرمالیا۔ بلکہ انہیں کامرانی کا پہلا مرحلہ قرار دیا۔ قرآن کریم نے اسے "فتح مبین" قرار دیا۔ اور بعد کے واقعات نے —— جن کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے یہ ثابت کر دیا۔ کہ واقعی یہ صلح "فتح مبین" تھی!

اس معاہدہ کی ضروری تاریخ یہ ہے

راوی کہتا ہے۔ پھر آپؐ نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو عہد نامہ لکھنے کے واسطے طلب کیا اور فرمایا لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سہیل نے کہا میں اس کو نہیں جانتا ہوں۔ یہ لکھو باسمک اللھم حضورؐ نے فرمایا اچھا یہی لکھو

طبری

چنانچہ حضرت علی رضؓ نے یہی لکھا۔ پھر آپؐ نے فرمایا یہ لکھو یہ وہ صلح نامہ ہے۔ جو محمد رسول خدا اور سہیل بن عمرو کے مابین طے ہوا۔ سہیل نے کہا۔ اگر میں آپ کو رسول خدا مانتا تو آپ سے کیوں لڑتا۔ بلکہ آپ اپنا اور اپنے والد کا نام لکھئے۔ آپ نے فرمایا یوں لکھو۔ کہ یہ وہ صلح نامہ ہے۔ جو محمد بن عبد اللہ اور سہیل بن عمرو کے مابین طے ہوا۔ یہ کہ دس برس تک جنگ نہ ہو۔ اور ایک دوسرے سے رکے رہیں۔ اور جو شخص قریش میں سے بغیر اجازت اپنے ولی کے محمد کے پاس جائیگا۔ محمد اس کو واپس کر دیں گے اور اگر محمد کا کوئی شخص قریش کے پاس چلا جائے گا۔ تو قریش اس کو واپس نہ کریں گے۔ اور جو شخص یہ چاہے کہ محمد کے عہد میں داخل ہو وہ محمد کے عہد میں داخل ہو جائے۔ اور جو قریش کے عہد میں داخل ہونا چاہے وہ قریش کے عہد میں داخل ہو بنی خزاعہ نے اس بات کے سنتے ہی کہا۔ کہ ہم تو محمد کے عہد میں ہیں۔ اور بنو بکر نے کہا ہم قریش کے عہد میں ہیں۔ اور اس بات پر عہد ہوا کہ آپؐ اس سال واپس تشریف لے جائیں۔ اور آئندہ سال اپنے اصحاب کے ساتھ آئیں۔ اور تلواروں کو میان میں کئے ہوئے تین روز مکہ میں رہیں اور بغیر تلواروں کے نہ رہیں۔

راوی کہتا ہے ہنوز یہ صلح نامہ لکھا ہی جا رہا تھا۔ کہ ابو جندل بن سہیل عمرو زنجیروں سے بندھے ہوئے حضور کی خدمت میں آئے اور مسلمانوں کی یہ حالت تھی۔ کہ پہلے تو بڑے شوق اور ذوق میں حضور کے خواب کی خبر سن کر کی زیارت اور فتح کی امید سے آئے تھے۔ اب جو حضورؐ کو اس طرح صلح کر کے واپس ہوتے دیکھا۔ تو مسلمان بہت ہی افسردہ دل ہو گئے تھے۔ قریب تھا۔ کہ اس رنج سے ہلاک ہو جائیں۔

سہیل بن عمرو نے جو اپنے بیٹے ابو جندل کو کھڑا دیکھا۔ ایک طمانچہ ان کے

منہ پر مارا اور حضور سے کہا اے محمدؐ! میرے تمہارے درمیان میں قضیہ اس کے آنے سے پہلے فیصل ہو چکا ہے یعنی ابو جندل کو تمہارے ساتھ آنے نہ دوں گا۔ آپ نے فرمایا تو سچ کہتا ہے [1]

مزید مہلت

فتح مکہ (۸ھ) کے بعد بھی وہ معاہدے جو کفار و مشرکین کے ساتھ آنحضرتؐ نے کئے تھے قائم رہے۔ ایک سال یعنی ۹ھ تک یہی کیفیت رہی لیکن اس لطف عام سے کفار و مشرکین نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا وہ برابر فتنہ انگیزی اور مفسدہ پردازیوں میں مصروف رہے۔ آخر سورہ برأت نازل ہوئی۔ اور آنحضرتؐ نے خود کفار و مشرکین کے نقض عہد کے باعث وہ معاہدات منسوخ فرما دیئے لیکن منسوخی کی تاریخ چار مہینے آگے کی رکھی یعنی اعلان کے چار ماہ بعد معاہدات منسوخ ہوں گے ——— گویا چار ماہ کی مہلت اور انہیں دی گئی! حالانکہ جب خود ان کی طرف سے عملاً عہد شکنی ہو چکی تھی۔ تو اب اصولاً اور قانوناً اور اخلاقاً کسی مہلت کی ضرورت نہ تھی!

صرف خدا کے لئے

کفار اور مشرکین کے ساتھ جو عہد کیا جاتا تھا لفظاً و معناً اس کی زیادہ سے زیادہ پابندی کی جاتی تھی۔ بلکہ ایسی ذمہ داریاں بھی اپنے اوپر عائد کر لی جاتی تھیں جن کی بجا آوری کسی طرح بھی ضروری اور لازمی نہیں تھی۔

کفار سے حدیبیہ کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ بلکہ اس معاہدہ پر دو سال کی مدت گذر چکی تھی۔ کہ آپ کو اطلاع ملی۔ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے آ رہا ہے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام

قبیلہ جہینہ کی طرف سے اندیشہ تھا۔ کہ یہ حملہ آور نہ ہو۔ آنحضرتؐ نے اس قافلہ کی حفاظت کے لئے تین سو مجاہدوں کا ایک دستہ روانہ فرمایا۔ جس کی سرداری حضرت ابوعبیدہ رضؓ کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں نے مشرکوں کے اس قافلہ کی حفاظت کا کام اس طرح سرانجام دیا کہ جب رسد ختم ہوگئی۔ تو ایک ایک چھوہارے پر سارا دن گذار دیا۔ لیکن فرض کی بجاآوری سے غافل نہ ہوئے۔ اور یہ وہ فرض تھا جس کی داد صرف خدا ہی دے سکتا تھا۔ نہ ان مشرکوں کی طرف سے کوئی صلہ تھا نہ ان کے حامیوں اور مددگاروں کی طرف سے[1]

کفّار کا سفیر

قریش کی طرف سے ایک مرتبہ ایک صاحب ابورافع قاصد کی حیثیت سے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جمال نبوت دیکھتے ہی زنگ کفر و شرک آئینۂ دل سے محو ہوگیا۔ مسلمان ہوگئے اور قریش کے پاس جانے سے انکار کردیا۔ لیکن آپؐ نے فرمایا۔ تمہیں واپس جانا پڑے گا۔ کیونکہ ہم قاصد کو نہیں روک سکتے۔ یہ بات خلاف اصول ہے اس وقت چلے جاؤ۔ پھر شوق سے واپس آجانا۔ چنانچہ حضرت ابورافعؓ بادل ناخواستہ واپس گئے[2]

ایفاء عہد!

عین اس وقت جب بدر کی جنگ ہورہی تھی۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں لشکر کفار کہیں زیادہ تھا۔ دو مسلمان کسی نہ کسی طرح کفار کی زد سے بچ کر دربار رسالتؐ میں پہنچے اور شریک جنگ ہونے کے لئے مچل گئے۔ انہیں راستہ میں کافروں نے پکڑ لیا تھا اور اس شرط پر چھوڑا تھا۔ کہ آئندہ مسلمانوں کے

---

[1] طبقات ابن سعد [2] ابوداؤد

ساتھ مل کر کافروں سے جنگ نہیں کریں گے۔ اور یہ وعدہ ان لوگوں نے صرف اس لئے کر لیا تھا۔ کہ یہاں وقت نہ ضائع ہو۔ ایسے غیر منطقی وعدے خود ہی باطل ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپؐ نے انہیں شرکت جنگ کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے کہ وعدہ کی پابندی اور اس کا ایفاء ایک مسلمان کے لئے بہر حال ضروری ہے:۔

مؤثر تہدید

جنگ کے اخلاقیات عام نظام اخلاق سے بالکل الگ اور جدا ہوتے ہیں۔ جو بات عام حالات میں جائز نہیں ہوتی۔ وہ جنگ کے دوران میں ثواب بن جاتی ہے قومی حکومتیں اپنے عوام پر اختیارات حاصل کر لیتی ہیں۔ کہ جس چیز پر چاہیں، قبضہ کر لیں کسی کو مجال دم زدن نہیں ہوتی۔ اور اگر کہیں دشمن کی کوئی چیز ہاتھ آ جائے تو وہ بغیر کسی تامل کے اپنی ہی ہوتی ہے ——— لیکن کیا اسلام کا جہاد اسے جائز رکھتا ہے؟ کیا دنیا کے سب سے بڑے مجاہد نے اسے گوارا کیا ہے؟ کیا اسلام میں اس کی گنجائش ہے؟ حضرت معاذ بن انس روایت فرماتے ہیں۔ کہ ایک غزوہ میں حضورؐ کے ساتھ میں بھی تھا۔ (ہم) لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ میں جا کر انہیں تنگ کیا، لوٹ مار کی۔ (فبعث النبی صلے اللہ علیہ وسلم منادیاً ینادی فی الناس ان من ضیق بیوتاً وقطع طریقاً فلا جہاد لہ) تو رسول اللہ نے ایک منادی بھیجا۔ جو پکار رہا تھا۔ کہ جو لوگوں (دشمنوں) کو گھروں میں تنگ کرے۔ یا لوٹ مار کرے۔ تو اس کا جہاد جہاد نہیں ہے ——— کیا اس تہدید سے بڑھ کر بھی کوئی تہدید مؤثر اور کارگر ہو سکتی تھی؟

دشمن مسجد نبوی میں

طائف کا ایک دور وہ تھا۔ کہ آنحضرتؐ تبلیغ اسلام کے لئے پہنچے تو آپؐ کو لہولہان کر دیا گیا۔ دوسرا دور یہ تھا۔ کہ دشمن (طائف) اسلام کی قوت سے مرعوب

ہو چکا تھا۔ اور یہ سوچنے لگا تھا۔ کہ اس سیلِ رواں سے ہم کیونکر بچ سکیں گے؟ چنانچہ اہل طائف کا ایک وفد بارگاہِ رسالت میں پہنچا۔ اس وفد کا رئیس عبدیالیل تھا۔ آنحضرتؐ نے جب پہلی مرتبہ طائف میں قدم رکھا تھا۔ تو یہی عبدیالیل آپ کی ایذا رسانی میں پیش پیش تھا۔ اور آج ایک وفد کا رئیس بن کر جھکی ہوئی گردن اور جھکی ہوئی آنکھ کے ساتھ حاضرِ دربار تھا۔

لیکن معلوم ہے۔ اس بدترین۔ بدتہذیب اور آزار رساں دشمن کے ساتھ رسول اللہؐ نے کیا برتاؤ کیا؟ اس کافر کو آنحضرتؐ نے دنیا کے سب سے مقدس مقام مسجد نبوی میں اتارا۔ صرف اسی کو نہیں، اس کے ساتھیوں کو بھی۔ صحن مسجد میں خیمے نصب کرائے گئے۔ اور یہ لوگ سب نبی ال اس میں ٹھہرا دیئے گئے ——— ! پھر ان کے ساتھ لطف و مراعات کا برتاؤ کیا گیا۔

عیسائیوں کی نماز مسجد نبوی میں

اسی طرح جب نجران (مضافات یمن) کے عیسائیوں کا ایک وفد باریاب ہوا۔ تو اسے بھی آپؐ نے مسجد نبوی کا مکین بنایا۔ یہی نہیں۔ بلکہ جب مسیحی عبادت کا وقت آیا۔ اور ان لوگوں نے مسجد میں اپنی نماز ادا کرنی چاہی۔ تو صحابہ کرامؓ نے منع کیا۔ لیکن رسالت مآبؐ نے اجازت مرحمت فرمادی۔ یہود کا اسلام اور داعئ اسلامؐ کے ساتھ کیا رویہ تھا۔ یہ بات گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے اچھی طرح واضح ہو چکی ہے۔ یہود بھی نجرانی عیسائیوں سے ملنے مسجد نبوی میں آیا کرتے تھے۔ اور گھنٹوں بات چیت کیا کرتے تھے۔ ان کی آمد پر بھی کبھی کسی طرح کی پابندی عاید نہیں کی گئی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں جب نصاریٰ کا گروہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ یہ لوگ بہت عمدہ لباس سے آراستہ تھے بعض صحابہ جنہوں نے ان کو دیکھا تھا۔ فرماتے ہیں۔ ہم نے ان کے بعد کوئی ایسا گروہ نہیں

نہیں دیکھا۔ جس وقت یہ لوگ آئے ہیں۔ آپؐ عصر کی نماز پڑھ کر بیٹھے تھے۔ ان کی نماز کا بھی وقت آیا۔ یہ مسجد ہی میں نماز پڑھنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا ان کو نماز پڑھنے دو کچھ نہ کہو۔ ان لوگوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔[1]

نجران کے عیسائیوں سے دائمی معاہدہ

نجرانی عیسائیوں کا یہ وفد اس لئے نہیں آیا تھا۔ کہ اسلام قبول کر لے۔ بلکہ اس لئے آیا تھا۔ کہ اسلام کی سیاسی بالادستی تسلیم کر لے۔ چنانچہ وفد کو آنحضرت صلعم کی طرف سے جو ضمانت (ASSURANCE) دی گئی۔ اس کے چند الفاظ خاص طور پر اپنے زور و اثر کے لحاظ سے غور طلب ہیں۔ نجران جوار اللّٰہ وذمۃ محمد النبی علی انفسہم وملتہم وغائبہم وشاہدہم وعشیرتہم وتبعہم وان لا یغیر حق من حقوقہم ولا ملتہم ولا یغیر کل ما تحت ایدیہم من قلیل او کثیر و لیس علیہم ربیۃ ولا دم جاہلیۃ ولا یحشرون ولا یعشرون ولا یطاء ارضہم الجیش

"یعنی نجران کے عیسائیوں کو خدا اور اس کے رسول محمدؐ کا ذمہ حاصل ہوگا۔ ان کی جان، مذہب، زمین اور جائداد کے بارے میں ان تمام لوگوں کو جو یہاں، حاضر ہیں یا یہاں سے، غائب ہیں قبیلہ والے ہیں یا پیروکار، ان کے کسی حق میں تغیر نہیں کیا جائے گا جو کچھ ان کے قبضہ اور تصرف میں ہے۔ خواہ کم ہو یا زیادہ۔ اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ گذشتہ دور کے شبہات یا قتل کے معاملات میں وہ ماخوذ نہ کئے جائیں گے۔ نہ وہ بیگار میں پکڑے جائیں گے۔ نہ ان کے علاقہ کی زمین سے اسلامی فوج گذرے گی:"—————— کیا اس سے بڑا بھی کوئی ذمہ ہو سکتا ہے؟

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ اول

پھر جب یہ وفد جانے لگا۔ تو اس نے پھر ایک تحریر آنحضرت صلعم سے اپنے دین، معابد اور شعائر دین کے بارے میں حاصل کی، جو حسب ذیل ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ من محمد النبی للاسقف ابی الحارث واساقفۃ نجران وکھنتھم ورھبانھم واھل بیعتھم ورقیقھم وملتھم وسوقتھم وعلی کل ما تحت ایدیھم من قلیل وکثیر جوار اللہ ورسولہ لا یغیر اسقف من سقفیہ ولا راھب من رھبانیتہ ولا کاھن من کھانیتہ ولا یغیر حق من حقوقھم ولا سلطانھم ولا مما کانوا علیہ علی ذلک جوار اللہ ورسولہ ابدا۔

"یعنی محمد رسول اللہ کی طرف سے اسقف ابو حارث، اور نجران کے دوسرے پادریوں اور راہبوں، ان کے رفیقوں، اہل بیت اور غلاموں کو یہ یقین دلایا جاتا ہے۔ کہ جو کچھ ان کے قبضہ اور تصرف میں ہے۔ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔ سب کو خدا اور اس کے رسول م کا ذمہ حاصل ہوگا۔ کسی راہب یا کاہن کے حق میں یا اختیار و منصب میں کچھ ردو بدل نہیں کیا جائے گا۔ ان کی موجودہ حالت بغیر کسی تغیر کے خدا اور اس کے رسول م کے ذمہ میں دائماً باقی رہے گی"[1]

اس تحریر میں دائماً کا لفظ دیکھیے۔ اللہ اور اس کے رسول ؐ کا ذمہ دیکھیے۔ پادری کاہن اور راہب کے حق و سلطان کا اسلام کی طرف سے تسلیم ہونا دیکھیے ——— کیا یہ رواداری کی انتہا نہیں ہے؟

جان بخشی

مسند ابن حنبل کی روایت ہے۔ کہ ایک مرتبہ ایک شخص گرفتار کر کے سرکار

[1] طبقات ابن سعد جزو ثالث

رسالتؐ کے سامنے لایا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ یہ تاک میں تھا کسی طرح موقع ملے تو سرورِ کائناتؐ پر قاتلانہ حملہ کرے۔ آپ نے ملزم کو دیکھ کر فرمایا

اسے چھوڑ دو

وہ چھوڑ دیا گیا

نہ کوئی تنبیہ نہ تہدید، نہ سرزنش، نہ تعزیر، نہ سزا، نہ عقوبت۔ حالانکہ مستحق قتل کا تھا؛

یہودی قرضخواہ

مسند احمد بن حنبل کی یہ روایت بھی ہے کہ ایک صحابی ابو صدرد ایک یہودی کے مقروض تھے۔ یہودی نادہندگی کے الزام میں انہیں لے کر دربارِ رسالتؐ میں آیا۔ آنحضرتؐ کے استفسار پر انہوں نے اپنی مجبوری اور معذوری بیان کی، لیکن آپؐ نے فرمایا

"قرض فوراً ادا ہونا چاہیے"!

یہ سن کر صحابیٔ رسولؐ نے جو تہبند باندھے ہوئے تھے۔ زرِ قرض کے معاوضہ میں یہودی کو پیش کر دیا۔ اور جو عمامہ سر پہ تھا اسے تہبند بنا لیا؛

کافر مہمان

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک کافر سرورِ کائناتؐ کا مہمان ہوا۔ آپؐ نے ایک بکری کا دودھ اسے پلایا۔ وہ سب کا سب پی گیا (مگر سیر نہ ہوا) آپؐ نے یکے بعد دیگرے سات بکریوں کا دودھ اسے پلایا۔ یہاں تک کہ وہ سیر ہو گیا؛

یہودی کی آنحضرتؐ سے بدتمیزی

مالی پریشانیوں کے باعث آنحضرتؐ کبھی کبھی قرض لے لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک یہودی زید بن سعنہ اپنی رقم کے تقاضہ کے لئے پہنچا۔ حالانکہ میعاد میں

ابھی چند دن باقی تھے۔ لیکن اس نے گستاخی اور بدتمیزی کے ساتھ تقاضہ شروع کیا۔ حضرت عمرؓ موجود تھے۔ وہ اپنے غصہ کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ اسے ڈانٹا۔ تو آنحضرتؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا:۔

"تمہیں چاہیئے تھا کہ اسے سمجھاتے۔ نرمی سے تقاضہ کرو۔ اور مجھ سے کہتے کہ قرض ادا کر دو"!

پھر فرمایا

عمرؓ! تم اس کا قرض زبیرؓ کی طرف سے بیباق کر دو۔ اور بیس صاع کھجور مزید (اس سخت کلامی کا تاوان) دے دو۔

یہ تھا سلوک سرورِ کائنات ﷺ کا ایک ایسے شخص کے ساتھ جس کی جان و مال عزت آبرو سب آپؐ کے قبضہ میں تھی۔

خبردار ——— !

مسند ابن حنبل کی ایک روایت میں ہے کہ ایک دفعہ ایک غزوہ میں مشرکین کے کچھ بچے بیچ میں آکر ہلاک ہو گئے۔ آپ ﷺ کو یہ خبر ملی۔ تو بہت مغموم و متاثر ہوئے ایک صحابی نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ ﷺ! وہ بچے مشرکین ہی کے تو تھے"!

ارشاد ہوا

"مشرکین کے بچے تم سے بہتر ہیں۔ خبردار بچوں کو قتل مت کرو۔ خبردار بچوں کو قتل مت کرو"

حلیف مشرکوں کے لئے

۶ھ میں صلح حدیبیہ کا عہدنامہ تحریر ہوا تھا۔ ۸ھ میں ایک واقعہ ایسا ہوا کہ آنحضرتؐ کو مکہ پر فوج کشی کا عزم کر لینا پڑا۔ لیکن یہ عزم مسلمانوں کے وقار اور تحفظ

کی خاطر نہیں مشرکین کے تحفظ اور دفاع کی خاطر فرمایا گیا۔

عہد نامۂ حدیبیہ کی ایک شرط یہ تھی۔ کہ قبائل میں جو چاہیں مشرکین کے حلیف بن جائیں۔ اور جو چاہیں رسول اللہؐ سے پیمان دوستی استوار کرلیں۔ چنانچہ بنو بکر نے قریش سے دوستی کرلی۔ اور بنو خزاعہ نے رسول اللہؐ سے۔

۸ھ میں بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کیا۔ قریش خلاف عہد نہ صرف یہ کہ بنو بکر کی اس کارروائی میں مزاحم نہ ہوئے۔ بلکہ انہوں نے بنو خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی مدد کی۔ اور انتہا یہ کہ خود خزاعہ پر حملہ آور ہوئے۔ اور ان کو مدد دینے والوں میں سہیل بن عمرو بھی تھا۔ یہ وہی شخص تھا۔ جس نے قریش کا نمائندہ بن کر صلح نامہ حدیبیہ پر دستخط کئے تھے ——— ان لوگوں نے بڑی سنگدلی سے بنو خزاعہ کو ہلاک کیا نقصان پہنچایا۔ لوٹا مارا۔ بچے کھچے لوگ فریاد کناں دربار رسالتؐ میں حاضر ہوئے[1] آپ اس بدعہدی اور بنو خزاعہ کی اس تباہی و بربادی اور ہلاکت سے بہت متاثر ہوئے۔ اور مکہ پر فوج کشی کا عزم فرما لیا۔ کہ اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا تھا ——— رواداری کی یہ مثال آج بھی اتنی ہی تابندہ ہے۔ جتنی آج سے چودہ سو برس پہلے تھی۔

تفصیل آگے آئے گی۔

دانت توڑنے کی اجازت

جنگ بدر کے قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو بھی تھا۔ دشنام طراز، بد گو، بدزبان، بے لگام یہ اپنی طلاقت لسانی کا مصرف یہ سمجھتا تھا۔ کہ جہاں تک ہو سکے آپؐ کی برائیاں بیان کرے۔ اور لوگوں میں آپؐ کو مطعون کرے۔ حضرت عمرؓ اس

---

[1] طبری و سیرت ابن ہشام

سے بہت خفا تھے۔ جب اس کی رہائی کا وقت آیا۔ تو انہوں نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا:۔

یا رسول اللہ، مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں اس کے اگلے دانت توڑ ڈالوں۔ اور اس کی زبان مسل ڈالوں۔ تاکہ یہ کسی جگہ آپ صلعم کی برائی بیان نہ کرے۔ آپ صلعم نے فرمایا نہیں، اس سے کیا فائدہ؟ شاید یہ کسی مجلس میں ایسی باتیں بھی کرے جو تم کو بری نہ معلوم ہوں [1] اور وہ صحیح سلامت، کفار قریش میں واپس چلا گیا۔

بدر کے جنگی قیدی

جنگ بدر میں جو قیدی ہاتھ آئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے۔ جو اعدائے اسلام اور مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے۔ یہ موقع تھا۔ کہ ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جس کے یہ مستحق تھے۔ اور یہ خود بھی دل میں سہمے ہوئے تھے جانتے تھے جنہیں ہمیشہ ستاتے رہے ہیں۔ آج ان کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟ کیسی گذرتی ہے؟

لیکن ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا؟

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ جب آپ صلعم قیدیوں کو لائے۔ تو ان کو اپنے اصحاب میں تقسیم کر دیا۔ اور فرمایا ان کو کچھ تکلیف نہ دینا۔ اچھی طرح سے رکھنا۔ بدر کے قیدیوں میں سے ایک قیدی ابو عزیز کا بیان ہے۔ کہ جب بدر سے ہم قیدیوں کو لے کر چلے ہیں۔ تو میں انصار کے چند لوگوں میں مقید تھا۔ اور جب کھانے کا وقت ہوتا تو مجھ کو روٹی کھلاتے اور آپ کھجوروں پر گذارہ کرتے۔ ان میں سے جس کے ہاتھ کوئی روٹی کا ٹکڑا لگتا۔ وہ تک مجھ کو دے دیتا۔ مجھے روٹی کھاتے ہوئے شرم آتی میں

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ اول

واپس کردیتا۔ مگر وہ اس کو ہاتھ تک نہ لگاتے اور روٹی مجھی کو کھانی پڑتی[1]

کافر کی رعایت

جنگ بدر میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا۔ کہ ابوالبختری حتی الامکان ہلاک نہ کیاجائے۔ گرفتار کر لیا جائے۔ آپ اس کے ساتھ سلوک فرمانا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ کافر ہونے کے باوجود وہ ضرر رساں نہ تھا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ ابوالبختری کے قتل کرنے سے آپ نے اس واسطے منع فرمایا تھا۔ کہ یہ حضور کی مکہ میں حمایت کیا کرتا تھا۔ اور کبھی حضور کی نسبت ایسی بات نہیں کی۔ جو حضور کو ناگوار ہوتی[2]

بنونضیر کس طرح جلاوطن ہوئے

بنی عوف بن خزرج میں سے بعض منافقین نے جن میں عبداللہ بن ابی بن سلول اور ودیعہ بن مالک بن ابی توفل اور داعس اور سوید وغیرہ لوگ تھے انہوں نے بنی نضیر سے کہلا بھیجا تھا۔ کہ اگر تم مسلمانوں سے جنگ کرو گے۔ تو ہم تمہارے ساتھ جنگ میں شریک ہوں گے۔ اگر تم یہاں سے اپنا گھر بار چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔ چنانچہ اسی بھروسہ پر بونضیر کئی دن قلعہ بند رہے آخر جب ان منافقوں نے ان کی کچھ مدد نہ کی۔ اور وہ لاچار ہوئے آپ سے انہوں نے کہلا بھیجا۔ کہ اگر آپ ہماری جان بخشی کریں اور یہ اجازت دیں۔ کہ جس قدر مال ہم میں سے اونٹوں پر لے جایا جا سکے لے جائیں۔ تو ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ آپ نے اس بات کو منظور فرمایا۔ اور وہ اپنا کل مال و اسباب اونٹوں پر لاد کر لے گئے یہاں تک کہ اپنے مکانوں کے کواڑ اور چوکھٹ بھی لے گئے۔ اور مکانوں کو اپنے ہاتھوں

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ اول [2] سیرت ابن ہشام حصہ اول

سے توڑ پھوڑ گئے۔ بعض لوگ تو ان میں سے ملک شام میں چلے گئے۔ اور بعض خیبر میں جا بسے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ بنی نضیر اپنے مال، اولاد، عورتوں کو لے کر روانہ ہوئے۔ اور ان کی عورتیں گیت گاتی اور دف بجاتی جاتی تھیں۔ اور ایک عورت ان میں عروہ بن ورد عبسی کی بیوی نہایت صاحب جمال عورت تھی۔ کہ اپنی نظیر زمانہ میں نہ رکھتی تھی۔[1]

اور ایک جلاوطنی کا منظر ہم سنہ ۱۹۴۷ء سے اب تک دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ جو ہمارے دیس اور ہمارے پڑوس میں بروئے کار آئی۔ وہ یہود کتنے خوش قسمت تھے۔ کہ اپنا مال بھی لے گئے، بال بچے بھی۔ اور ان لوگوں کی بدقسمتی کا کیا ٹھکانہ جنہوں نے جنگ نہیں کی۔ مگر جلاوطنی پر مجبور کئے گئے۔ اور کچھ بھی جان حزین کے سوا اپنے ساتھ نہ لا سکے۔

یہودی کی دعوت

انس سے مروی ہے۔ کہ ایک یہودی نے جو کی روٹی اور چربی پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تو آپ نے قبول فرمائی[2]

شرارت کا جواب

جب آپ بنی نضیر کے پاس بنی عامر کے مقتولوں کی بابت گفتگو کرنے تشریف لے گئے۔ جن کو عمرو بن امیہ ضمری نے قتل کر دیا تھا۔ یہود نے آپس میں صلاح کی۔ کہ آج سے بہتر کوئی دن قابو کا نہ ملے گا۔ کوئی شخص ایک بڑا پتھر لے کر فلاں مکان کی چھت پر بیٹھ جائے۔ اور محمد پر اس پتھر کو ڈال دے۔ تاکہ ان کے مرنے سے ہم کو راحت نصیب ہو۔ چنانچہ عمرو بن جحاش بن کعب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ آپ کو اس کی خبر ہوگئی۔ آپ وہاں سے تشریف لے آئے۔[3] بغیر اس

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ دوم [2] طبقات ابن سعد جز دوم [3] سیرت ابن ہشام حصہ اول

کے کہ آپ نے کوئی سزا دی ہو اس سازش کی۔

تفرقہ انداز کو معافی

ابن اسحاق کہتے ہیں، مرشاس بن قیس نام ایک بوڑھا یہودی شخص مسلمانوں سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ اور اس نے مسلمانوں کی باہمی الفت اور محبت دیکھی (حالانکہ حالت کفر میں یہ ایک دوسرے کے دشمن تھے) تو یہ بات بہت ناگوار گذری۔ چنانچہ اس نے ایک نوجوان یہودی سے کہا، مسلمانوں میں بیٹھ کر بعاث کی لڑائی کا ذکر کیا کر اور وہ اشعار پڑھا کر جو اس جنگ کے متعلق شاعروں نے کہے ہیں۔ یہ جنگ اوس اور خزرج کے درمیان ہوئی تھی اور دونوں قبیلوں کے سردار قتل ہو گئے تھے۔ اس نوجوان یہودی نے مسلمانوں میں بیٹھ کر یہی ذکر چھیڑا۔ مسلمان یعنی اوس و خزرج ایک دوسرے پر اپنا فخر ظاہر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ باہمی سخت کلامی واقع ہوئی۔ اور آخر ہتھیار لگا لگا کر جنگ کے واسطے میدان میں آن موجود ہوئے۔ یہ خبر آپ کو پہنچی۔ آپ اسی وقت اپنے صحابہ کے ساتھ معرکہ میں تشریف لائے۔ اور فرمایا اے مسلمانو، یہ کیا حرکت ہے۔ جاہلیت کے دعوے کرتے ہو۔ حالانکہ میں تمہارے اندر موجود ہوں۔ حالانکہ خدا نے تم کو ہدایت کی اور اسلام کی بزرگی بخشی اور جاہلیت کی سب باتیں تم سے قطع کر دیں۔ اور آپس میں محبت اور الفت قائم کر دی۔ اس وقت دونوں گروہوں کو معلوم ہوا کہ یہ ایک شیطانی وسوسہ تھا جس میں ہم مبتلا ہو گئے۔ پھر وہ رونے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے لگے۔ پھر آپ کے ساتھ چلے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے بخیر و عافیت مرشاس کے شر کو دفع کیا۔ اور مرشاس کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی

قل یا اهل الکتاب لم تکفرون بآیات اللّٰه واللّٰه شهید علی ما تعملون - قل یا اهل الکتاب لم تصدون عن سبیل اللّٰه من آمن تبغونها عوجا و انتم شهداء وما اللّٰه بغافل عما تعملون ۱؎

۱؎ سیرت ابن ہشام حصہ اول

سرورِ کائنات کا رویہ منافقوں سے

کھلے ہوتے دوست اور کھلے ہوئے دشمن کے ساتھ طرزِ عمل متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی یہ دوست ہے وہ دشمن ہے۔ دوست اس لئے ہے کہ موردِ لطف و کرم بنے اور دشمن اس لئے ہے کہ اسے ترکی بترکی جواب دیا جائے لیکن دشمن کی ایک قسم اور ہوتی ہے یہ قسم ہے منافقوں کی یہ اپنے تئیں دوست ظاہر کرتے ہیں دوستی کا دعویٰ کرتے ہیں پیمانِ رفاقت بڑے زور شور سے استوار کرتے ہیں لیکن درپردہ دشمن ہوتے ہیں۔ دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں، ہر وقت تخریب کے درپے رہتے ہیں، سازش کرتے ہیں، نقصان پہنچاتے ہیں تباہ و برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ یہ دشمن کی سب سے بدترین، خطرناک، اور ناقابلِ برداشت قسم ہے ایسے لوگ جب بے نقاب ہو جائیں تو انہیں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے درگذر نہیں کیا جا سکتا، ان پر لطف و کرم کی بارش نہیں کی جا سکتی، انہیں موردِ مہر و کرم نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ صرف اس

قابل ہوتے ہیں۔ کہ جہاں ملیں کچل دیئے جائیں، جہاں ان کا سراغ لگے، پامال کر دیئے جائیں، جب یہ ہاتھ آئیں، ان کے جسم و جان کا رشتہ بے تامل منقطع کر دیا جائے۔ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی یہی ہوتا تھا۔ دور تاریخ کے آغاز میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اور اب کہ دنیا عمرانیت اور حضارت کے اوج کمال پر ہے، یہی اصول کارفرما ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بغیر اس تطہیر کے کام بھی نہیں چل سکتا۔ نہ نظم قائم ہو سکتا ہے۔ نہ امن بحال ہو سکتا ہے۔ نہ دوستوں کی شناخت ہو سکتی ہے۔ نہ دشمنوں سے نجات مل سکتی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ آقائے دو جہاں نے منافقوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ ان کا کس طرح قلع قمع کیا؟ ان سے کیوں کر نجات حاصل کی؟ انہیں کیسی عبرت انگیز اور لرزہ خیز سزائیں دیں ——————؟

اس سلسلہ میں چند واقعات خاص طور پر اس قابل ہیں۔ کہ پیش نظر رہیں تاکہ عہد رسالت کی صحیح تصویر آپ کے سامنے آجائے۔ اور رسالت آب صلعم کے کردار، اخلاق اور صفات و سیرت کا واضح خاکہ متعین ہو جائے۔

منافق کا وار

غزوۂ احد تاریخ اسلام میں اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑی فیصلہ کن جنگ ہے کفار قریش نے اس لڑائی کا بڑی تیاریوں کے ساتھ انتظام کیا۔ بدر میں انہیں جو شکست فاش ہوئی تھی، اس کا بدلہ لینے کے لئے وہ بے چین تھے سرداران قریش جو اس جنگ میں ہلاک ہوئے تھے، ان کے متعلقین ایک خوفناک جنگ کے لئے سر بکف ہو چکے تھے۔ قریش کے کاروان تجارت کا جو نفع جمع ہو رہا تھا۔ طے ہوا کہ اسے جنگی تیاریوں پر صرف کر دیا جائے۔ اور یہ تجویز بڑی گرمجوشی اور مسرت کے ساتھ منظور کر لی گئی۔

آنحضرت صلعم اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا نہیں فرماتے تھے لیکن اگر جنگ مسلط

کر دی جائے۔ تو پھر میدان جنگ آپؐ کا مرغوب ترین مقام بن جاتا تھا۔ جب آپؐ کو قریش کی تیاریوں کا علم ہوا۔ تو آپؐ نے بھی جتنی اور جیسی کچھ تیاریاں ممکن تھیں، شروع کر دیں لیکن یہ تیاریاں ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں۔ کہ یک بیک قریش کا لشکر نمودار ہو گیا۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر اس نے احد پر پڑاؤ ڈال دیا۔ تعداد لشکر کے بارے میں آپ نے تحقیق کی تو معلوم ہوا بہت زیادہ ہے۔ یہ اندیشہ تھا کہیں قریش کا لشکر بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ چنانچہ ہر طرف چوکی پہرے کا انتظام کیا۔ مسجد نبویؐ کے دروازے پر دو صحابی رات بھر مسلح کھڑے پہرہ دیتے رہے۔ دوسرے دن اصبح مشورہ ہوا۔ کچھ لوگوں نے یہ رائے دی کہ شہر میں قلعہ بند ہو کر لڑا جائے۔ جن کی رائے یہ تھی۔ کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ پہلی رائے دینے والوں میں عبداللہ بن ابی بھی تھا۔ بہت بڑا منافق تھا اور منافقوں کا سردار بھی۔ بحث و مباحثہ کے بعد آنحضرتؐ نے دوسری رائے قبول فرمائی۔ اور بعد نماز جمعہ ایک ہزار سرفروشوں کے ساتھ بارادۂ جنگ شہر سے باہر نکلے۔ ان ایک ہزار لوگوں میں تین سو عبداللہ کے آدمی تھے۔ وہ تھوڑی دور ساتھ چلنے کے بعد اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ اس نے کہا:-

جب محمدؐ نے میری رائے نہ مانی تو میں ان کا ساتھ کیوں دوں؟

غور کر لیجئے یہ کتنا بروقت نفسیاتی وار تھا۔ جو اس منافق نے لشکر اسلام پر کیا تھا۔ مسلمان ایک ہزار سے سات سو رہ گئے۔ ان باقی ماندہ سات سو نفوس پر تین سو کے یکبیک الگ ہو جانے کا کیا اثر پڑنا چاہیئے تھا؟ لیکن آپؐ کو خدا پر بھروسہ تھا۔ آپؐ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ یہی سات سو جان نثار لے کر ایک بڑے لشکر کے مقابلہ کو نکلے۔ اور بالآخر خدا نے فتح عطا فرمائی۔ عبداللہ کو اس حرکت کی سزا یہ ملی۔ تمام عمر ... وہیں

کے مطابق دے سکتے تھے اور جنگ اُحد کے خاتمہ کے بعد تو بڑی آسانی سے ایسے نازک وقت میں دھوکہ دے کر الگ ہو جانے والے تین سو آدمیوں کو نہیں تو ان کے سردار کو ضرور موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ کچھ نہ ہوا۔ نہ منافقین کو کوئی سزا دی گئی۔ نہ ان کے سردار عبداللہ کے ساتھ کسی طرح کا منتقمانہ رویہ اختیار کیا گیا۔

منافق کی سازش

یہودیوں کا اسلام اور داعیِ اسلام کے ساتھ جو معاندانہ، باغیانہ اور سرکشانہ رویہ تھا۔ اسے تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے۔ وہ صلح و سلام کے ہر عہدنامے کو ردّی کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ لڑنے مرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ کسی موقعہ پر لچک اور نرمی کا برتاؤ کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ یہودیوں کے ایک قبیلہ بنو نضیر کی سرکشی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کی جہاں ایک وجہ یہ تھی۔ کہ وہ بڑے مضبوط اور مستحکم قلعوں میں پناہ گزین تھے وہاں ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی۔ کہ مدینہ کے منافق ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے جب ان سے معاہدہ صلح کر لینے کی خواہش فرمائی۔ تو وہ لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس موقعہ پر بھی عبداللہ بن ابی نے حسبِ معمول انہیں شہ دی۔ اور اطمینان دلایا کہ جب تم لڑنے نکلو گے۔ تو وہ ہزار آدمیوں کے ساتھ میں بھی تمہاری مدد کو آؤں گا (ابو داؤد) عبداللہ کی اس حرکت کی اطلاع وحیِ الٰہی نے آپؐ کو دے دی۔ کہ یہ منافقین کا قول (یہودیوں) سے کہہ رہے ہیں۔

وان قوتلتم لننصرنکم نحن معکم — اگر تم مقاتلہ کے لئے نکلے۔ تو ہم تمہاری مدد کریں گے!

کیا اس سے بڑا جرم بھی کوئی ہو سکتا تھا۔ جس کا ان منافقوں نے ارتکاب کیا تھا؟
لیکن آنحضرت صلعم نے انہیں کسی طرح کی کوئی باز پرس نہ فرمائی۔ اپنی تیاریوں میں لگے رہے نہ منافقین کی پروا کی نہ یہودیوں کی طاقت سے مرعوب ہوئے!

منافق ساتھی

انصار اور مہاجرین میں رسول اللہ صلعم نے وہ اخوت پیدا کر دی تھی۔ کہ اس بھائی چارہ کے آگے صلب اور رحم کے رشتے ہیچ تھے۔ کوئی انصاری اگر مرتا تھا تو مہاجر بھائی اس کی وراثت میں حصہ پاتا تھا۔ ایسی مواخات دنیا میں پہلی بار قائم ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد دنیا یہ دل آویز منظر نہ دیکھ سکی۔

منافقین اس کوشش میں رہتے تھے کہ مہاجرین اور انصار میں غلط فہمی پیدا کر کے جنگ و پیکار کرا دیں: تاکہ یہ عجیب و غریب بھائی چارہ بھی ختم ہو۔ اور ان دونوں کے اتحاد نے کفار و مشرکین کے لئے جو ایک خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ بھی دور ہو جائے۔ مگر ان کی کوششیں کبھی بار آور نہیں ہوئیں لیکن ایک مرتبہ قریب تھا کہ یہ کوشش کامیاب ہو جائے۔ ایک مہاجر اور ایک انصاری کے ذاتی جھگڑے کو عبداللہ نے قومی اور طبقاتی جھگڑا بنا دینے میں کامیابی حاصل کر لی۔ دونوں نے اپنے اپنے طبقہ (مہاجرین اور انصار) کو مدد کے لئے پکارا۔ تلواریں کھنچ گئیں۔ اور لڑائی کا میدان تیار ہو گیا۔ لیکن چند معاملہ فہم لوگوں نے مداخلت کی۔ بات بڑھنے نہ پائی۔ بغیر کسی خونریزی کے وہیں کی وہیں ختم ہو گئی۔

ایسا نادر موقعہ جب ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو عبداللہ تلملا اٹھا۔ اس نے انصار سے مخاطب ہو کر کہا۔

تم نے خود ہی یہ مصیبت مول لی ہے۔ مہاجرین کو تم نے اتنا بڑھایا۔ کہ اب وہ برابری کا دعویٰ کر کے تمہارے منہ آنے لگے ہیں۔ اب بھی موقعہ ہے۔ اپنا

دستِ اعانت کھینچ لو، تو یہ (مہاجرین) فوراً بے یار و مددگار ہونے کے باعث بھاگ کھڑے ہوں گے۔

عبداللہ کی یہ باتیں ایسی نہ تھیں، جو نظر انداز کر دی جاتیں۔ معاملہ دربارِ رسالتؐ میں پہنچا۔ حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ انہوں نے سرورِ کائناتؐ سے عرض کیا۔

"کسی کو حکم دیجئے۔ وہ اس منافق کی گردن اڑا دے!"

اور کون کہہ سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی یہ رائے قرینِ صواب نہ تھی؟ لیکن کیا رسول اللہ نے حضرت عمرؓ کے اس مشورہ کو قبول کر لیا؟ آپ نے ارشاد فرمایا۔

کیا تم اسے پسند کرو گے کہ لوگ کہیں محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں؟

حضرت عمرؓ کچھ جواب نہ دے سکے۔ اور رحمتِ عالمؐ کے عفوِ تمام نے ایک بہت بڑے منافق کی جان بچالی۔

منافق باپ کا مومن بیٹا

یہی نہیں۔ اس رئیس المنافقین کے ساتھ ایک اس سے بھی بڑا اور حیرت انگیز واقعہ پیش آتا ہے۔

جب عبداللہ بن ابی کی منافقانہ سرگرمیاں حد سے بڑھ گئیں، ان میں کسی طرح کی کمی نہ واقع ہوئی۔ بلکہ اضافہ ہی ہونے لگا۔ تو مسلمانوں میں اس کے قتل کا چرچا ہونے لگا۔ یہ افواہ پھیلنے لگی۔ اب وہ بچ نہیں سکتا۔ ضرور رسول اللہؐ اس کے قتل کا حکم امروز فردا میں صادر فرما دیں گے۔

بات قرینِ قیاس تھی۔ شدہ شدہ عبداللہ بن ابی منافقِ اعظم کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ کو پہنچی۔ یہ عبداللہ بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ اسلام کے شیفتہ رسول کے جاں نثار اور باپ کے خدمت گذار۔ یہ خبر سن کر سیدھے دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

جو کچھ میں نے سنا ہے (عبداللہ بن ابی کے حکم قتل کے متعلق) اگر وہ صحیح ہے۔ تو صرف اتنی استدعا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے حکم دیا جائے میں اپنے باپ کا سر ابھی کاٹ کر قدموں پر لا کر پھینک دوں گا۔

آپ نے یہ سنا اور جانتے ہو کیا جواب دیا؛

"نہیں ہم اس کے قتل کا حکم نہیں دیں گے۔ اس سے لطف و کرم کا برتاؤ کریں گے۔"

عبداللہ باپ کی جان بخشی کی نوید سن کر چلے گئے۔ باپ بھی اپنی جان کے بچ جانے پر خوش ہوا۔ لیکن اس کی منافقانہ سرشت جوں کی توں قائم رہی۔ اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

منافقوں کا عذر لنگ

رسالتمآب ہمیشہ لڑائی پر صلح کو ترجیح دیتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے یہودیوں و مشرکوں سے معاہدے کئے۔ اور ان پر سختی سے عمل کیا۔ لیکن مشرکین اور یہود کے معاہدے صرف اس لئے تھے۔ کہ جب مناسب سمجھیں انہیں چاک کر دیں۔ جنگ خندق شروع ہی عہد شکن یہودیوں اور قریش نے بغیر کسی وجہ کے برپا کی تھی۔ بنو نضیر تو خیر عہد شکنی میں مشاق تھے ہی۔ بنو قریظہ بھی جو اب تک پاس عہد کرتے چلے آ رہے تھے۔ بنو نضیر کے بہکاوے میں آ گئے۔ اور معاہدے کو پس پشت ڈال کر ان کے ساتھی بن گئے۔ آپ نے معاہدے کی یاد دہانی اور اتمام حجت کے لئے دو صحابیوں کو ان کے پاس بھیجا۔ انہوں نے جو جواب دیا۔ وہ یہ تھا۔

"نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ محمد کون ہے؟ نہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ معاہدہ کیا ہوتا ہے؟"

یہاں بھی کفار و مشرکین کا لشکر بہت بڑا تھا۔ اب بنو قریظہ نے اس کی تعداد دس ہزار تک پہنچا دی[1]۔ اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے پاس توکل اور نصرت الٰہی پر

---

(1) فتح الباری

بھروسہ کے سوا کیا تھا۔ کفار و مشرکین کی اس متحدہ یلغار کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کی قوت پارہ پارہ کردی جائے۔ نہ صرف یہ کہ پھر کبھی وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ بلکہ زندگی کے سانس بھی نہ لے سکیں۔

ایک یہودی سردار حی بن اخطب نے اپنے خیال میں سچ ہی کہا تھا: "اب اسلام کا خاتمہ ہے"۔

اس دس ہزار کے لشکر جرار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی پھر بے مائگی مستزاد۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ خندق کھود کر جنگ لڑی جائے۔ خندق کھودنے میں آپؐ نے برابر کا حصہ لیا۔ کفار و مشرکین نے تین طرف سے محاصرہ کر لیا تھا۔ حالات سخت نازک تھے۔ مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی۔ وسائل بھی ناپید تھے۔ روپیہ اور اناج بھی نہیں تھا۔ لیکن کفر و شرک کی یورش سے گھبرانا اور پیٹھ پھیرنا مسلمان کا شعار نہیں۔ حالات خواہ کتنے ہی نامساعد اور نازک ہوں، مسلمان کلمۂ الٰہی کی سربلندی کے لیے جان کا قربان کر دینا ایک کھیل سمجھتا ہے۔ ہاں تو تاریخ کا یہ عجیب و غریب کھیل جاری تھا۔ ایسا کھیل جس کی نظیر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

ایک مہینہ تک یہ محاصرہ قائم رہا۔ اس محاصرہ نے مسلمانوں کی حالت اور زیادہ زار و زبوں کر دی۔ بار بار فاقے کرنا پڑے۔ ایک مرتبہ صحابہ پر مسلسل تین فاقے گذر گئے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے پیٹ پر بندھے ہوئے پتھر دکھائے۔ عربوں کا معمول تھا۔ کہ شدت گرسنگی کے عالم میں پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے تاکہ کمر سیدھی رہے۔ یہ منظر دیکھ کر آپ نے بھی اخفار حال مناسب نہ سمجھا۔ شکم مبارک کھولا۔ تو دو پتھر بندھے ہوئے تھے[1]۔

مسلمانوں کے اس چھوٹے سے لشکر میں منافقین کی خاصی تعداد تھی۔ شروع شروع میں تو یہ اپنے نفاق کو چھپاتے رہے۔ لیکن جب شدائد کا دور سخت ہوا۔ تو نفاق چھپائے

---

[1] ترمذی

دچسپ سکا۔ غدر ہائے لنگ پیش کر کر کے واپس جانے کی اجازت طلب کرنے لگے۔ قرآن مجید میں جنگ خندق (جسے جنگ احزاب بھی کہتے ہیں، کیونکہ بہت سی جماعتوں نے متحدہ یلغار کی تھی) کے متعلق جو سورہ (احزاب) ہے اس میں ان کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کے عذرات کا مقصد راہ فرار تلاش کرنا ہے۔

ان یریدون الا فرارا

ان لوگوں (منافقوں) کا ارادہ صرف یہ ہے کہ بھاگ کھڑے ہوں۔

لیکن راہ فرار تلاش کرنے والے ان منافقوں کے ساتھ نہ صرف وہ رویہ نہیں اختیار کیا گیا جو میدان جنگ سے بھاگنے والے سپاہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ انہیں کسی طرح کی سزا نہیں دی گئی۔ ایک طرف ان کا یہ حال تھا۔ دوسری طرف کھرے اور سچے مسلمان تھے۔ جو اس جنگ کی ہر حالت میں ہر سختی اور ہر مصیبت کے موقع پر جان ہتھیلی پر لئے قربان ہونے کو تیار رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ جان خدا کی دی ہوئی ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کا مصرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کی راہ میں کام آجائے ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

منافق کو شبہ کا فائدہ

مدینہ سے یہودیوں کی جلاوطنی کے بعد خیبر ان کا مستحکم ترین اور ناقابل تسخیر قلعہ بن گیا تھا۔ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر وہ اسلام اور داعی اسلام اور مسلمانوں کی تخریب کی تدبیریں سوچا کرتے۔ سازشیں کیا کرتے اور جنگی منصوبے بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ جنگ خیبر سے کچھ قبل یہودیوں نے بنو غطفان کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کی طرح ڈالنا چاہی۔ مدینہ کے منافقین برابر یہودیوں کو خبریں پہنچا رہے تھے۔ اور شہ دے رہے تھے۔ آنحضرتؐ نے کوشش کی۔ کہ جنگ نہ ہو۔ بلکہ معاہدۂ صلح ہو جائے۔ اس مقصد

کے لئے آپؐ نے ایک صحابی کو بھی بھیجا لیکن وہ جنگ فتح کر لینے کے نشہ میں تھے صلح کی باتیں کیا سنتے؟ پھر جبکہ منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے انہیں یقین دلا رکھا تھا

"محمدؐ کچھ نہیں کر سکتے۔ مٹھی بھر آدمیوں کے سوا ان کے پاس ہتھیار تک نہیں، وہ کیا لڑیں گے؟" ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غطفان جواب تک شرکت نہ ہونے کے بارے میں تذبذب میں تھے۔ ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

اور منافقین کی یہ درانداز یاں اس لئے تھیں۔ کہ وہ جانتے تھے۔ انہیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ انہیں جماعت سے خارج نہیں کیا جائے گا۔ ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگے گا۔ ان کا اسلام زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔ اس لئے کہ اسلام کا یہ اصول ہے۔ کہ کسی ایسے شخص کی جان نہیں لیتا جو اسلام کا مدعی ہو۔ مگر چہ وہ جھوٹ ہی کیوں نہ بول رہا ہو۔"

مسجد ضرار

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ منافقین کی سب سے بڑی اور دیرینہ تمنا یہ تھی کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہو۔ وہ ایک دوسرے سے الجھ پڑیں۔ ان میں جو اخوت محبت ہمدردی اور ملاطفت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔ وہ سرد پڑ جائے تاکہ اسلام پنپ نہ سکے اور یہ ملت خود آپس کے نزاع میں مبتلا ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

چنانچہ مسجد قبا کے توڑ پر انہوں نے ایک جداگانہ مسجد بنائی تھی تاکہ مسلمانوں میں آسانی سے تفرقہ پیدا کیا جا سکے۔ وجہ یہ بتائی کہ معذور اور اپاہج لوگ جو مسجد قبا میں نہیں جا سکتے۔ وہ یہاں آکر نماز پڑھ لیا کریں۔

آنحضرتؐ کو وحی الٰہی نے بتا دیا کہ دراصل مقصد کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

والذین اتخذوا مسجدا ضرارا و کفرا   اور ان لوگوں نے مسجد ضرار کفر کینے اور مسلمانوں

تفریقا بین المومنین   میں پھوٹ ڈالنے کے لئے بنائی ہے

رسول اللہ ؐ نے اس مسجد میں آگ لگوا دی۔ اور اسے مسجد کے طور پر نہیں استعمال ہونے دیا۔ لیکن منافقوں کو ہر سزا سے محفوظ رکھا۔

منافقوں کی فتنہ انگیزی

فتح مکہ سے ایک سال قبل کا واقعہ ہے۔ کہ آنحضرت ؐ کو اطلاع ملی۔ رومیوں کا ایک لشکر گراں مسلمانوں سے برسر پیکار ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یہ سن کر آپ ؐ نے بھی جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ اگرچہ موسم نہایت گرم تھا (گرمی اور وہ بھی عرب کی) اور قحط کی شدت نے حالات کو حد درجہ ناسا عد بنا دیا تھا۔ لیکن آپ ؐ کی تیاریاں جاری تھیں اور جو مخلص مسلمان تھے۔ وہ ان شدائد کے باوجود راہ خدا میں اپنی جان قربان کر دینے کو تیار اور آمادہ تھے۔ لیکن منافقین؟ نہ صرف یہ کہ بہانہ بازی اور عذر تراشی کر کے وہ ان سرگرمیوں سے الگ رہے۔ بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو بھی بھڑکانا شروع کیا۔ کہ اس قحط اور اس گرمی میں وہ کیوں گھر کی عافیت چھوڑ کر جنگ کی صعوبتیں برداشت کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔

لاتنفروا فی الحر   اس گرم موسم میں باہر نہ نکلو

یہ تھا دعوت رسالت ؐ کے جواب میں ان کا وہ خفیہ پیغام جو مسلمانوں کے کانوں تک صرف اس لئے پہنچایا جا رہا تھا۔ کہ وہ ایک بڑی سعادت سے محروم رہ جائیں۔ ان فتنہ طرازیوں کے باوجود نہ ان کی جان کو کوئی گزند پہنچا نہ مال کو۔

منافق کی سپر!

ایک بدری صحابی نے ایک مرتبہ آنحضرت ؐ کو اپنے گھر بلایا۔ وہاں تشریف لے گئے۔ تو کھانے کے لئے اصرار ہوا۔ آپ ؐ راضی ہو گئے۔ محلہ کے تمام لوگ اس موقع پر موجود تھے۔ کسی نے کہا

"آج مالک بن دخیشن نظر نہیں آتے :"

ایک شخص نے یہ سن کر کہا

'وہ منافق ہے'

یہ سن کر رسول اللہؐ نے فرمایا

'یہ نہ کہو وہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں۔'

سب خاموش ہو گئے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہہ دینا ایک منافق کے لئے بھی سپر بن جاتا ہے :۔

منافق کا اقرار سے انکار

واقعہ افک یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ پر جو تہمت لگائی گئی تھی، وہ ہر مسلمان کو معلوم ہے حضرت عائشہ رضؓ کی طہارت و تقدیس کی خود قرآن مجید نے توثیق فرمائی۔ لیکن یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ ام المومنین رضؓ کی ذات گرامی پر ایسا رکیک اتہام قدرتاً اس سے آنحضرتؐ کو تکلیف ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضؓ کو بھی حد درجہ صدمہ ہوا۔ اور خود حضرت عائشہ رضؓ کے قلب و دماغ پر جو کچھ گذری اس کا اندازہ ہر حساس شخص بآسانی کر سکتا ہے۔ لیکن اتنے بڑے واقعہ کے سلسلہ میں ہوا کیا؟ اس سلسلہ میں تین خاص اور اہم شخصیتوں کا ذکر لازمی ہے۔ تہمت لگانے والوں کو شرعی سزا دی گئی یعنی درّے لگائے گئے ان سزا یافتگان میں حضرت حسانؓ بن ثابت بھی تھے۔ جو صحابی رسول اور شاعر رسولؐ تھے۔ لیکن منافقین کے بہکاوے میں آ گئے۔ اور تہمت لگانے والوں میں شریک ہو گئے۔

ایک دوسرے صاحب مسطح بن اثاثہ تھے۔ یہ بھی تہمت لگانے والوں میں (منافقین کے بہکاوے میں آ کر) شریک تھے۔ انہیں بھی شرعی سزا ملی لیکن مزید سزا یہ ملی۔ کہ حضرت ابوبکر رضؓ نے جو ان کے کفیل معاش تھے۔ اپنی مالی امداد بند کر دی

قسم کھالی کہ ایسے شخص کی مدد اب کبھی نہیں کریں گے، یہ بات خدا کو بری لگی۔ اور
آنحضرتؐ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ولیعفوا ولیصفحوا الاتحبون ان
یغفر اللہ لکم واللہ غفور الرحیم

تمہیں عفو و درگذر سے کام لینا چاہیے کیا
تم اسے پسند نہیں کرتے کہ خدا تمہاری
مغفرت فرمائے اور اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے

لیکن اس واقعہ کا اصل ہیرو منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی تھا۔ اور آپؐ اس حقیقت سے خوب واقف تھے۔ کہ یہ سب کچھ اسی کا کیا ہوا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں راسخ العقیدہ اور صالح مسلمانوں کو حد شرعی برداشت کرنا پڑی۔ اس لئے کہ ان پر جرم ثابت تھا اور عبداللہ بن ابی صاف بچ گیا۔ اس لئے کہ اسے خود اقرار نہیں تھا کہ اس نے تہمت لگائی۔ اور شواہد و قرائن خواہ کتنے ہی قوی موجود ہوں۔ لیکن کوئی ایسی شرعی شہادت موجود نہیں تھی۔ جس کی بنا پر اسے سزا دی جاسکتی ————

کیا یہ معمولی واقعہ ہے؟ کیا اس عفو و درگذر اور لطف و مرحمت اور احسان و نعمت کی کوئی حد مقرر کی جاسکتی ہے؟

رحمت تمام

اب رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی رحمت تمام کا ایک واقعہ بیان کرکے اس باب کو ختم کرتے ہیں۔ زندگی بھر سردار منافقین عبداللہ بن ابی جو کچھ کرتا رہا، وہ سب کو معلوم ہے۔ مختصراً وہ واقعات پھر تازہ کیجئے:

۱۔ یہ وہی شخص ہے۔ جو مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کی کوششیں کیا کرتا تھا جنگ احد کے موقعہ پر عین لڑائی کے وقت یہ اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر میدان جنگ سے نکل گیا۔ تاکہ مسلمان کافروں اور مشرکوں سے شکست کھا جائیں۔

۲۔ مدینہ کے یہودیوں کو شہ دینے والا، مسلمانوں کی سرگرمیوں سے انہیں مطلع

آپؐ نے جلاس کی اس دریدہ دہنی کے بارے میں درگذر سے کام لیا۔ اور کوئی سزا نہ دی۔ اس لطف عمیم کا اثر یہ ہوا۔ کہ بعد میں وہ ایک مخلص مسلمان بن گیا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ بعد میں جلاس نے نفاق سے توبہ کر لی تھی۔ اور اس کا اسلام بالکل صحیح اور درست ہو گیا تھا ؎

ایک منافق کی کہانی

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ بنی حارث میں سے مربع بن قیظی منافق تھا۔ جو آنحضرتؐ کی شان میں گستاخی کیا کرتا تھا۔

ایک دفعہ آپؐ اس کے باغ میں سے گذر رہے تھے۔ کہ اس نے کہا۔ اے محمدؐ اگر تم نبی ہو۔ تو تم کو میرے باغ سے گذرنا جائز نہیں ہے۔ اور اپنے ہاتھ میں ایک برتن مٹی سے بھر کر کہنے لگا۔ کہ اگر یہ مٹی کسی اور پر پڑنے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ تو میں ضرور تم پر پھینک دیتا۔ یہ بات سن کر لوگ اس کی طرف دوڑے کہ قتل کر دیں۔ آپؐ نے منع فرمایا۔ اور ارشاد کیا۔ "یہ آنکھوں کا اندھا بھی ہے اور دل کا بھی" ؎

یہ شخص واقعۃً نابینا تھا۔ "آنکھ کا اندھا" اسی کی طرف اشارہ ہے۔ یہی لفظ اگر اس نے آپؐ کی غیبت میں کہے ہوتے۔ تو شاید واقعی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ لیکن یہ الفاظ اس نے استعمال کئے آپؐ کی موجودگی میں۔ تو بچ گیا اور کسی طرح کا گزند اس دریدہ دہنی کے باوجود اسے نہ پہنچنے پایا۔

منافق کی سفارش پر بدعہد یہودیوں کی رہائی

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ بنی قینقاع کے یہود نے سب سے پہلے آپؐ سے جو عہد کیا تھا۔ اسے شکست کر کے جنگ پر آمادہ ہوئے۔ اور یہ جنگ غزوۂ بدر اور احد کے

؎ سیرت ابن ہشام حصہ اول۔

درمیانی وقفہ میں ہوئی تھی۔

ابن ہشام کہتے ہیں۔ اس جنگ کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ کہ عرب کی ایک عورت بازار بنی قینقاع میں کوئی چیز لے کر آئی۔ اور اس کو فروخت کر کے ایک سنار کی دکان پر بیٹھ گئی۔ یہودی اس عورت کے سر ہوئے۔ کہ اپنا چہرہ ہمیں دکھا۔ مگر عورت نے انکار کیا۔ سنار نے چپکے سے عورت کے بند میں ایک گرہ لگا دی۔ جب وہ عورت کھڑی ہوئی۔ تو اس کا ستر کھل گیا۔ یہودی ہنسنے لگے۔ اور اس عورت کو خوب چھیڑا۔ عورت نے غل مچایا۔ تو ایک مسلمان نے آکر اس سنار کو جو یہودی تھا قتل کر دیا۔ یہودیوں نے ہجوم کر کے اس مسلمان کو شہید کیا۔ اس مسلمان کے اقربا نے فریاد کی۔ پھر تو بہت سے مسلمان یہودیوں کے مقابلے میں اکٹھے ہو گئے۔ اور جنگ کا بازار گرم ہوا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ آپ ؐ نے ان یہودیوں کا محاصرہ فرمایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے حضور ؐ کی اطاعت قبول کر لی۔ اور اسی وقت عبد اللہ بن ابی بن سلول آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کرنے لگا۔

اے محمد ؐ! میرے موالی دوستوں کے ساتھ احسان کیجئے۔ اور یہ سب بنی خزرج کے حلیف تھے۔ آپ ؐ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس نے پھر عرض کیا۔ آپ ؐ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے آپ ؐ کی زرہ کا دامن پکڑ لیا۔ آپ نے فرمایا:۔

کمبخت میرا دامن چھوڑ دے۔ اس نے عرض کیا۔ میں ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ جب تک آپ میرے موالی کی جان بخشی کر کے ان پر احسان نہ فرمائیں گے۔ ان امیروں میں چار سو حاسر اور تین سو دارع ہیں۔ اور ایسے بہادر ہیں۔ کہ کسی جنگ سے نہیں ڈرتے۔ مگر آپ ان کو ایک دن میں قتل کر دیں گے۔ مجھ کو بھی اندیشہ

ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ جا اُن کو تجھے بخشا۔ عبداللہ بن ابی خوش ہو کر چلا گیا[1]
یہ تھا بدعہد، پیمان شکن، اشرار صفت اور مسلمانوں کو ایذا پہنچانے والے
یہودیوں کے ساتھ آپ ﷺ کا سلوک۔ اور وہ بھی ایک نام نہاد منافق مسلمان کی سفارش
پر! اللہ اللہ!

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ اول

رحمۃ للعالمین کا عفو و احسان

جنگی قیدیوں، محکوموں اور شکست خوردہ حریفوں پر

انسان کے کردار اور سیرت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ سطوت و شوکت، قوت و طاقت اور جاہ و جلال کا مالک ہو۔ اخلاق خدمت اور عفو و درگذر کی بیچارگی، مجبوری اور بے بسی کے دور میں جتنی فراوانی ہوتی ہے۔ قوت و طاقت حاصل کرنے کے بعد یہ جنس اتنی ہی نایاب ہو جاتی ہے۔ چھوٹی طاقت اور بڑی طاقت میں ہمیشہ نیازمندی اور فروتنی کے تعلقات قائم رہتے ہیں۔ ایک معمولی شہری، پولیس کانسٹبل سے، پولیس کانسٹبل سب انسپکٹر سے، سب انسپکٹر، کوتوال شہر سے، کوتوال شہر انسپکٹر جنرل سے، انسپکٹر جنرل وزیر داخلہ سے، وزیر داخلہ وزیر اعظم سے اور وزیر اعظم بادشاہ یا صدر مملکت سے ہمیشہ جھک کر ملتا ہے۔ اس کی زیادتیوں کو "معاف" کر دیتا ہے۔ بھول جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ معاف کر دینے اور بھول جانے پر مجبور ہے۔ معاف نہ کرے اور بھول نہ جائے تو کر کیا لے گا؟ لیکن اگر معاملہ برعکس ہو۔ یعنی بڑی

اور چھوٹی طاقت کے تعلقات پیشِ نظر ہوں۔ تب کیا نظر آئے گا؟ کیا بڑی طاقت بھی چھوٹی طاقت کی خطاؤں کو، زیادتیوں کو، سفاکیوں کو اس سیرچشمی، فراخ دلی اور اولو العزمی کے ساتھ معاف کر دے گی؟ —— نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ انتقام کا نام بڑی طاقت کے وجود کے ساتھ زندہ ہے۔ ظلم کی زندگی بڑی طاقت کے وجود پر قائم ہے سفاکی، خون آشامی، خون ریزی، قتل و غارت، دیدہ دلیری، قزاقی، لوٹ مار یہ سب چیزیں بڑی طاقت کی غذا ہیں۔ ان کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ انہی کے سہارے اس کا دبدبہ اور طنطنہ قائم ہے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے دیکھ لیا۔ عرب کا امّی، ایک مبلّغ، ایک پیغمبر، ایک داعیٔ حق کی حیثیت سے کس عزیمت و استقامت کے ساتھ کافروں اور مشرکوں کی ہر شرارت اور زیادتی کو برداشت کرتا تھا۔ گذشتہ صفحات میں ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں۔ کہ کتنے صبر و تحمل کے ساتھ نسبتاً طاقتور اور مضبوط ہونے کے بعد بھی دشمنوں، دراندازوں اور منافقوں کی سازشوں، حیلہ جوئیوں، غداریوں اور فتنہ سامانیوں کو اس نے برداشت کیا۔ اب ہم یہ دیکھیں گے۔ کہ وہی مبلغ اور پیغمبر اور داعیٔ حق جب ایک فاتح، ایک سپہ سالار اور ایک کشور کشا کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے۔ تب اس کے اخلاق اور سیرت کا کیا رنگ ہوتا ہے؟ تب اپنے دشمنوں، غداروں اور فتنہ انگیزوں کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہوتا ہے۔ ہارے ہوئے دشمن اپنی خونچکاں تلوار کے ساتھ، ناکام منافق اپنی برافگندہ نقاب سازشوں کے ساتھ، شکست خوردہ حریف اپنے سیاہ اعمالنامہ کے ساتھ، بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنے ہوئے آخری فیصلہ سننے کو سراپا انتظار بنے کھڑے ہیں۔ انہیں ایک ایک کر کے اپنے جرائم یاد آ رہے ہیں۔ اپنی خطائیں چلتی پھرتی نظر آ رہی ہیں۔ اپنی دشنام طرازیاں، اپنی سفاکیاں، خون آشامیاں، خوفناک سازشیں، ہلاکت خیز منصوبے، عہد شکنیاں، بے وفائیاں

غداریاں پیکرِ محسوس کی طرح نظر کے سامنے موجود ہیں۔ اور وہ فاتح وہ سپہ سالار وہ کشور کشا ہر نوعِ علم اخلاق و قانون کی رو سے حق رکھتا ہے کہ انہیں عبرت انگیز سزا دے ——

لیکن اس نے کیا کیا؟

آنے والے اوراق اس بے حد اہم سوال کا جواب دیں گے

یہودیوں سے حسن سلوک

یہود کے ساتھ ان کی معروف و معلوم شرارتوں کے باوجود آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ عفو و مرحمت، معافی اور درگذر، بخشش اور حسن سلوک کا برتاؤ رکھا۔ اگرچہ یہودیوں کی طرف سے اس کا جواب بالکل برعکس ملا۔ مکہ سے ہجرت کے بعد جب آپ مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلا کام یہ کیا، کہ یہود سے خیر سگالی اور دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ جس میں انہیں ہر طرح کی سہولت دی۔ پورا معاہدہ سیرت ابن ہشام میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن اس معاہدہ کی چند خاص دفعات کا ذکر ضروری ہے۔

۱۔ یہودیوں کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت روا نہیں رکھی جائے گی انہیں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔

۲۔ مسلمانوں یا یہودیوں سے کوئی برسرِ پیکار ہو، تو دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

۳۔ قریش کو نہ مسلمان امان دیں گے نہ یہودی

۴۔ مدینہ پر حملہ کی صورت میں یہودی مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔

معاہدہ کے جملہ دفعات و شرائط پر آنحضرت ﷺ نے بڑی سختی سے عمل فرمایا۔ اور ذاتی طور پر بھی ان کی توقیر و اجلال میں کوئی کمی نہیں کی۔ ان سے بھائی چارہ کا برتاؤ کیا۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ وقتاً فوقتاً یہودیوں کی عیادت کو بھی آپ تشریف لیجاتے[1]

---

[1] زاد المعاد

اور بے ساز و سامان و بے برگ و نوا مسلمانوں کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی۔ اور کفار کا لشکر ایک ہزار سے متجاوز۔ اور ہر طرح کے ساز و سامان جنگ سے لیس۔ جنگ شروع ہوئی۔ اور خدا کی نصرت نے مسلمانوں کو اپنے سے کئی گنے لشکر پر فتح عطا فرمائی۔ یہ اتنی بڑی شکست تھی کہ کفار کی کمر ٹوٹ گئی۔ ان کے کئی بڑے لوگ یا مارے گئے یا اسیر جنگ بنا لیے گئے۔ یہ شکست ان لوگوں کو ہوئی تھی، جن کی تعداد ایک ہزار تھی، جن کے پاس وافر رسد تھی، جن کے پاس جنگی اسلحہ تھے، جن کے پاس درہم و دینار تھے، جن کے پاس سو سوار تھے۔ زرہ بکتر سے مسلح۔ اور یہ شکست ان لوگوں نے دی تھی، جن کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی، جن کے پاس صرف دو گھوڑے تھے، جن کے پاس نامکمل اور ناکافی سامان جنگ تھا

گرفتاری کے بعد سوال پیدا ہوا کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ عام معمول یہ تھا۔ کہ اسیران جنگ یا قتل کر دیے جاتے تھے یا لونڈی غلام بنا لیے جاتے تھے۔ آنحضرتؐ کو دونوں صورتیں پسند نہیں تھیں۔ مشورہ کیا تو حضرت ابوبکر رضؓ نے رائے دی کہ فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ حضرت عمر رضؓ کی رائے تھی۔ کہ سب کی گردن ماری جائے۔ آنحضرتؐ نے ابوبکر رضؓ کی رائے پر عمل کیا۔ کل قیدیوں کی تعداد ۷۰ تھی۔ ان میں سے ستر کو آپؐ نے فدیہ لے کر رہا کر دیا۔ گرفتاری کے بعد یہ قیدی صحابہ کے پاس مہمان کی طرح رہے۔ وہ خود فاقہ کرتے تھے۔ انہیں پیٹ بھر کر کھلاتے تھے۔ کیونکہ آپؐ نے تاکید فرمائی تھی کہ قیدیوں کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ ایک قیدی کا (حسب روایت طبری) بیان ہے کہ میں جہاں قید تھا۔ وہاں کا صاحب خانہ عسرت کے باعث خود کھجور پر گذر کرتا تھا اور روٹی مجھے دے دیتا تھا۔

دشمن خطیب قبضہ میں

بدر کے جنگی قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا۔ جس نے جنگ کی آگ بھڑکانے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ یہ اپنی تقریروں میں آپؐ کے خلاف خوب زہر اگلتا

حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ اس کے نیچے کے دو دانت اکھڑوا دیئے جائیں تاکہ خطابت کا جوہر ضائع ہو جائے۔

آپؐ نے فرمایا!

اگر میں نے اس کا مثلہ کیا (کوئی عضو بگاڑا) تو نبی ہونے کے باوجود خدا اس کے بدلہ میں میرے ساتھ بھی یہی کرے گا (طبری)

برتاؤ میں مساوات

اسیران جنگ کے ساتھ مساوات کا یہ عالم تھا کہ حضرت عباس کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں فرمائی۔ جو آپؐ کے چچا تھے۔ وہ بھی اسی طرح بیڑیوں میں جکڑے رہے جس طرح دوسرے قیدی۔ اگرچہ وفور محبت سے آپؐ کا یہ حال تھا۔ کہ ان کی کراہ سننے کے بعد ساری رات استراحت نہ فرما سکے۔

فدیہ کی شرح

فدیہ کی شرح یہ تھی۔

۱۔ عام لوگوں سے چار چار ہزار درہم فی کس

۲۔ دولت مندوں سے زیادہ ــــ چنانچہ حضرت عباسؓ سے بھی زیادہ رقم لی گئی۔ جو دولت مند تھے۔

۳۔ جن کے پاس روپیہ نہ تھا لیکن علم تھا۔ ان کا فدیہ یہ قرار پایا۔ کہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔

۴۔ جن کے پاس نہ روپیہ تھا۔ نہ علم انہیں بغیر کسی شرط کے رہا کر دیا گیا ــــ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ایک آدمی بھی غلام نہیں بنایا گیا۔

رسولؐ کی بددعا

غزوۂ احد جنگ بدر کے بعد تاریخ اسلام کا بہت ہی بڑا محاربہ ہے۔ بدر کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے کفار مکہ انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ ان کے شعراء نے روح پرور اور وجد آور اشعار کہہ کر سارے قبائل میں آگ لگا دی۔ ان کی عورتوں نے طعنے دے دے کر اپنے مردوں کے سینے چھلنی کر دیئے۔ ان کے دولتمندوں نے اپنی تھیلیوں کے منہ کھول دیئے۔ عام چندہ کیا گیا۔ اور اس چندہ میں شامی تجارت کا منافع الگ سے شامل تھا۔ جو پچاس ہزار مثقال سونے اور ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا۔ قریش نے جو لشکر گراں فراہم کیا۔ اس کی تعداد پانچ ہزار نفوس تھی۔ اس میں تین ہزار شتر سوار، دو سو اسپ سوار اور سات سو زرہ پوش پیادے شامل تھے۔ کوہ احد مقام جنگ قرار پایا۔ اسلامی لشکر صرف سات سو سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ یہ بڑی ہی ہولناک اور لرزہ خیز جنگ تھی۔ اس میں خود سرور کائنات صؐ بھی زخمی ہو گئے۔ اس جنگ میں بھی کفار کے کئی بڑے بڑے لوگ ہلاک ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کے بھی کئی سردار رسیاں جنال ہوئے۔ مثلاً امیر حمزہ رضؓ حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمان بہت کم تھے اور کافر بہت زیادہ۔ لیکن بالآخر فتح مسلمانوں کے حصہ میں آئی۔ کافروں کا لشکر شکست یاب ہوا۔ اس جنگ میں ایسے مرحلے بھی آئے جب مسلمانوں کی شکست یقینی ہو گئی۔ آنحضرتؐ کی شہادت کا لوگوں نے یقین کر لیا تھا۔ لیکن علی مرتضٰےؓ، طلحہؓ۔ ابودجانہؓ اور حنظلہؓ کی بہادری نے اکھڑے ہوئے قدم جما دیئے۔ ہاری ہوئی بازی جتا دی۔ مسلمان پروانہ وار شمع نبوت پر قربان ہونے لگے۔ ان جان دینے والوں میں انس بن نضرؓ۔ سعد بن ربیعؓ اور عمارہ بن ربیع نے جس شان سے جان حق ۔ وہ [illegible]

اس جنگ میں آپ سے استدعا کی گئی۔ کہ آپؐ کفار کے لئے بددعا فرمائیں

اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا

انی لم ابعث لعانا ولکن بعثت داعیا ورحمۃ اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون

میں لعنت کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں۔ میں داعیٔ حق و رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ بار الہا! میری قوم کو ہدایت فرما کیونکہ یہ لوگ نہیں جانتے۔

بغیر فدیہ کے رہائی

۵ھ میں غزوہ بنی مصطلق پیش آیا۔ قریش نے بنو خزاعہ کی ایک شاخ بنو مصطلق کو بھڑکا کر مسلمانوں پر حملہ کرایا۔ لیکن یہ لوگ جس جوش و خروش سے لڑنے آئے تھے۔ اسی شان سے شکست کھائی۔ تقریباً چھ سو آدمی گرفتار ہوئے۔ اور سب کے سب رہا کر دیئے گئے۔ کسی سے فدیہ بھی نہیں لیا گیا۔

حملہ آوروں کی رہائی

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں کوہ تنعیم سے اتر کر کافروں کے ایک دستہ نے خلاف عہد مسلمانوں پر حملہ کیا۔ ستر آدمی گرفتار کئے گئے۔ لیکن آپؐ نے سب کو رہا کر دیا۔ ان سے بھی کسی طرح کا فدیہ نہیں لیا گیا۔

ابو سفیان کی چشم ندامت

۸ھ

اب مکہ فتح ہوتا ہے۔

یہ تاریخ اسلام کا بے انتہا شاندار کارنامہ ہے

کفار مکہ بار بار پیمان شکنی کر رہے تھے۔ عہد کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔ رسول اللہؐ نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اگر یہ کفار کسی طرح بھی پاس عہد نہیں کرتے۔ تو اب وقت آگیا ہے۔ کہ فیصلہ تلوار پر چھوڑ دیا جائے۔ اور اس فیصلہ کی محرک مسلمانوں کی مظلومی اور بے بسی نہ تھی۔ خود ایک حلیف۔ لیکن کافر قبیلہ خزاعہ کی مظلومی اور بے بسی تھی۔

اتمام حجت کے طور پر آپ ﷺ نے پھر کوشش کی۔ کہ کفارِ مکہ تجدید صلح اور تلافی مافات پر راضی ہو جائیں۔ لیکن وہ معاہدہ چاک کر چکے تھے۔ اب آپ ﷺ دس ہزار کا لشکر لے کر مکہ پر چڑھائی کے ارادہ سے باہر نکلے ——————— یہ لشکر آج دس ہزار جاں نثاروں پر مشتمل تھا۔ لیکن جب یہ جاں نثار ۳۱۳ تھے (بدر میں) جب بھی فتح و کامرانی نے ان کے قدم چومے تھے۔ جب ان کی تعداد صرف سات سو (جنگ احد) تھی۔ اس وقت بھی ان کے رب نے ان کی مدد کی۔ اور اب کہ ان کی تعداد دس ہزار ہے۔ یہ خدا ہی کی نصرت فرمائی کے بھروسہ پر کفن سر سے لپیٹ کر یہ ارادہ کر کے گھر سے نکلے ہیں کہ کلمۃ اللہ کی سربلندی اور سرافرازی میں اپنی جان۔ اپنا مال، اپنے خویش و اقارب، اپنی آرزو اور تمنا سب کچھ قربان کر دیں گے ——————— کفارِ مکہ اس سے واقف تھے۔ کہ مسلمان اب صاحب جاہ و حشم بن چکے ہیں۔ لیکن اس سے قطعاً ناواقف تھے۔ کہ ان کا دبدبہ اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے۔ راستہ میں جب اس لشکر کو اسلام کے سب سے بڑے دشمن۔ داعیٔ اسلام کے اعدِ عدو اور مسلمانوں کے بدترین مخالف نے دیکھا تو لرزہ براندام ہو گیا۔ ساری سرکشی ختم ہو گئی جس نے اپنی زندگی کا مقصد مسلمانوں کا استیصال بنایا تھا۔ وہ اب مسلمانوں کا دبدبہ دیکھ کر بید لرزاں کی طرح کانپ رہا تھا۔ جس نے اسلام کو ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ اسلام کے دامن عفو میں پناہ لینے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا جس نے داعیٔ اسلام کے خلاف مکہ کے شہریوں کو، قبائل کے افراد کو، مدینہ کے یہودیوں کو بار بار بھڑکایا تھا، مشتعل کیا تھا جس نے بار بار سازشیں کی تھیں قتل نبی ﷺ کے منصوبے سوچے تھے۔ جس نے بار بار پیادوں اور سواروں کا لشکر بے حساب لے کر مسلمانوں سے جنگ کی تھی۔ مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ وہ اب محو حیرت تھا۔ کہ یہ کیا ہو گیا اور اب کیا ہو گا؟

ابو سفیان گرفتار کر کے رحمت عالم ﷺ کے سامنے لایا گیا۔ یہ وقت تھا۔ کہ اس کے

ہر ہر جرم پر الگ الگ سزا دی جاتی۔ رسول اللہ نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا لیکن علی مرتضیٰ راز مزاج شناس رسول تھے۔ انہوں نے وہ الفاظ دہرائے۔ جو یوسف ؑ کے خطا کار بھائیوں نے کہے تھے

تاللہ لقد آثرک اللہ علینا ان کنا لخاطئین

قرآن کے یہ الفاظ سن کر دریائے عفو و کرم جوش میں آیا۔ آپ نے اس کی خطائیں بخش دیں۔ خلاف توقع مرحمت اور عفو کا یہ رنگ دیکھ کر ابوسفیان اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

ھدانی ھاد غیر نفسی و دلّنی

الی اللہ من طردتہ کل مطرد

یعنی " مجھے اس ہادی نے سیدھا راستہ دکھایا جسے میں نے پوری طرح چھوڑ دیا تھا۔"

یہ سن کر آپ نے فرمایا

"ہاں تم نے تو مجھے چھوڑ ہی دیا تھا"

پھر آپ نے حکم دیا۔ کہ ابوسفیان کا گھر دار الامن ہے۔ جو خطا کار اس کے گھر میں پناہ لے گا۔ وہ ہر تعزیر و باز پرس سے محفوظ رہے گا۔

اور اس طرح ابوسفیان کی چشم ندامت نے وہ کچھ پا لیا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔[1]

فاتح فوج کو ھدایت

اب لشکر اسلام آگے بڑھا۔ ابوسفیان اس لشکر کا جاہ و جلال دیکھ رہا تھا اور

---

[1] سیرت ابن ہشام

اور عرق عرق ہو رہا تھا۔ آپؐ نے فوج کو ہدایت فرمائی کہ

۱۔ جو شخص خانہ کعبہ میں پناہ گزین ہو جائے۔ اس سے تعرض نہ کیا جائے
۲۔ جو اپنے گھر کے اندر بیٹھا رہے۔ اس پر تلوار نہ چلائی جائے۔
۳۔ جو ابو سفیان کے گھر میں پناہ گزین ہو وہ بھی بری ہے
۴۔ جو بھاگ رہا ہو اس کا تعاقب نہ کیا جائے۔
۵۔ جو زخمی ہو۔ اس کی جان نہ لی جائے
۶۔ جو گرفتار ہو چکا ہو۔ اسے نہ مارا جائے ؛

سلوک اور صلہ کا دن

اسلام کا لشکر مکہ میں داخل ہو گیا —————— یہ وہی مکہ ہے جہاں سے آنحضرتؐ اور مسلمان ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے —————— سب سے پہلے آپؐ خانہ کعبہ میں تشریف لے گئے۔ اور کلید بردار کعبہ عثمان بن طلحہ کو طلب فرمایا۔ یہ وہی ابن طلحہ ہے۔ کہ آغاز اسلام میں ایک مرتبہ آپؐ نے اس سے بیت اللہ کھولنے کی استدعا کی تھی۔ اور اس پیکر نخوت نے حقارت کے ساتھ استدعا کو رد کر دی تھی۔ اور رسول اللہؐ نے فرمایا

"ایک روز یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہو گی۔ اور میں جسے چاہوں گا دوں گا"[1]

اور عثمان بن طلحہ نے چڑ کر جواب دیا تھا۔

"کیا اس دن قریش کے تمام مرد ذلیل اور برباد ہو چکے ہوں گے ؟"

آج وہی عثمان بن طلحہ رسول اللہؐ کے سامنے موجود تھا۔ اسے اپنے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اور وہ انجام کے ڈر سے لرزاں و ترساں کھڑا تھا۔ کہ اس کے کانوں میں رسول اللہؐ کی آواز گونجی

---

[1] سیرت ابن ہشام

الیوم یوم البرّ والوفا — آج کا دن سلوک کرنے اور صلہ دینے کا دن ہے۔

پھر کلید کعبہ عثمان کو مرحمت فرمائی اور کہا

یہ کنجی جو تم سے چھینے گا۔ وہ ظالم ہو گا[1]

"تم آزاد ہو!"

مکہ کے تمام کفار اور مشرکین جمع تھے۔ اور یہ سب بڑے پرانے پاپی تھے۔

انہوں نے کیسی کیسی ہولناک اور لرزہ خیز ایذائیں مسلمانوں کو دی تھیں۔ انہیں جلتی ہوئی ریت پر لٹایا تھا۔ ان کے سینوں پر گرم گرم پتھر رکھے تھے۔ ہجرت کے وقت ان کے معصوم اور خورد سال بچوں کو چھین لیا تھا۔ ان کی جائداد اور املاک پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کے گھروں اور کھیتوں کو غصب کر کے قابض اور متصرّف ہو گئے تھے۔ انہیں زخمی کیا تھا، قتل کیا تھا۔ ان کی توہین کی تھی۔

کیونکر ممکن تھا۔ کہ اب قبضہ میں آنے کے بعد یہ بچ جاتے۔ اور کیفر کردار کو نہ پہنچتے؟

یہ سب اپنی زندگی سے مایوس اور دل گرفتہ بیٹھے تھے۔ اور دنیا کا سب سے بڑا فاتح اور کشور کشا ان کے سامنے کھڑا تھا ——— اس نے جو کچھ کہا معلوم ہے وہ کیا تھا؟ اس نے ان سہمے ہوئے دبکے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی اور کہا

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء — آج تم پر کوئی الزام نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔

یہ سنتے ہی جن چہروں پر مردنی چھائی تھی۔ وہ پھول کی طرح کھل گئے۔ جو زندگی سے مایوس تھے۔ انہیں زندگی واپس مل گئی۔

---

[1] طبقات ابن سعد جزو ثانی

ھندہ کی جان بخشی

رحمۃ للعالمین ﷺ کا یہ سلوک تو تھا۔ مکہ کے عام لوگوں کے ساتھ، اب اُن خواص پر ایک نظر ڈالئے۔ جن میں سے ہر ایک اتنا بڑا مجرم تھا۔ کہ اگر ہزار ہزار مرتبہ بھی اس کی جان لی جاتی تب بھی اس کا دامن خونِ ناحق، بربریت اور درندگی کے دھبوں سے صاف نہ ہوتا۔

ابو سفیان کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ اب اس کی بیوی ہندہ کا تذکرہ مقصود ہے

یہ وہ عورت ہے، جو امیر معاویہ کی ماں، ابو سفیان کی بیوی اور سردار عرب عتبہ کی بیٹی ہے لیکن کسی میں مجال نہیں کہ اس کی سفارش کر سکے۔ اس کے جرائم پکار پکار کر سزا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے محبوب چچا امیر حمزہ رض کو شہید کرا دیا تھا۔ اور جوشِ عداوت میں ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں۔ ہندہ بنت عتبہ اور عورتوں کو ساتھ لے کر صحابہ کرام کی لاشوں کے پاس آئی۔ اور ان کے ناک کان کاٹنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ ہندہ نے ان کانوں اور ناکوں کے ہار بنا کر اپنے گلے میں پہنے۔ اور اپنا سارا زیور اتار کر وحشی جبیر بن مطعم کے غلام کو حضرت حمزہ رض کے شہید کرنے کے انعام میں دیا۔ اور حضرت حمزہ رض کے جگر مبارک کو نکال کر اس نے اپنے منہ میں لے کر چبایا مگر اس کو نگل نہ سکی۔ تب اس کو اگل دیا۔ اور پھر ایک اونچے پتھر پر چڑھی۔ اور پکار کر چند اشعار مسلمانوں کی ہجو میں پڑھے۔ مسلمانوں میں سے ایک عورت ہندہ بنت اثاثہ نے اس کو دندان شکن جواب دیا اور مشرکین کی ہجو اشعار میں بیان کی [1]

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ اول

کیا ایسی بیہ کار عورت کی بھی جان بخشی ہو سکتی تھی؟ ——— ہاں صرف رحمۃ للعالمین کے دربار میں۔

چنانچہ تاریخ کے اوراق میں یہ واقعہ محفوظ ہے۔ کہ اسے کوئی معمولی سے معمولی سزا بھی نہیں دی گئی!

روٹھا ہوا دشمن

صفوان بن امیہ قریش کا بہت بڑا سردار تھا

فتح مکہ کے بعد اسے اپنا نامۂ اعمال یاد آیا۔ ہر ہر جرم موت کا آئینہ دار تھا۔ ٹھہر نہ سکا۔ جدہ بھاگ گیا۔ کہ جان بچا لے۔ آپ ؐ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ امان کی علامت کے طور پر آپ ؐ نے اپنا عمامہ عمیر رضؓ کو مرحمت فرمایا۔ کہ وہ جائیں اور اس روٹھے کو منا لائیں۔ جس نے اسلام کے قلع قمع کرنے میں داعی اسلام ؐ کو ایذائیں پہنچانے میں مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔

عمیر رضؓ گئے اور روٹھے ہوئے دشمن کو منا لائے۔ جو خوف و ہراس کے باعث لرزاں و ترساں گیا تھا۔ وہ وفور نشاط و مسرت سے متبسم لباں اور غنچہ دہاں واپس آ گیا۔

دشمن کا جان نثار بیٹا

ابوجہل کی شقاوتیں، شرارتیں اور بد اندیشیاں مٹائے نہیں مٹ سکتیں۔ اسی ابوجہل کے بیٹے عکرمہ تھے۔ اسلام دشمنی میں باپ سے دو قدم آگے۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

کے مصداق ہمیشہ آنحضرت ؐ اور اسلام کے خلاف ہر یورش میں پیش پیش۔ ہر پیکار میں سب سے آگے ہر سازش میں انتہا پسند۔

بنو خزاعہ کی حمایت میں رسول اللہ ؐ لشکر لے کر نکلے جس کے نتیجہ میں فتح مکہ

تکمیل کو پہنچی۔ بنو خزاعہ کو خلاف معاہدہ قتل کرنے والوں میں جہاں اور کئی لوگ تھے وہاں عکرمہ بھی تھے۔ ظاہر ہے فتح مکہ کے بعد جان بچنے کی کوئی امید نہیں تھی، فرار ہو کر یمن پہنچے۔ لیکن ان کی بیوی ام حکیم مسلمان ہو چکی تھیں۔ وہ بیدھی یمن آئیں۔ اور رحمۃ للعالمین کے رحم و کرم، عفو و درگذر، شفقت و رحمت کی داستان سنا کر شوہر کو واپس لے گئیں۔ یہ سیدھے سرور کائنات ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دربار رسالت ؐ میں ان کا خیر مقدم کس طرح ہوا؟ اسے قرآن کے بعد سب سے زیادہ مستند کتاب موطا امام مالک کے حوالے سے سنئے

"آنحضرت ؐ نے جب عکرمہ کو دیکھا۔ تو فرطِ مسرت سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی۔"

اس برتاؤ کا نتیجہ یہ ہوا ——— ابوجہل خواہ کتنا ہی پیچ و تاب کھا رہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ اس کا لختِ جگر ——— عکرمہ مسلمان ہو گیا۔ بہت بڑا صحابی بنا۔ بخاری اور مسلم اور دوسری کتب حدیث کے اوراق اس کی روایت کردہ حدیثوں سے روشن ہیں ؛

بہت بڑا مجرم

یہ بہت بڑا مجرم ہمارا حاضر ہے ——— ظلم کے شکنجہ میں نہیں۔ عدالت کے کٹہرے میں ظلم خطا اور قصور کے بغیر لوگوں کو کچل دیتا ہے۔ اور عدل صرف انہی لوگوں کو سزا دیتا ہے۔ جو واقعی مجرم ہوں، خطاکار ہوں، ظلم کے دربار میں سزا، خطا سے بڑی ہوتی ہے۔ عدل کے ایوان میں خطا اور سزا میں مساوات ہوتی ہے۔ عدالت کے کٹہرے میں ہمارے جو مجرم پیش ہو رہے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے بنتِ رسول ؐ حضرت زینب کے ہودج پر

پر نیزہ مارا تھا۔ وہ گر گئیں۔ اور حمل ساقط ہو گیا، اور آخر کار، اس دنیا سے رخصت ہو گئیں!

ظلم کو چھوڑیئے۔ کیا عدل بھی ہبار کو معاف کر سکتا تھا؟ نہیں، ہر گز نہیں۔ لیکن یہ عدالت تھی رحمۃ للعالمین کی۔ ہبار نے رحم کی استدعا پیش کی۔ اور وہ جو رحم کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتا تھا، اس نے معاف کر دیا ——— صلے اللہ علیہ وسلم!

امن بغیر کسی شرط کے

مکّے کے جن باشندوں کو امن دیا گیا، وہ قطعاً غیر مشروط تھا۔ نہ ان پر جرمانہ عاید کیا گیا۔ نہ ان پر کوئی پابندی لگائی گئی۔ نہ انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ سب طلقا تھے، یعنی بری شدہ لوگ۔ ارباب تاریخ و سیر اس پر متفق ہیں۔ کہ جنگ حنین میں مسلمانوں کو پہلے ہلّہ میں جو شکست ہوئی تھی۔ وہ انہی طلقا کی بزدلی کے باعث ہوئی تھی! ——— یہ اس بری طرح سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے، کہ مسلمان اپنا ضبط و نظم قائم نہ رکھ سکے!

متنبّی نبی کے دربار میں

عبد اللہ بن ابی سرح جب پیش گاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ تو اسے بھی بغیر کسی شرط کے معافی مرحمت فرمائی گئی۔

حالانکہ یہ وہ شخص ہے۔ جو کہا کرتا تھا۔ دراصل جبریل امین وحی میرے پاس لاتے ہیں۔ میں محمد کو بتا دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے سن کر اسے لکھوا دیتے ہیں۔ لہٰذا اصلی نبی (معاذ اللہ) میں ہوں!

حمزہؓ کا قاتل

وحشی خود اپنے بارے میں مایوس تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اسے ہلکی سے ہلکی جو سزا

دی جا سکتی ہے۔ وہ موت ہے۔ فتح مکہ کے بعد یہ بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر ڈرتا ڈرتا آیا اور پروانہ عفو لے کر چلا گیا۔

یہ وہی وحشی ہے۔ جس نے حضرت حمزہ رضؓ کو دھوکہ دے کر شہید کیا تھا۔ پھر ان کی لاش کو بے حرمت کیا تھا۔ اور حضرت حمزہ رضؓ سے آپ ﷺ کی محبت والفت کا یہ عالم تھا۔ کہ جب انصار کی عورتیں اپنے شہیداعزہ کا ماتم کرنے لگیں۔ تو آپ ﷺ نے حسرت و اندوہ کے لہجہ میں ارشاد فرمایا

"اور حمزہ پر رونے والا کوئی نہیں!"

یہ حبشی وہی تھا۔ جس نے حمزہ کو قتل کیا تھا —— دھوکہ دے کر اور پھر ان کی لاش بھی بگاڑ دی تھی —— خود اپنی کہانی بیان کرتا ہے۔

وحشی جبیر بن مطعم کا غلام کہتا ہے۔ حضرت حمزہ رضؓ نے میرے سامنے ابو نیار کو قتل کیا۔ اور رہا یہ اپنی تلوار سے لوگوں کو زخمی کر رہے تھے میں نے اپنے حربہ[1] کو گردش دی۔ اور جب مجھ کو پورا اطمینان ہو گیا۔ تو حضرت حمزہ رضؓ کی طرف میں نے اس کو رہا کیا۔ وہ سیدھا جا کر ان کے زیر ناف لگا۔ اور دونوں ٹانگوں کے درمیان سے نکل کر گر پڑا۔ حضرت حمزہ رضؓ میری طرف متوجہ ہوئے۔ مگر فوراً گر پڑے۔ میں ٹھہر رہا۔ آخر جب وہ ٹھنڈے ہو گئے۔ میں نے اپنا حربہ ان کے پاس جا کر اٹھا لیا۔ اور خیمہ میں آن کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اب میری ضرورت نہ تھی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ جعفر بن عمرو بن امیہ ضمری سے روایت ہے۔ کہ میں اور عبید اللہ بن عدی بن خیار معاویہ کے زمانۂ حکومت میں شام کے شہر حمص میں گئے وحشی جبیر بن مطعم کا آزاد غلام بھی یہیں رہتا تھا۔ جب ہم اس شہر میں آئے تو عبید اللہ

---

[1] ایک طرح کا پھل دار آلہ جو خنجر کی طرح ہوتا ہے

بن عدی نے مجھ سے کہا کہ چلو وحشی سے حضرت حمزہ رضہ کے قتل کا واقعہ دریافت کریں۔
میں نے کہا اچھا چلو۔ ہم دونوں وحشی سے ملنے روانہ ہوئے۔ اور لوگوں سے اس کا پتہ
پوچھنا شروع کیا۔ ایک شخص نے کہا وہ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا ہوگا۔ یہ دونوں شخص
کہتے ہیں۔ ہم وحشی کے مکان پر پہنچے۔ اور ہم نے دیکھا کہ ایک بڈھا غالیچہ پر بیٹھا ہے
ہم نے جا کر سلام کیا۔ اس نے جواب دیا اور عبید اللہ بن عدی سے کہا کہ تو عدی بن
خیار کا بیٹا ہے۔ عبید اللہ نے کہا ہاں۔ وحشی نے کہا ایک دفعہ جب تو اپنی ماں کا
دودھ پیتا تھا۔ تب میں نے تجھ کو تیری ماں سعدیہ کے ساتھ اونٹ پر سوار کیا تھا۔ اور
تیرے پیر میں نے اس وقت غور سے دیکھے تھے۔ پس انہی کو دیکھ کر اب میں نے تجھ
کو پہچان لیا۔ عبید اللہ کہتے ہیں۔ ہم وحشی کے پاس بیٹھے تھے۔ اور ہم نے کہا ہم
تمہارے پاس اس واسطے آئے ہیں کہ حضرت حمزہ رضہ کے قتل کا واقعہ سنیں۔ کہ تم نے
ان کو کیوں کر شہید کیا۔ وحشی نے کہا۔ ہاں یہ واقعہ میں تم سے اس طرح بیان کروں گا۔ کہ
جس طرح میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا۔ اور پھر وحشی نے وہی
واقعہ جو اوپر مذکور ہوا۔ ان دونوں کے سامنے بیان کیا۔ پھر کہنے لگا۔ حضرت حمزہ رضہ کو
شہید کر کے میں مکہ میں آیا۔ اور میرے آقا جبیر بن مطعم نے موافق شرط کے مجھ کو آزاد
کیا۔ میں مکہ میں رہتا تھا۔ یہاں تک کہ جب حضور نے مکہ بھی فتح کر لیا۔ میں طائف میں
بھاگ گیا۔ پھر جب حضور رم نے طائف فتح کیا۔ اور وہاں کے سب لوگ مسلمان ہو گئے۔
میں پریشان ہوا کہ اب میں کیا کروں۔ کبھی خیال کرتا تھا۔ کہ ملک شام کی طرف
بھاگ جاؤں کبھی یمن کی طرف جانے کا خیال کرتا تھا۔ آخر اس فکر میں تھا۔ کہ مجھ سے
ایک شخص نے کہا۔ تجھ کو خرابی ہو۔ حضور رم کی خدمت میں جا کر مسلمان کیوں نہیں ہوتا۔
قسم ہے خدا کی جو شخص مسلمان ہو جاتا ہے۔ حضور رم اس سے کچھ نہیں فرماتے۔ میں یہ
سن کر حضور رم کی خدمت میں مدینہ میں حاضر ہوا۔ اور حضور رم کے پس پشت کھڑے ہو کر

کلمۂ شہادت پڑھنے لگا جب حضورؐ نے مجھ کو دیکھا فرمایا کیا وحشی ہے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں کہا بیٹھ جاؤ۔ اور بیان کر کہ تو نے حمزہ رضؓ کو کیوں کر شہید کیا تھا۔ میں نے اسی طرح حضورؐ کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا۔ جیسا کہ تم دونوں کے سامنے بیان کیا۔ جب میں بیان کر چکا حضورؐ نے فرمایا۔ تجھ کو خرابی ہو۔ اب مجھ کو اپنا منہ نہ دکھانا۔ پس میں جب حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ تو حضورؐ کی پشت کی طرف بیٹھ جاتا تھا تاکہ مجھ کو نہ دیکھیں۔ یہاں تک کہ آپؐ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے مسیلمہ کذاب پر فوج کشی کی میں بھی اس فوج کے ساتھ ہوا۔ یہاں تک کہ جب دونوں لشکروں میں جنگ مغلوبہ ہوئی۔ تو میں نے دیکھا کہ مسیلمہ کذاب تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے کھڑا ہے میں نے اپنا وہی حربہ جس سے حضرت حمزہ رضؓ کو شہید کیا تھا مسیلمہ کذاب کے سامنے گردش دینا شروع کیا۔ اور جب وہ پوری گردش کھا چکا۔ اس وقت اس کو میں نے مسیلمہ کی طرف رہا کیا۔ ادھر سے میں نے یہ حربہ اس کی طرف چھوڑا۔ اور دوسری طرف سے ایک انصاری نے دوڑ کر مسیلمہ کے تلوار ماری۔ اب خدا کو علم ہے۔ کہ ہم دونوں کے حربوں میں سے کس کے حربہ نے انہیں قتل کیا۔ ابن اسحاق کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے اور آپ یمامہ کی جنگ میں شریک تھے فرماتے ہیں۔ میں نے سُنا کہ ایک شخص پکار کر کہہ رہا تھا مسیلمہ کو حبشی نے قتل کیا ہے [1]

متروکہ جائداد

مکّہ سے مسلمانوں نے جب ہجرت کی۔ تو ان کی تمام چیزوں پر حتّٰی کہ رہنے کے مکانات تک پر کفّار نے قبضہ کر لیا تھا۔

اب فتح مکہ کے بعد ہی مسلمان واپس آئے۔ تو قدرتاً اپنی چھنی ہوئی چیزوں کے

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ اول

واپس لینے کا جذبہ ان میں پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے سرورِ کائنات ؐ سے التجا کی۔ کہ سب چیزیں واپس دے دی جائیں۔

بات بالکل جائز تھی۔ عقلاً۔ اخلاقاً۔ قانوناً۔ اصولاً کسی طرح بھی یہ مطالبہ نادرست نہ تھا۔ لیکن رحمتِ عالم ؐ کی طبیعت نے اسے گوارا نہ کیا۔ کہ "طلقا" کو پچھلے تمام جرائم سے آزاد کر دینے کے بعد ان کے لئے ایک نیا اقتصادی اور معاشرتی مسئلہ پیدا کر دیا جائے لہٰذا آپ ؐ نے کفار کا قبضہ بحال رکھا۔ اور مسلمانوں کی یہ درخواست رد کر دی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ پھر جس قدر مہاجرین تھے مکہ سے مدینہ میں آ گئے۔ سوا ان لوگوں کے جو کفار کی قید میں تھے۔ کوئی باقی نہیں رہا۔ اور بنی مظعون، بنی جحج میں سے اور بنو جحش بن رباب جو بنی امیہ کے حلیف تھے۔ اور بنی بکیر جو بنی سعد میں سے تھے۔ اور بنی عدی کعب کے حلیف تھے۔ یہ لوگ تو مع اپنے اہل و عیال کے آ گئے۔ اور ان کے مکانات مکہ میں بالکل خالی سنسان پڑے تھے۔ اور بنی جحش نے جب ہجرت کی۔ تو ابو سفیان بن حرب نے ان کے مکان کو عمرو بن علقمہ کے ہاتھ جو بنی عامر بن لوی میں سے ایک شخص تھا۔ فروخت کر دیا۔ جب یہ خبر مدینہ میں عبداللہ بن جحش کو ہوئی۔ انہوں نے آپ ؐ سے عرض کیا۔ آپ ؐ نے فرمایا۔ اے عبداللہ۔ کیا تو اس بات سے راضی نہیں ہے کہ خدا تجھ کو اس کے بدلے جنت میں ایک محل عنایت کرے۔ عبداللہ نے عرض کیا ہاں میں راضی ہوں۔ فرمایا بس وہ محل تیرے واسطے ہے۔ راوی کہتا ہے۔ جب مکہ فتح ہوا۔ تو ابو احمد نے حضور ؐ سے اپنے مکان کی نسبت عرض کیا۔ جسے ابو سفیان نے فروخت کر دیا۔ آپ ؐ نے کچھ جواب نہ دیا۔ لوگوں نے کہا اے ابو احمد! آپ ؐ ان چیزوں کی نسبت جو کفار کے تصرف میں چلی گئی ہیں۔ کلام پسند نہیں فرماتے۔ پس ابو احمد بھی خاموش ہو رہے۔ [۱]

---

[۱] سیرت ابن ہشام حصہ اول

خالد کسی بات پر الجھ گئے۔ اور نوبت خون ریزی تک پہنچ گئی۔ اس حادثہ کی جب آپ ؐ کو اطلاع ہوئی تو نہایت مغموم ہوئے۔ آپ ؐ نے کعبہ کرمہ کی طرف منہ کر کے فرمایا

"بار الہا ——— خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں"!

ان الفاظ کی تین مرتبہ آپ ؐ نے تکرار فرمائی۔ پھر حضرت علی رضؓ کو روانہ کیا جنہوں نے آپ ؐ کی ہدایت کے مطابق نہ صرف مقتولین کا بلکہ ان کے کتوں تک کا خون بہا ادا کیا اور مزید رقم بھی تلافی کے طور پر دی[1] حالانکہ اہل جذیمہ مجبور محض تھے۔ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔

اس واقعہ کی مزید تفصیل:-

راوی کہتا ہے، پھر آپ ؐ نے حضرت علی رضؓ کو بلا کر فرمایا۔ کہ علی تم جا کر اس قوم کے مقدمہ میں نظر کرو۔ حضرت علی رضؓ بہت سا مال لے کر اس قوم کے پاس آئے۔ اور جس قدر لوگ اس قوم کے خالد نے قتل کئے تھے۔ ان سب کا خون بہا دیا۔ اور تمام مال جو خالد نے لوٹا تھا سب واپس کر دیا۔ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی باقی نہ رکھی۔ سب ادا کر چکنے کے باوجود حضرت علی کے پاس کچھ مال بچ گیا۔ حضرت علی رضؓ نے فرمایا۔ کہ اگر تمہارا کوئی مال اور خون بہا باقی ہو تو اس کے بدلے میں یہ مال لے لو۔ قوم نے کہا۔ ہمارا اب کچھ باقی نہیں ہے حضرت علی رضؓ نے فرمایا۔ مگر یہ مال میں تمہیں لوگوں کو دے دیتا ہوں۔ شاید تمہارا ایسا خون یا مال رہ گیا ہو جس کی نہ تم کو خبر ہو نہ ہم کو پس یہ اس کے معاوضہ میں سمجھو۔ اور پھر حضرت علی رضؓ نے آپ ؐ کی خدمت میں آ کر اپنی کارروائی عرض کی۔ آپ ؐ نے فرمایا تم نے بہت اچھا اور درست کیا۔ اور پھر قبلہ رو کھڑے ہوئے۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے دعا کی۔ کہ اے خدا میں خالد کی حرکت سے تیری بارگاہ میں اپنی بریت ظاہر کرتا ہوں تین بار یہی فرمایا[2]

---

[1] طبری [2] سیرت ابن ہشام حصہ دوم

حاتم طائی کا بیٹا اور بیٹی

یمن کے قبیلہ طے نے ۹ھ میں بغاوت کی۔ امیرالمومنین حضرت علی رض نے باغیوں کی سرکوبی کی۔ اور گرفتار شدگان کو مدینہ منورہ بھیج دیا۔ ان قیدیوں میں حاتم طائی کی بیٹی بھی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی سخاوت اور بذل و عطا کی داستان سرائی کرنے کے بعد اپنے لئے رعایت چاہی۔

آپ ص نے حاتم کے بارے میں فرمایا

"ہاں اس میں مومنوں کے سے صفات تھے"

پھر حاتم کی لڑکی کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ مع متعلقین کے اسے رہا کر دیا۔ نیز زاد راہ اور لباس بھی مرحمت فرمایا

قبیلہ طے کی بغاوت اور اس سارے شور و شر کا بانی مبانی حاتم کا بیٹا عدی تھا۔ وہ بھاگ کر شام چلا گیا تھا۔ بہن اس کے پاس شام پہنچی۔ اور آنحضرت ص کے صفات رحم و کرم بیان کئے۔ وہ اتنا متاثر ہوا کہ مدینہ آیا اور مسلمان ہو گیا۔

بابرکت جویریہ

حضرت جویریہ غزوہ بنی مصطلق میں کس طرح گرفتار ہوئیں؟ بنی مصطلق کے بہت سے آدمی کیوں کر اسیر جنگ ہوئے؟ اور پھر ان سب کی رہائی یک بیک بغیر کسی تحریک کے بغیر کسی فدیہ کے بغیر کسی رقم کے کیوں کر عمل میں آ گئی۔ یہ ایک اہم واقعہ ہے۔ اور اسے ہم تاریخ کی زبان سے سنیں گے۔

حضرت عائشہ رض سے روایت ہے کہ جب حضور ص نے قیدیوں کو تقسیم فرمایا۔ تو جویریہ بنت حارث ثابت بن قیس بن شماس کے حصہ میں آئیں۔ اور انہوں نے کتابت[1]

---

[1] مکاتبت کر لیا۔ کہ اتنی رقم دے دوں تو میں آزاد ہوں۔

کرلی۔ جویریہ آپ ص کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ص میں جویریہ حرث کی بیٹی ہوں۔ جو اپنی قوم کا سردار تھا۔ اور جو مصیبت مجھ کو پہنچی ہے۔ وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے میں ثابت بن قیس کے حصہ میں آئی تھی میں نے اس سے کتابت کرلی ہے اور اب میں آپؐ کی خدمت میں اس لئے آئی ہوں۔ کہ آپ میری مال کتابت ادا کرنے میں امداد فرمائیں۔ آپ ص نے فرمایا۔ اس سے بہتر بات کی بھی تمہیں ضرورت ہے؟ جویریہ نے عرض کیا وہ کیا بات ہے؟ فرمایا وہ بات یہ ہے میں تمہارا مال کتابت ادا کر دیتا ہوں، تم مجھ سے شادی کرو۔ جویریہ نے کہا یا رسول اللہ ص مجھے منظور ہے۔ جب یہ خبر لوگوں میں شائع ہوئی۔ کہ آپ ص نے جویریہ بنت حرث سے شادی فرمائی ہے۔ لوگوں نے اس رشتہ کے سبب بنی مصطلق کے قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ اور آپ ص کے شادی کرنے سے اسی روز ایک سو آدمی قید سے آزاد ہو گئے۔ راوی کہتا ہے۔ میرے نزدیک جویریہ سے بڑھ کر کوئی عورت اپنی قوم کے واسطے بابرکت نہیں تھی [1]

ابو سفیان کی عزت افزائی

حضرت عباس رض کہتے ہیں۔ میں نے فتح مکہ کے وقت عرض کیا یا رسول اللہ ص ابو سفیان فخر پسند ہے۔ اس کے لئے کچھ ایسا کر دیں کہ اس کا فخر قائم رہے۔ آپ ص نے فرمایا

جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہوگا۔ اسے امن ہے۔
جو اپنا دروازہ بند کرلے گا اسے امن ہے
جو مسجد حرام میں داخل ہوگا اسے امن ہے [2]

مشرک کا خون بہا

فتح مکہ کے دوسرے روز ابن اثوغ مکہ میں لوگوں کا حال دریافت کرنے آیا

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ دوم [2] سیرت ابن ہشام حصہ دوم

اور اس وقت تک یہ مشرک ہی تھا۔ بنی خزاعہ نے اس کو پہچان کر چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور کہا احمد کا قاتل تو ہی ہے۔ اس نے کہا ہاں میں ہی ہوں۔ پھر اتنے میں خراش بن امیہ تلوار لئے ہوئے آئے اور اس کو قتل کر دیا۔ جب حضور کو یہ خبر پہنچی فرمایا اے خزاعہ اب تم قتل سے اپنے ہاتھ روک لو کیونکہ بہت لوگ قتل ہو چکے ہیں۔ اور اب تم نے ایسے شخص کو قتل کیا ہے جس کا مجھ کو خون بہا دینا پڑے گا۔[۱]

امن دے چکنے کے بعد مشرک کے قتل کا خون بہا بھی رحمۃ للعالمین نے دیا۔ یہ رواداری کی پہلی اور آخری مثال ہے۔

مفرور مجرم کی جان بخشی

سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ یوم الفتح میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی سرح، فرتنا، ابن الزبعری اور ابن خطل کے قتل کا حکم دیا۔

انصار میں سے ایک شخص تھے۔ جنہوں نے یہ نذر مانی۔ کہ اگر ابن ابی سرح کو دیکھیں گے۔ تو اسے قتل کر دیں گے۔ عثمان آئے۔ ابن ابی سرح ان کا رضاعی بھائی تھا۔ انہوں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کی۔ حالانکہ وہ انصاری تلوار کا قبضہ پکڑے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے منتظر تھے۔ کہ جب آپ اشارہ کریں تو وہ اسے قتل کر دیں۔

عثمان رض نے اس کی سفارش کی۔ آپ ص نے اسے چھوڑ دیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انصاری سے کہا۔ کہ تم نے اپنی نذر کیوں نہ پوری کی۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم میں اپنا ہاتھ تلوار پر رکھ کر منتظر تھا۔ کہ جب آپ اشارہ فرمائیں گے۔ تو میں اسے قتل کر دوں گا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اشارہ کرنا خیانت ہے۔ نبی کو یہ مناسب نہیں کہ وہ اشارہ کرے۔[۲]

---

[۱] سیرت ابن ہشام حصہ دوم [۲] طبقات ابن سعد جزو ثانی

مزید تصریح:

انہی لوگوں میں سے ایک شخص عبداللہ بن سعد عامری تھا۔ اس کے قتل کرنے کا حکم آپ صلعم نے اس سبب سے دیا تھا۔ کہ یہ پہلے مسلمان ہوا تھا اور وحی لکھا کرتا تھا پھر مرتد ہو کر قریش سے آ ملا۔ اور اب فتح مکہ کے بعد حضرت عثمان رضہ کے پاس جا چھپا کیونکہ ان کا رضاعی بھائی تھا۔ یہاں تک کہ جب مکہ میں اطمینان ہو گیا۔ تو حضرت عثمان رضہ اس کو لے کر خدمت نبوی میں آئے۔ آپ بہت دیر تک خاموش رہے۔ اور جب عثمان رضہ نے اصرار کیا تو فرمایا! ہاں لہ

یعنی اسے بھی پروانۂ امن عطا فرما دیا۔

فتح مکہ کا اصل محرک، مشرک حلیف کی مدد!

اس حقیقت پر شاید بہت کم لوگوں کی نظر ہو گی۔ کہ فتح مکہ کا اصل محرک آنحضرت صلعم کا وہ پاس عہد تھا۔ جو آپ صلعم نے مشرک قبیلہ خزاعہ سے کیا تھا۔ اگر بنو بکر، خزاعہ پر یورش نہ کرتے۔ اور قریش مکہ خلاف عہد بنو بکر کی مدد نہ کرتے۔ تو شاید فتح مکہ اس قدر جلد عمل میں نہ آتی۔ قریش کا خیال تھا۔ کہ آنحضرت صلعم مشرک حلیف کے لئے مسلمانوں کی جان قربان نہیں کریں گے۔ لیکن جب معلوم ہوا۔ آنحضرت صلعم خزاعہ کی حمایت میں جہاد کرنے کو تیار ہیں۔ تو وہ گھبرائے اور ابوسفیان کو بھیجا۔ کہ تجدید صلح ہو جائے مگر وہ نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ پیمان شکنوں پر بار بار اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس تاریخی واقعہ کی دلچسپ تاریخی تفصیل یہ ہے:۔

راوی کہتا ہے بنی خزاعہ اور بنی بکر آپس کے جھگڑوں میں گرفتار تھے۔ کہ اسلام نے شائع ہو کر سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور قبائل کے باہمی فساد کم ہو گئے۔ حدیبیہ

لہ سیرت ابن ہشام حصہ دوم

کی صلح ہوئی۔ اور اس میں یہ بھی ایک شرط لکھی گئی۔ کہ جس کا جی چاہے۔ وہ آپ ص کے عہد میں داخل ہو۔ اور جس کا جی چاہے وہ قریش کے عہد میں داخل ہو پس بنی خزاعہ آپ ص کے عہد میں داخل ہوئے اور بنی بکر قریش کے عہد میں داخل ہوئے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ بنی دیل نے اس صلح کو غنیمت سمجھ کر چاہا۔ کہ بنی اسود کے ان لوگوں کا جو بکر نے قتل کئے تھے۔ قصاص لیں پس نوفل بن معاویہ دیلی جو بنی دیل کا سردار تھا۔ اپنی قوم کو ساتھ لے کر بنی خزاعہ کے ایک چشمہ پر جس کو وتیر کہتے ہیں پہنچا اور خزاعہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ بنی خزاعہ بھی ان سے لڑنے کو تیار ہوئے۔ اور دونوں قبیلوں میں خوب جنگ ہوئی۔ قریش نے ہتھیار وغیرہ سامان سے بنی بکر کو مدد پہنچائی۔ اور رات کے وقت پوشیدہ ان کی طرف سے جنگ بھی کی یہاں تک کہ خزاعہ پیچھے ہٹتے ہٹتے حرم کے پاس آگئے۔ اس وقت بنی بکر نے اپنے سردار نوفل سے کہا اے نوفل اب تو ہم حرم میں آگئے جنگ موقوف کرنی چاہیئے۔ خدا سے ڈر خدا سے ڈر نوفل نے اس وقت ایک سخت کلمہ کہا۔ یعنی کہا اے بنی بکر اس وقت خدا نہیں ہے تم اپنا بدلہ لے لو۔

راوی کہتا ہے جس شخص کو انہوں نے چشمہ پر قتل کیا تھا۔ اس کا نام منبہ تھا۔ اس نے اپنے ساتھی تمیم بن اسعد سے کہا۔ کہ اے تمیم تو بھاگ جا میں ان کے مقابل ہو کر مر جاؤں گا یا یہ مجھ کو چھوڑ دیں گے۔ اور یہ شخص بڑا کمزور تھا۔ چنانچہ یہ تو مقابل ہوا اور مارا گیا۔ اور تمیم وہاں سے بھاگ آیا۔ پھر جب خزاعہ مکہ میں داخل ہوئے۔ تو بدیل بن ورقہ اور ایک اور شخص کے مکان میں جو اس کا حلیف تھا۔ انہوں نے پناہ لی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ جب بنی بکر اور قریش نے بنی خزاعہ پر اس قدر زیادتی کی اور ان کا قتل و غارت کیا۔ اور آپ ص کے عہد و پیمان کو توڑ دیا۔ کیونکہ بنی خزاعہ آپ ص کے عہد میں داخل تھے۔ تو عمرو بن سالم خزاعی مکہ سے روانہ ہو کر آپ ص کی خدمت میں آیا

آپ ﷺ اس وقت مسجد میں صحابہ کے درمیان تشریف رکھتے تھے۔ اس نے حاضر ہوکر تمام واقعہ عرض کیا۔ اور مدد کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے عمرو بن سالم تیری مدد کی گئی۔ پھر ایک بادل حضور ﷺ کو آسمان پر دکھائی دیا۔ فرمایا یہ بادل بنی کعب یعنی خزاعہ کی مدد کے واسطے آیا ہے۔ پھر اس کے بعد خزاعہ کے اور چند لوگ جن میں بدیل بن ورقہ بھی تھا، حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور قریش کے بنی بکر کی مدد کرنے اور خزاعہ پر ظلم و زیادتی کرنے کا سارا حال سنایا۔

ابو سفیان مدینہ آیا۔ اور پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ کے پاس گیا۔ جو ام المومنین تھیں۔ اور حضور ﷺ کے خاص بستر پر اس نے بیٹھنا چاہا۔ ام المومنین نے بستر کو لپیٹ دیا۔ تو ابو سفیان نے کہا۔ بیٹی تم اس بستر کو بھی مجھ سے بہتر سمجھتی ہو۔ ام حبیبہ نے فرمایا۔ یہ بستر خاص حضور ﷺ کا ہے۔ اور میں مناسب نہیں سمجھتی۔ کہ تم ایک مشرک اور ناپاک شخص ہوکر اس پر بیٹھو۔ ابو سفیان نے کہا اے بیٹی تو شر میں مبتلا ہو گئی۔ پھر ابو سفیان حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ سے گفتگو کی۔ آپ ﷺ نے کچھ جواب نہ دیا۔ تب یہ حضرت ابو بکر رض کے پاس آیا۔ اور ان سے کہا۔ کہ تم چل کر میرے واسطے سفارش کرو۔ حضرت ابو بکر رض نے کہا۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ پھر ابو سفیان حضرت عمر رض کے پاس آیا۔ اور ان سے کہا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تیری سفارش کروں۔ قسم ہے خدا کی اگر میرے پاس ایک تنکا بھی ہوگا۔ تب بھی اس کے ساتھ تم لوگوں سے جنگ کروں گا۔

تب ابو سفیان حضرت علی رض کے پاس آیا۔ حضرت فاطمہ رض بھی وہیں تھیں۔ اور حضرت امام حسن علیہ السلام ان کی گود میں بیٹھے تھے۔ ابو سفیان نے کہا۔ اے علی رض تم سب سے زیادہ رشتہ میں میرے قریبی ہو۔ اور میں ایک حاجت مند ہوکر تمہارے پاس آیا ہوں۔ اگر میں جیسا آیا ہوں ویسا ہی ناکام چلا گیا۔ تو بہت ذلیل ہوں گا۔ حضرت علی رض نے فرمایا اے ابو سفیان! ہم ہرگز حضور ﷺ سے اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتے

پھر وہ حضرت فاطمہ رضؓ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور کہنے لگا اے محمدؐ کی صاحبزادی تم ایسا کر سکتی ہو۔ کہ اپنے صاحبزادوں کو حکم دو۔ کہ یہ لوگوں میں پناہ پکار دیں حضرت فاطمہ رضؓ نے فرمایا میرے بچوں کو کب سزاوار ہے کہ وہ پناہ پکار دیں۔ اور بھلا حضورؐ پر کون پناہ پکار سکتا ہے [1]

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ دوم

داستان کا خاتمہ

اسی طرح نہ جانے کتنے کتنے اور کیسے کیسے باغی، سرکش، فتنہ جو، جنگ آزما، منافق، دشمن اور بدخواہ اپنی سی حرکتیں کرنے کے بعد جب کہیں پناہ نہ پا سکے تو بے خوف و خطر اسی کے پاس پہنچ گئے جس کی خطائیں کی تھیں جسے ایذائیں پہنچائی تھیں۔ جس کا دل دکھایا تھا۔ جس کا تن زخمی کیا تھا —————— اور اس نے بغیر ملامت کیے، بغیر سرزنش کیے، بغیر کسی شرط کے معاف کر دیا۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

یہ داستان بڑی طولانی ہے۔ لیکن اس کی دل کشی کا یہ عالم ہے۔ کہ جی چاہتا ہے۔ کہتے ہی رہیے۔ قلم کی سیاہی خشک ہو جائے۔ اوراق کی وسعت جواب دے دے۔ ہاتھ کی طاقت مضمحل ہو جائے۔ دماغ کی قوت کام نہ دے۔ لیکن یہ داستان جو شروع ہوتی ہے کبھی اور کسی طرح ختم ہونے میں نہ آئے!

انیسؔ نے ایک موقعہ پر کہا تھا ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

میں اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں۔ تو محسوس کرتا ہوں سفینہ بھی ہار جائے گا۔ تھک جائے گا۔ ٹوٹ جائے گا لیکن رحمۃ للعالمین کی رحمت عام اور رحمت تمام کی داستان ختم ہونے میں نہ آئے گی یہ وہ داستان ہے جس کی کوئی انتہا نہیں یہ وہ کہانی ہے جو ختم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ وہ قصہ ہے جیسے جتنا جتنا سنئے گا اتنا ہی اس کا پھیلاؤ بڑھے گا۔ لہذا بادل ناخواستہ اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔

انشاء اللہ اس کتاب کے بقیہ حصص میں اسی داستان کے دوسرے ٹکڑے پیش خدمت کئے جائیں گے ؞

رئیس احمد جعفری

ایڈیٹر ماہنامہ ریاض
آرام باغ روڈ
کراچی
۵ راکتوبر ۱۹۵۴ء

SULTAN HUSAIN & SONS, BOOKSELLERS

والنساء والولدان الذين يقولون ربنا اخرجنا من
هذه القرية الظالم اهلها واجعل لنا من لدنك
ولیا واجعل لنا من لدنک نصیرا۔ اور اللہ کے راستہ میں (جنگ
کرتے ہوئے) تم ناتواں مردوں سے اور عورتوں سے اور لڑکوں سے نہ لڑو،
وہ جو کہتے ہیں اے پروردگار ہمارے ہم کو اس شہر سے کہ یہاں کے رہنے
والے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمیں دوست دے اور اپنی طرف سے
ہمیں مددگار دے ۔۔۔"

اسی طرح سے خدائے تعالیٰ نے سورۂ انفال میں، جو مدنی سورت
ہے ارشاد فرمایا ہے۔

وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين كله
لله فان انتهوا فان الله بما يعملون بصير ۔۔۔۔" اور
ان سے مقاتلہ کرو، یہاں تک کہ کفر باقی نہ رہ جائے، اور دین صرف خدا
کا رہ جائے۔ اور اگر وہ باز آجائیں، تو جو کچھ وہ کرتے ہیں، خدا اسے
دیکھتا ہے۔۔۔"

اسی طرح سورۂ حج میں ارشاد فرمایا گیا ہے، جو مکی سورت ہے:۔
اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا وان الله على نصرهم
لقدير الذين اخرجوا من ديارهم بغير حق الا ان يقولوا ربنا الله
۔۔ یعنی جن پر ظلم کیا گیا، انہیں مقاتلہ کی اجازت دی گئی، اور بلاشبہ
اللہ ان کی مدد پر قادر ہے، وہ لوگ کہ نکالے گئے اپنے گھروں سے ناحق
(اس جرم میں) کہ انہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے ۔۔"